Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

حسرتِ تعمیر

میرزا ادیب

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

حسرتِ تعمیر

میرزا ادیب

التحریر ۰ اردو بازار، کبیر سٹریٹ ۰ لاہور

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

کتابوں میں
جدید اور
بلند معیار
پیش کرنیوالے

جملہ حقوق محفوظ

بار اوّل: دسمبر ۱۹۷۹ء

ناشر: خالد سیف اللہ، التحریر، لاہور
مطبع: نامی پریس، پیسہ اخبار، لاہور
سرورق: خالد سیف اللہ
قیمت: ۲۵ روپے

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

وقار ادیب اور تحسین میرزا

کے نام

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

دل میں کیا تھا کہ اسے غم تیرا غارت کرتا
وہ جو ہم رکھتے تھے اک حسرت تعمیر سو ہی

(غالب)

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ترتیب

○

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

حرفِ اوّل

میرزا ادیب کا ذکر چھڑے تو ذہن خود بخود اُس قدر آور کردار کی طرف جاتا ہے جو "صحرا نورد" کے خطوط کے طور پر اُردو ادب میں کلاسیک بن چکا ہے۔

وہ میرزا ادیب کی ابتدا تھی۔

اس ابتدا کا خاص پہلو یہ تھا کہ میرزا ادیب کی سوچ بڑے وسیع پیمانے پر تھی۔ ان کا کینوس وسیع و عریض صحرا تھا۔ جس کی حدود کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ اس پر بکھری ہوئی کہانیاں افسانے نہیں بلکہ ایسی داستانیں تھیں۔ جن کے تار و پود صدیوں پار پھیلے تھے۔ ان میں سلطنتوں کے خلاف بغاوتیں تھیں۔ ہمہ گیر مذہبی رسوم کی جبریت میں شگاف ڈالے جاتے تھے۔ بڑے بڑے خانہ بدوش قبیلوں کی نقل و حرکت ہوتی تھی۔ اور ظلم و ستم کے ماحول میں اجتماعی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا تذکرہ تھا۔ فرد کا ذکر وہاں بھی ہوتا تھا۔ مگر اس انداز میں کہ وہ یا تو کسی نظام کا کشتہ تھا یا کسی نظام سے متصادم تھا۔ اس کی چیخیں دراصل نظام کی گرفت کی گونج ہوتی تھیں۔ اور اس کے جذبات کی شکست و ریخت ان عظیم قوتوں کے حوالے سے تھی جو ایک فرد کی ذات کے اوپر کالے بادلوں، صحرائی آندھیوں اور آفاقی طوفانوں کی طرح چھائی رہتی ہیں۔

اس وقت میرزا ادیب کی آنکھ اس عظیم الجثہ دوربین کی طرح تھی جو آسمانوں اور فضاؤں میں کائنات کی ہیئت کا مطالعہ کرتی ہے۔ اسی وجہ سے ان داستانوں میں ایک خاص قسم کی رومانویت اور پُراسرار ماحول ہے۔

زیرِ نظر افسانوی مجموعہ میرزا ادیب کی تازہ ترین تحریروں پر مشتمل ہے۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

جو میرزا ادیب کی ابتدائی تحریروں سے اتنا مختلف رنگ پیش کرتی ہیں کہ قاری چونک پڑتا ہے۔ پہلے میرزا ادیب فرد کو نظامِ کائنات اور مذہب کے پس منظر میں دیکھتے تھے۔ مگر اب وہ فرد کو خالص انسان کے طور پر دیکھ رہے ہیں اور اس کے دل و دماغ میں جھانک کر خالص انسانی جذبات کا جائزہ لے رہے ہیں۔ اگر پہلے وہ فرد کو صحراؤں کی وسعتوں کے پس منظر میں دیکھتے تھے۔ تو اب وہ محسوس کر رہے ہیں کہ فرد کے دل کی تہ دریاؤں اور سمندروں سے بھی گہری ہے۔ اور اس دل کو توڑنے کے لیے کسی عفریت پیکر جابر نظام کی ضرورت نہیں۔ بلکہ یہ آنسو کی لرزش، آہ کی حدت اور اپنوں کی بے رُخی سے بھی ٹوٹ جاتا ہے۔

اب میرزا ادیب کی آنکھ اس خوردبین کی طرح ہے۔ جو بہت ہی لطیف اور نازک چیزوں کے اندر گھُس کر ان کی ماہیت سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔

اس طرح میرزا ادیب نے اس نصف صدی میں بہت طویل سفر طے کیا ہے اور قابلِ ستائش ہے وہ فن کار جس کا فن سفر کرنے کی قوت رکھتا ہے اور دل و دماغ کی ارتقائی منزلیں طے کر سکتا ہے۔

رومانویت سے حقیقت نگاری کی طرف سفر کرنا ہمارے ادب میں کوئی نئی چیز نہیں۔ مگر حقیقت نگار ہونے کے بعد بے رحم ہو کر سفاکانہ حقیقتوں کو فن کے نشتر سے چیر پھاڑ دینے کے لیے بہت زیادہ ذہنی توانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو مجھے اس مجموعے میں جا بجا بکھری ہوئی ملی ہے۔ یہ فن پارے پلاٹ کے نہیں بلکہ کردار کے افسانے ہیں۔ ایسے کردار جن کو چھوٹی موٹی کوتاہیوں پر زندگی اتنی بڑی سزائیں دیتی ہے کہ کہانی والے کردار کے ساتھ ساتھ قاری بھی ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ ــ "شیشے کی کرچیاں" مختلف کرداروں کی شکل میں ذہنی جھٹکوں کا اتنا طویل تسلسل پیدا کرتی ہیں کہ اختتام تک پہنچتے پہنچتے قاری تاثر سے نڈھال ہو جاتا ہے۔" کا کا چڑیلز" اور "گوٹے کناری والی چنزی" بھی اسی انداز میں بھرپور تاثر پیدا کرتی ہیں۔ اور

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

قمرالدین عرف صدرا" کی کہانی پڑھنے والے کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ جس فردِ واحد کی زندگی میں قدرت نے ناکردہ گناہ اتنے حادثے بھر دیئے ہیں۔ اس فرد کی زندگی بنانے میں قدرت کے لیے کون سے فخر کا پہلو رہ جاتا ہے۔ "یوسف زلیخا" بھی اسی مجموعے کی ایک خوبصورت اور گہری کہانی ہے۔

"ماسی" میں میرزا ادیب نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جن کو انہوں نے بعد ازاں اپنی کہانیوں میں کرداروں کے روپ میں ڈھالا۔ "میاں دین محمد" کے بارے میں انہوں نے برملا ظاہر کر دیا ہے یہ کردار ابھی زندہ ہے اور کہانی بھی سچی ہے۔ مگر باقی افسانے پڑھتے ہوئے بھی قاری کو یہ احساس ہوتا رہتا ہے کہ یہ کردار حقیقی دنیا سے لیے گئے ہیں۔ اور ان سے منسوب کردہ واقعات بھی بیشتر سچے ہوں گے۔ اس احساس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ قریباً سبھی افسانے واحد متکلم میں لکھے گئے ہیں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ مصنف نے اپنے تمام کرداروں کو اندرون بھاٹی گیٹ کے ایک چھوٹے سے علاقے سے چُنا ہے۔ اور ان کی ساری زندگی چند مخصوص گلیوں میں گزرتی ہے۔ جیسے چوک دیوی دتا۔ بیری مائی مراد و۔ گلی مغلاں۔ محلہ ستھاں اور مایا رام کی کشٹری۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ مختلف کردار اپنی کہانی پیش کرنے کے بعد بعض اوقات دوسری کہانیوں میں بھی اپنے سابقہ روپ میں لمحہ بھر کو جھانکتے ہیں۔ اور اس چھوٹی سی دنیا کی موجودگی کا ثبوت مہیا کر جاتے ہیں۔ ان تمام وجوہات نے مل کر سارے افسانوں کو ایک مخصوص فضا دی ہے۔ جس میں مصنف مرکزی گواہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور ایک خاموش تماشائی کی بصیرت سے پرانے زمانے کی زندگی کا تجزیہ کر کے قاری کے سامنے رکھتا ہے۔ زمان و مکان کی اس شناخت نے میرزا ادیب کی حقیقت نگاری کو اتنا معتبر بنا دیا ہے۔ کہ قریباً قریباً حقیقت بن گئی ہے۔

میرزا ادیب کا یہ مجموعہ اس فاصلے کو ظاہر کرتا ہے۔ جو میرزا ادیب نے تخیلاتی رومانویت سے حقیقت نگاری تک سفر کرنے میں طے کیا ہے۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

نشّہ

اشرف چائے فروش کی بیوی "زینب" عام طور پر چُپ چُپ رہتی تھی۔ جو شخص بھی اُسے ایک نظر دیکھ لیتا تھا کہتا تھا کہ یہ عورت یا تو کسی روگ میں مبتلا ہے یا اپنی ذات میں گُم ہو کر رہ گئی ہے۔ مگر یہ دونوں باتیں صحیح نہیں تھیں۔ وہ اچھی خاصی صحت مند عورت تھی۔ اور اپنی ذات میں گُم رہنے کی بھی اُسے عادت نہیں تھی۔ کیونکہ ایک بہو، بیوی اور ماں ہونے کی حیثیت سے ایک پاکستانی عورت پر جتنی بھی ذمّے داریاں عائد ہو سکتی ہیں، وہ سب کی سب پوری کرتی تھی۔ اور کبھی اُس نے فرض ناشناسی کا ثبوت نہیں دیا تھا۔

اُس کے سسرال میں ایک تو اس کی ساس تھی، جو دمے کی مریضہ تھی اور اس نے اپنے ذمّے تین کام لے رکھے تھے۔ اپنی کوٹھڑی میں بلغم کے ڈھیر لگانا، حقّہ پینا اور کھانسی کے شدید دورے کے درمیان بڑی باقاعدگی کے ساتھ اپنی بہو کے لتّے لینا۔ زینب جب بھی ایک ہاتھ میں چولہے کی راکھ سے بھرا ہوا مٹی کا پیالہ اور دوسرے ہاتھ میں جھاڑو لے کر اس کی کوٹھڑی میں آتی تو ساس کو نہ جانے کیسے بہو کی پیشانی پر کچھ نمایاں شکنیں نظر آ جاتیں اور وہ ایک آدھ فقرہ ضرور کہہ دیتی۔ مثلاً "دو دن تو ملکہ بنے گی ــــ بڑا آیا جو ہماری جھونپڑی میں آگئی" ــــ زینب اس قسم کے فقرے سُننے کی عادی ہو چکی تھی۔ اور جس وقت بھی ساس کی کھانسی کے دھچکے کھاتی ہوئی آواز بلند ہوتی، وہ اپنی گردن اور جھکا لیتی۔ بلغم کے ڈھیروں پر راکھ ڈالنے اور جھاڑو سے انہیں سمیٹنے کا کام کچھ زیادہ تیزی سے کرنے لگتی جیسے ساس کے الفاظ نے اس پر کوئی بُرا اثر نہیں ڈالا۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

کام کرنے پر زیادہ مستعد کر دیا ہے۔

ساس کے علاوہ زینب کی ایک نند بھی تھی جس کا نام خدیجہ تھا۔ اور جو سسرال سے لڑ کر میکے میں آ بیٹھی تھی۔ وہ برداشت ہی نہیں کر سکتی تھی کہ اس کے سامنے اس کی بھابی اپنے شوہر سے بات چیت کرے۔ اپنی محرومیوں سے اس نے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا تھا چنانچہ موقع بہ موقع بھابی کی ذات میں کیڑے نکالنا وہ اپنا فرض گردانتی تھی۔ لیکن یہاں بھی زینب کا رویہ وہی رویہ ہوتا تھا جو ساس کے طعنے سن کر ہوتا تھا۔ بہت ہوتا تو اپنے روتے ہوئے سالہ پہلوٹی کے بچے شیرے کو پنگوڑی سے اٹھا کر اس طرح اپنے بازوؤں میں لپیٹتی اور اس انداز سے چھاتی اس کے منہ میں ڈالتی کہ سانس رکنے سے بچے کے چہرے کا رنگ نیلا ہو جاتا۔ اور وہ اسی لمحے جلدی سے چھاتی نکال کر اپنا منہ بچے کے منہ سے لگا کر سانس کی ہوا اس کے اندر پہنچانے لگتی۔ نہ جانے یہ طریقہ اسے کس نے بتایا تھا۔ لیکن اس کے معاملے میں مفید ہی نکلا تھا۔ ایک منٹ ہی میں بچے کا تنفس ٹھیک ہو جاتا اور وہ پھر چھاتی اس کے منہ میں ڈال دیتی۔

اُدھر ماں اور بہن کے مقابلے میں اس کے شوہر کا رویہ بہت حد تک مختلف تھا۔ وہ نہ طعنہ زنی کے سلسلے میں ان کا ساتھ دیتا تھا اور نہ بیوی کو خوش کرنے کی خاطر انھیں ڈانٹنے کی کوشش کرتا تھا۔ بس وہ نیوٹرل رہنا ہی پسند کرتا تھا۔ اور حالات نے ثابت کر دیا تھا کہ اس کا طریق کار اس کے حق میں برا نہیں ہے۔ اس کی ماں بہن کو وقتی طور پر تو اس سے شکایت پیدا ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد وہ اسے مجبور سمجھ کر معاف کر دیتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اشرف تو مخولیا ہے، ہر بات مخول میں اڑا دیتا ہے۔

محلے والے شروع شروع میں تو زینب کو ایک مثالی بہو سمجھتے تھے۔ لیکن پھر اشرف کی ماں اور بہن کی باتیں سن سن کر وہ بھی اسے گربہ مسکین سمجھنے لگے تھے۔ مگر رحمت سنار کی بیوی کا خیال زینب کے بارے میں بالکل نہیں بدلا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی کہ خدا بہو دے تو زینب جیسی دے ورنہ بیٹا بن بیاہا ہی اچھا۔ اصل میں اس کی اپنی بہو صفیہ بڑی لڑاکا تھی شاید یہ اسی کا ردعمل تھا کہ وہ بقول اپنے زینب جیسی اللہ میاں کی گائے کو بہت پسند کرتی

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ں۔ اور اپنے ملنے والوں سے کہا کرتی تھی کہ اشرف کی ماں تو اپنی یتیم بہو پر ظلم کرتی ہے۔
ری صفو جیسی بہو ملتی تو ہاتھ مل مل کر دیتی۔

اشرف ایک چھوٹی سی کنٹین کا مالک تھا، جو ایک چھوٹے سے سرکاری دفتر میں صبح سے
ہ کر اُس وقت تک کُھلی رہتی تھی جب تک دفتر میں کام ہوتا رہتا تھا۔ اس دفتر میں اٹھارہ کلرک
ر ایک ان کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔ اشرف یہاں چائے فروشی کا کاروبار کر کے کچھ خوش نہیں تھا۔ اس
وجہ یہ تھی کہ کلرک سارا مہینہ اُدھار چائے پیتے تھے اور مہمانوں کی آمد پر درجن آدھ درجن
ٹ بھی منگوا لیتے تھے۔ مہینہ گزرنے کے بعد نئے مہینے کی پہلی تاریخ کو انھیں تنخواہ ملتی تھی
ہ قرض ادا کرنے کی طرف نیم دلی سے توجہ کرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ایک آدھ کلرک چھٹی
ے پہلے ہی خزانچی کی منت سماجت کر کے یا اپنے حساب میں اسے چائے پلا کر تنخواہ وصول کر لیتا
اور چُپ چاپ دفتر کے دروازے سے نکل جاتا تھا۔ اس کلرک کا قرض کبھی ادا نہیں ہوتا
کیونکہ اس کی تنخواہ میں اتنی گنجائش ہی نہیں ہوتی تھی کہ نیا قرض بھی ادا کرے اور پچھلی رقم بھی
رف کے حوالے کرے۔

سپرنٹنڈنٹ نے تو کبھی چائے اور پیسٹری کے پیسے دیے ہی نہیں تھے۔ آخر یہ اس
حسان نہیں تھا کہ اس نے اپنے دفتر میں اشرف کو کنٹین چلانے کا کام دے رکھا تھا۔ یہ
م وہ کسی اور کو بھی تو دے سکتا تھا مگر اس نے مہربانی اشرف پر ہی کی تھی۔

مہینے کی پہلی تاریخ کو اور اگر پہلی کو اتوار ہو تو دوسری تاریخ کو اشرف کلرکوں سے وصول کی
ی رقم زینب کے ہاتھ میں رکھ دیتا تھا۔ اور پھر آنے والے تیس یا اکتیس دنوں میں کبھی اس
ے یہ نہیں پوچھتا تھا کہ خرچ کی تنگی تو نہیں ہے یا ضرورت کی سب چیزیں گھر میں موجود ہیں؟ وہ
ی کو رقم دیتے وقت اپنے پاس اتنے روپے محفوظ کر لیتا تھا جن سے اس کو سگریٹ پان خریدنے
ی کوئی دقت پیش نہ ہو۔ زینب نے ایک بار بھی اس سے نہیں پوچھا تھا کہ تم نے اپنی جیب
ں کتنے روپے ڈال رکھے ہیں۔ اور ان سے کیا کچھ خریدو گے۔ جب وہ شوہر سے دس دس یا
چ پانچ کے نوٹ وصول کرتی تھی تو جب تک اس کا ہاتھ شوہر کے سامنے پھیلا رہتا تھا۔ وہ
...تی۔ رہتی تھی۔ جیسے اس کا شوہر اسے بہت بڑی عزت دے رہا ہے اور اس عزت افزائی

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

پر اس کا دل بہت خوش ہے۔ رقم کے ساتھ اشرف بیوی کو مٹھائی کا ایک لفافہ اور طرح طرح کے مصالحوں سے بھرا ہوا، کاغذ میں لپٹا ہوا ایک پان بھی دے دیتا تھا۔ اور زینب کو آرڈر تھا کہ پان سنبھال کر رکھے اور رات کے دس گیارہ بجے کھائے۔ اس سے پہلے ہرگز نہیں پان لیتے وقت اس کی مسکراہٹ غائب ہو جاتی تھی اور اس کی بجائے چہرے پر کہیں کہیں پسینے کے دو چار قطرے سے تیرتے ہوتے نظر آنے لگتے تھے۔ اس کی آنکھیں جھک جاتی تھیں اور وہ نفی میں اپنا سر ہلانے لگتی تھی۔ مگر زینب تھی بڑی پگلی عورت۔ وہ مٹھائی والے لفافے کے ساتھ یہ لپٹا ہوا پان بھی ساس کے سامنے اس کی چارپائی پر رکھ دیتی تھی۔ ساس تو ایک آدھ برفی اٹھا کر لفافہ بند کر دیتی تھی اور پان کی طرف دیکھتی بھی نہیں تھی۔ لیکن اگر اس کی نند وہاں ہوتی تو وہ پان پر جھپٹ پڑتی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے کاغذ کھول کر پان منہ میں ڈال کر دیر تک جگالی کرتی رہتی   اور اس حالت میں زینب کے پاس ضرور جاتی اور اس وقت زور زور سے دانتوں کو حرکت دینے لگتی۔ زینب پر اُس کی حرکت کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ بظاہر وہ کسی قسم کے شدید یا غیر شدید ردِ عمل کا اظہار نہ کرتی۔

اکتوبر کے اوائل ہی میں یہ افواہ گشت لگانے لگی کہ حکومت کا وہ چھوٹا سا بجلی کا دفتر جس میں اشرف کنٹین کا انتظام کرتا تھا۔ جلد ہی ٹوٹنے والا ہے اور اس دفتر کے تمام کلرک کسی بڑے دفتر میں جانے والے ہیں۔ اشرف کو اس افواہ سے خاصی پریشانی ہوئی کیونکہ اُس کے ایسے گاہکوں کی تعداد پانچ تک پہنچ چکی تھی، جنھوں نے تین تین چار چار ماہ کے بل ادا نہیں کیے تھے۔ اور اب اگر دفتر ٹوٹ جاتا ہے، تو یہ کلرک بلوں کی رقم بھی اپنے ساتھ لے جائیں گے اور کبھی اشرف کو اپنی شکل نہیں دکھائیں گے۔

اگلے مہینے کی وسط میں دفتر خالی ہونے لگا اور اس کا سارا ساز و سامان واپڈا ہاؤس میں جانے لگا۔ اتفاق یہ ہوا کہ جن کلرکوں نے اشرف کے بل ادا نہیں کیے تھے۔ ان میں سے تین تو بیمار پڑ گئے اور انھوں نے تین تین روز کی چھٹیاں لے لیں۔ ایک صاحب کے ماموں کی شادی کا ہنگامہ شروع ہو گیا اور پانچویں کلرک کا نانا تیسری مرتبہ انتقال فرما گیا۔ اشرف کو بہت کم رقم وصول ہوئی اور اسے جتنی رقم ملی وہ اس نے بیوی کو ارادۃً آزمائش میں ڈالنے کے لیے اس

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ں ہتھیلی پر رکھ دی۔

"ساٹھ اُوپر دو روپے ہیں!" زینب نے رقم گن کر کہا۔

"ہاں۔"

اشرف کو غصہ آیا کیونکہ اسے توقع تھی کہ زینب یہ رقم واپس کر کے کہے گی "میں نہیں چلا
تی گھر کا خرچ"۔ مگر اس نے تو ذرا سا اعتراض بھی نہیں کیا تھا "کیسی ہے یہ عورت"۔ اشرف
نے دل میں کہا اور اس کے دائیں شانے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا؛ "کیا کرو گی۔"

"اچھا۔"

"میں پوچھتا ہوں اچھا کی بچی۔ کرو گی کیا؟"

"فکر اں نہ کر شیرے کے ابا۔"

اشرف کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ اس سے مزید گفتگو کرتا۔ اس نے تو اپنا سارا بوجھ
وی کے کندھوں پر رکھ دیا تھا اور بیوی نے کندھوں پر یہ بوجھ اُٹھاتے ہوئے کوئی اعتراض
ہیں کیا تھا۔ اس روز وہ مٹھائی کا لفافہ نہیں لایا تھا۔ پان ضرور لایا تھا اور وہ اس کے حوالے
ر کے باہر نکل گیا۔

نند تو شاید کہیں پاس ہی کھڑی یہ باتیں سُن رہی تھی۔ بھائی کے جاتے ہی اندر آ گئی
ر بولی:

"ہائے اللہ۔ پتا نہیں کیا کھا لیا ہے۔ منہ میں زہر بھر گیا ہے۔"

زینب ذرا مسکرائی اور پان اسی طرح کاغذ میں لپٹا ہُوا نند کے حوالے کر دیا۔ اور نند
اتے ہوئے کہتی گئی "شرم تو نہیں آتی پان کھاتے ہوئے۔ ایک بچے کی ماں بن گئی ہے اور
ر تُوت یہ ہیں!"

لفظ کر تُوت پر زینب کے سینے میں جیسے ایک چنگاری سی چمک اُٹھی۔ وہ نند کی طرف
ری اور نند بھی جاتے جاتے رُک گئی تاکہ بھابی کوئی لفظ کہے تو وہ اسے خوب سُنائے۔
ر زینب کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا۔ صرف ایک لمحے کے لیے مسکرائی اور شیرے کو گود میں
ٹھا لیا۔ بچہ زور زور سے رونے لگا "وے مر۔ پی نان"۔ لیکن بچہ کیا پیتا وہ تو اپنی چھاتی اُس

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

کے منہ میں ڈالنے کی بجائے اس کے ماتھے سے لگا رہی تھی۔

اشرف حیران تھا کہ گھر کا خرچ پورا کس طرح ہو رہا ہے۔ اتنے تھوڑے سے روپوں میں روزانہ ہانڈی بھی پک رہی تھی۔ ناشتے میں اسے چائے اور دو پراٹھے بھی مل رہے تھے۔ اور رات کو وہ پاؤ ڈیڑھ پاؤ دودھ بھی پی رہا تھا۔ وہ صبح سے لے کر شام تک دفتروں میں چکر لگاتا رہتا تھا کہ کہیں کنٹین کی گنجائش نکلے تو وہ کام کرنا شروع کر دے۔ آخر پہلے دفتر کے سپرنٹنڈنٹ نے اسے بلا بھیجا اور جب وہ اس کے کمرے میں گیا تو اسے یہ خوش خبری سنائی گئی کہ اس کے ایک دوست کے ایک بڑے دفتر میں کنٹین بننے والی ہے اور وہ اس کے لیے کوشش کر رہا ہے۔

اشرف بہت خوش ہوا مگر اب سوال یہ تھا کہ بڑے دفتر میں کنٹین قائم کرنے کے لیے نیا سامان کہاں سے آئے گا۔ وہ فکرمند تھا مگر شام ہی کو اس کی فکر دور ہو گئی ہوا یوں کہ اس نے زینب سے اپنی اس دقت کا ذکر کیا تو زینب نے کوئی لفظ نہ کہا۔ ٹرنکوں والے کمرے میں گئی اور چند منٹ بعد رومال میں بندھی ہوئی چیز اپنے شوہر کے سامنے رکھ دی۔ اشرف نے رومال کھولا تو اس کی آنکھوں کے سامنے زینب کے سونے کے کڑے چمک رہے تھے۔ یہی سارا زیور تھا جو اس کی بیوہ ماں نے اسے جہیز میں دیا تھا۔

اشرف نے ایک منٹ تک بیوی کی خالی باہوں کو دیکھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ زینب مسکرائی اور اشرف کڑے اٹھا کر باہر چلا گیا۔

سپرنٹنڈنٹ کی کوششوں سے اشرف کو کنٹین کھولنے کے لیے جو نیا دفتر ملا، وہ پرانے دفتر سے چار گنا بڑا تھا اور اسی نسبت سے اس میں کام کرنے والے لوگوں کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ اس دفتر کی ایک خاص خوبی یہ تھی جس سے اشرف کو بڑا فائدہ ہونے لگا تھا کہ بڑے بڑے ٹھیکیدار جو اپنے بلوں کی وصولی کے لیے دفتر میں آتے تھے، جب اپنی مطلوبہ رقم کے چیک حاصل کر لیتے تھے تو اپنے مہربان افسروں کی دعوت اشرف کی کنٹین ہی میں کرتے تھے۔ اور اس سے اشرف کے وارے نیارے ہو جاتے تھے۔

کہنے والے غلط نہیں کہتے کہ جب دینے والا دینے پر آتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ن کو ایک شاندار دفتر میں کنٹین کا ٹھیکہ مل گیا اور بقول اس کے اپنے اس کی ساری عمر
ھو نے ڈھل گئے اور اس کے ساتھ ہی اس کی بہن کی قسمت کا ڈوبتا ہوا ستارہ بھی دوبارہ
نگا۔ ہوا یوں کہ خدیجہ سے اس کے شوہر عزیز کی ایک تقریب میں ملاقات ہوگئی۔ دونوں
پھر ایک دوسرے کو کوسا، خوب شکوے شکایتیں کیں؛ اور آخر میں دونوں نے طے کر لیا
اپنی اُجڑی ہوئی دنیا پھر آباد کریں گے اور جب میاں بیوی راضی ہو جائیں تو کسی کو کیا
ض ہو سکتا ہے؟

خدیجہ کی ماں کہتی تھی کہ اس کی بیٹی اس وجہ سے سسرال میں واپس گئی کہ نحوست
ن ختم ہو گئے تھے۔ مگر رحمت مختار کی ماں اس کا کریڈٹ خود لینے پر مُصر تھی۔ وہ کہتی تھی
یز تو خدیجہ کی شکل بھی دیکھنے پر تیار نہیں تھا۔ پر مَیں نے جب اُسے سمجھایا کہ تیری بیوی
اں کی گائے زینب کو بہت تنگ کرتی رہتی ہے تو اس کا دل پسیج گیا اور وہ بیوی کو گھر میں
پہ مجبور ہو گیا۔

اشرف نے یہ بات سُنی تو اپنے دل میں کہا: "واہ واکیا نیک بخت بیوی ہے۔ اس
ے سے میری بہن کا اُجڑا گھر آباد ہو گیا۔"

خدیجہ شوہر کے ہمراہ سسرال میں چلی گئی تو اشرف کو اس بات سے بھی خوشی ہوئی
اس کی بیوی سے کوئی بھی بارہ مصالحوں والا پان نہیں چھینے گا۔ اور جب سے چلنے
ں رات کو اس نے رات کے وقت بیوی کے تکیے کی طرف ہاتھ بڑھا کر اس کے بال کھینچے
ں کے نتھنوں میں پان کے مصالحوں کی کوئی خوشبو نہ پہنچ سکی۔ صرف زینب نے اوئی کہہ کر
پیچھے کھسکانے کی کوشش کی۔

"پان تم کہاں ہے؟"

"اماں کھا گئی۔"

اشرف جانتا تھا کہ زینب جھوٹ بول رہی ہے۔ اسے غصہ آیا اور اس نے بالوں
وڑ دیا۔ یکایک خوشبو کا ایک بھرپور جھونکا اس کی ناک میں داخل ہو گیا۔ فی الفور اس کی
ں بالوں کے ڈھیر میں ڈوب گئیں۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"اب راضی ہونا"۔ زینب چہکی۔

"تُو بڑی مخولی ہے"۔ اشرف کے منہ سے نکلا۔

"مخولیا، تو تُو آپ ہے"۔ اور اشرف کے چہرے پر پان کے ذرّوں کی بارش ہو گئی۔

دوسرے روز زینب معمول کے خلاف صبح سے شام تک مسکراتی رہی۔ اشرف نے چار سو کی رقم اُس کے حوالے کر دی تھی۔ اس سے پہلے زینب نے اتنی بڑی رقم کبھی دیکھی ہی نہیں تھی۔ اب کے وہ گھر میں دو کی بجائے تین لفافے لایا تھا۔ ایک میں مٹھائی تھی دوسرے میں زینب کے سُوٹ کا کپڑا اور سب سے چھوٹے لفافے میں دو پان تھے۔

"دو کیوں"۔ زینب نے سوچا۔ مگر اسے زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ ماں کی کوٹھڑی سے باہر نکلتے ہی اشرف نے لفافہ کھول کر ایک پان اپنے منہ میں ڈال لیا تھا اور کہنی سے ہونٹ پونچھتے ہوئے دروازے کی طرف جانے لگا تھا۔

"آج یہ کہاں جا رہا ہے۔ پہلے تو یہ کبھی نہیں گیا تھا۔ زینب کے دل میں سوال پیدا ہوا اور اشرف نے دروازے کے پاس رُک کر کہا:

"بازار جا رہا ہوں۔ سو جانا"۔

زینب وہیں کھڑی رہی۔ بچّہ کمرے کے اندر رونے لگا تھا زینب وہیں کھڑی تھی۔ دروازے کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہی تھی جس کا ایک پٹ کھُلا تھا۔

ساس نے شیرے کے رونے کی آواز سُن لی۔

"نی زینبو۔ کانوں میں اُنگلیاں دے لی ہیں۔ تیرا کچھ لگتا رو رہا ہے"۔

"اچھا اماں! سُن لیا ہے"۔ زینب کمرے میں گئی اور بچّے کو گود میں اُٹھا لیا۔ پان ابھی تک اُس کے ہاتھ میں تھا اس نے اسے ایک نظر دیکھا اور اسے تکیے کے نیچے رکھنے کی بجائے چینی کے برتنوں والی الماری میں ایک پلیٹ کے اُوپر رکھ دیا۔

رات گزر رہی تھی اور اُس کے بال تکیے پر بکھرے ہوئے تھے۔ ابھی تک کوئی ہاتھ اُس کی طرف نہیں بڑھا تھا۔ بار بار اُس کے ذہن میں یہ سوال اُبھر رہا تھا کہ اشرف چلا کہاں گیا ہے۔ اس نے اس سوال سے اپنی توجہ ہٹانے کے لیے اپنے سُوٹ کے کپڑے کے

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ے میں سوچنا شروع کر دیا۔ "اسے سیئے گا کون! برکت درزی۔ نہیں نہیں، پرانا درزی ہے۔
تو اسے انار کلی کے کسی درزی سے سلواؤں گی۔ صفیہ سے کہوں گی آؤ صفیہ! میرے ساتھ۔
کلی میں کسی درزی کو دے آئیں"۔ اپنی خیالوں میں اُس کی آنکھ لگ گئی۔ صبح کے آٹھ بجے ہوں
ر اُس کی ساس کی کڑکتی ہوئی آواز اُس کے کان میں آئی۔

"نی زینبو"۔ ساس اپنی لاٹھی دروازے پر برسا رہی تھی۔

وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ اور پہلا فقرہ جو اس کے ہونٹوں سے نکلا وہ تھا "ہائے اللہ۔
"۔ اُسی لمحے اُس نے دیکھا کہ روشندانوں سے دھوپ اندر آ کر اس کے شوہر کے خالی
د پوری طرح روشن کیے ہوئے ہے۔

ماں نے ابھی تک اپنے بیٹے کے خالی بستر کو نہیں دیکھا تھا۔ اور وہ واپس اپنی کوٹھڑی
جانے کے لیے مڑ رہی تھی اور ساتھ ہی کہہ رہی تھی "بارہ بج گئے۔ پیٹ میں کچھ گیا ہی نہیں"۔
زینب صبح سویرے اُٹھ کر سب سے پہلے اپنی ساس کے ناشتے کا انتظام کرتی تھی۔ دلیہ بناتی
ور چائے کی کیتلی کے ساتھ ایک پیالہ اس کی چارپائی کے قریب پڑی ہوئی پرانی میز پر رکھ
دی سے باورچی خانے میں لوٹ جاتی تھی اور شوہر کے لیے پراٹھے پکانے لگتی تھی۔
جاگ اُٹھتا تو اسے گود میں لیے اپنے کام میں مشغول رہتی۔ برتن مانجھنے سے کچھ دیر پہلے
ت کی روٹی گرم کر کے چائے کے ساتھ ناشتہ کرتی۔ یہ اُس کے روز کا معمول تھا۔ اور
اُس کے معمول میں فرق آ گیا تھا۔

اُس نے ساس کے لیے دلیہ وغیرہ پکایا اور کوٹھڑی میں جا کر رکھ آئی۔

"نی زینبو! اشرف چلا گیا؟"

زینب نے آہستہ سے کہا "چلا گیا ہو گا"۔ اُس کی ساس یہ فقرہ نہ سُن سکی۔ کیونکہ اس نے چمچ
کی پلیٹ میں ڈال دیا تھا۔

زینب وہیں کھڑی تھی اور دیکھ رہی تھی کہ دلیے سے بھرا ہوا چمچ پلیٹ اور منہ کا
ن فاصلہ تیزی سے طے کر رہا ہے۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ رات اشرف نہیں آیا مگر ابھی
کوئی لفظ اُس کے منہ سے نہیں نکلا تھا۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"شیرا جاگا؟" ساس نے پوچھا۔

زینب کو شیرے کا خیال آگیا۔ وہ بھاگی اپنے کمرے کی طرف۔ شیرا سو رہا تھا۔ اُسے سب کچھ عجیب عجیب لگ رہا تھا۔ اشرف کا بستر خالی تھا۔ شیرا جاگا نہیں تھا اور کمرے میں دُھوپ بھر گئی تھی۔ اس نے پہلے کبھی کمرے میں دھوپ کو اِس طرح پھیلتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔ اور کاموں میں مصروف ہو گئی۔ مگر یہ فقرہ بار بار اُس کے ذہن میں جاگ اُٹھتا تھا "اشرف رات نہیں آیا۔ اشرف رات نہیں آیا"۔

وہ بغیر کچھ سوچے کام کر رہی تھی۔ رات کے چاول گرم کر کے اُن پر دودھ ڈال کر کھانا۔ شیرے کو دُودھ پلانا۔ اس کا منہ دھلانا۔ جلے ہوئے اور ادھ جلے کوئلوں کو ایک پرانی ہانڈی میں ڈال کر انہیں رات کے لیے محفوظ کرنا۔ حمام کے پاس پیڑھی پر بیٹھ کر برتن مانجھنا۔ پہلے وہ یہ کام کرتی تھی تو اسے ہر لمحہ احساس رہتا تھا کہ اب کیا کر رہی ہے اور اس کے بعد کیا کرے گی مگر اس دن وہ مشین کی طرح اپنے ہاتھ پاؤں ہلا رہی تھی۔ اِس دوران میں جب بھی کوئی چیز رکھنے یا لے جانے کے لیے اپنے کمرے میں جاتی تو اشرف کا بغیر سلوٹوں کا بستر اس سے ایک سوال پوچھ لیتا تھا اور وہ دو چار لمحے بستر کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کے بعد کمرے سے باہر نکل جاتی تھی۔

اپنی ساس کے کپڑوں پر صابن لگاتے ہوئے اُس کے ہاتھ یکایک رُک گئے۔ اُس نے اُوپر دیکھا اور اُس کے ہونٹوں سے ایک دعائیہ فقرہ نکل گیا۔

"اللہ میاں، اشرف کو کچھ نہ ہو۔ اللہ میاں"۔

اُس نے تین چار بار آنکھیں جھپکائیں اور کپڑوں پر زور زور سے ڈنڈے مارنے لگی۔

جاڑے کی تاریک اور لمبی رات۔ زینب چارپائی پر لیٹی سامنے دیوار کو مسلسل گھور رہی تھی۔ عام طور پر آٹھ نو بجے وہ کمرے کا بلب بجھا دیا کرتی تھی۔ شیرا جاگ اُٹھتا تھا تو اندھیرے ہی میں اسے دُودھ پلا دیا کرتی تھی۔ دن بھر کاموں میں جُتے رہنے کی وجہ سے وہ بہت تھک جاتی تھی اور جلد ہی سو جاتی تھی۔ مگر اُس رات کمرہ روشن تھا۔ اور اُس کی آنکھیں کُھلی تھیں باوجودیکہ اس نے دن کے وقت عام دنوں کے مقابلے میں دُگنا کام کیا تھا۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

وہ نہیں جانتی تھی کہ رات کتنی بیت گئی ہے۔ اور کتنی باقی ہے۔ البتہ وہ یہ ضرور جانتی تھی کہ وہ جاگ رہی ہے اور اشرف کا بستر خالی ہے۔

ہوا کا ایک سرد جھونکا نہ جانے کدھر سے آیا اور اس کے چہرے کو مَس کرتا ہوا گزر گیا۔ اس نے سوتے ہوئے بچے کو جلدی سے اٹھایا اور اسے گود میں لے کر اُس کے چاروں طرف لحاف پھیلا دیا۔

"ہائے اتنی سردی میں وہ کہاں ہوگا۔ اللہ میاں! اسے کچھ نہ ہو۔"

وہ کئی منٹ یونہی بیٹھی رہی۔

"ہیں یہ کیا؟" اُس نے خود سے سوال کیا۔ باہر کسی بھاری چیز کے گرنے کی آواز آئی تھی۔ اس نے شیرے کو آہستہ سے بستر پر لٹا دیا۔ چارپائی سے اُٹھ کر دروازے پر آئی دروازے کو کھولا۔ سامنے دیوار کے قریب ایک سایہ سا نظر آ رہا تھا۔

"یہ کون ہے؟"

اُس نے چیخ مارنی چاہی مگر مار نہ سکی۔

اشرف دروازے میں سے داخل ہو چکا تھا۔ وہ بُری طرح لڑکھڑا رہا تھا اور زینب اسے بڑی حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

"دروا... زہ — کھولا تا ناہیں" اشرف کی زبان سے الفاظ اپنی اصلی صورتوں میں ادا نہیں ہو رہے تھے۔ زینب اسے بدستور حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

"آپ — تم — کیا آرڈر لے سرکار۔ چائے یا فت سیٹ — نے ہیں — فل سے... ٹ... ہیں... نہیں آہاہا ہاہا... ہاہا" اور وہ اپنی چارپائی پہ گر پڑا۔

"دیکھ رہی ہے ادھر ام... نادی! لحاف۔ لا ہرف... لیا ہوف۔"

زینب نے اس پر لحاف ڈال دیا۔ اشرف نے منہ بھی لحاف کے اندر چھپا لیا۔ شاید وہ سو گیا تھا۔

یہ کیا ہُوا ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ زینب کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ اچانک اس کی نظر اپنی چارپائی پر پڑی۔ شیرا اُٹھ بیٹھا تھا۔ اور دایاں ہاتھ یوں لہرا

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

رہا تھا جیسے ماں کو ڈھونڈ رہا ہو۔ زینب جلدی سے اس کے پاس پہنچی اور اسے گود میں اُٹھا لیا۔ شیرے کا ننھا ہاتھ جیسے ہی اُس کی دائیں آنکھ سے لگا زینب کے دل کا بوجھ ہلکا ہونے لگا اور اس کے رخسار بھیگنے لگے۔ اس نے اپنے بچے کو بھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور اُس کا بدن دیر تک کانپتا رہا اور بچہ اسے خوف زدہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ اشرف کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا کہ ساتھ والی چارپائی پر کیا ہو رہا ہے۔

جمعہ کی دوپہر کو حسا دھوبی دُھلے ہوئے کپڑے لے کر آیا۔ زینب نے ہر ایک کے کپڑے الگ الگ کر دیئے۔ زیادہ کپڑے اشرف ہی کے تھے کیونکہ اپنے، اپنی ساس کے اور شیرے کے کپڑے وہ گھر ہی میں دھو لیتی تھی۔ اشرف کی تین پتلونیں اور دو قمیصیں اُٹھا کر جب وہ ٹرنکوں والے کمرے میں گئی تو اس نے یہ کپڑے ایک کرسی پر رکھ دیئے۔ اشرف کے کپڑوں والا ٹرنک کھولا کہ اس میں یہ کپڑے بھی ڈال دے۔ ٹرنک میں ایک جگہ کپڑے کچھ اُوپر اُٹھے ہوئے تھے۔ زینب نے اپنا ہاتھ اُبھرے ہوئے کپڑوں کے نیچے ڈالا تو اسے کسی سخت چیز کا احساس ہوا۔

"ہیں یہ کیا شے ہے؟"

اُس نے وہ چیز پکڑ لی اور اسے باہر نکال لیا۔ یہ ایک بوتل تھی۔ اس بوتل سے ذرا چھوٹی جس میں وہ بازار سے مٹی کا تیل لایا کرتی تھی۔

زینب اُسے اُٹھا کر دیکھنے لگی۔ بوتل کے اردگرد ایک کاغذ لپٹا ہوا تھا اور اس کاغذ پر انگریزی کے کچھ حروف چھپے تھے۔ زینب اُردو کے چند عام لفظوں کو تو پڑھ سکتی تھی مگر انگریزی سے بالکل نابلد تھی۔

"تیل ہوگا" اُس نے اپنے دل کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ مگر تیل والی بوتل کو یہاں رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ اُس نے خود سے سوال کیا۔

شام کے قریب رحمت مشار کی بہو صفیہ اس کے ہاں آگئی۔ اور وہ اسے ٹرنکوں والے کمرے میں لے گئی۔

"صفو!"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"کیا ہے؟"

"دیکھو یہ بوتل۔" زینب نے ٹرنک میں سے بوتل نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔

صفیہ نے بوتل اٹھائی۔ اسے غور سے دیکھا اور بولی:

"اری.... یہ تو وہ ہے.... شاراب۔"

"شراب۔"

"ہاں ہاں۔ میرا وہ رنڈوا جیٹھ ہے نا.... وہ بھی ایسی بوتلیں گھر میں لایا کرتا ہے۔"

"اچھا۔"

"اور کیا ــــ نی ــــ اس کی ماں کو دکھا دے جا کر۔ شاراب ہے شاراب۔"

"ماں کیا کرے گی؟"

صفیہ اپنے گھر چلی گئی تو زینب نے بوتل کو ٹرنکوں کے پیچھے اس انگیٹھی میں رکھ دیا
ں میں اس دقت کوئلے جلاتے جاتے تھے۔ جب اس کے بچہ ہونے والا تھا، ایک سال
، یہ انگیٹھی یہیں پڑی تھی۔

زینب نے انگیٹھی کے اوپر ایک تکیے کا پرانا اور پھٹا ہوا غلاف ڈال دیا اس طرح
ں کمرے میں آنے والے کو نظر نہیں آ سکتی تھی۔ اور کمرے میں آنے والا اشرف ہی ہو
ا تھا۔

اس رات اشرف جلدی گھر آ گیا۔ وہ اب بھی نشے میں تھا۔ مگر پہلے کی طرح لڑکھڑا نہیں
تھا۔

"تو شراب پیتا ہے۔" زینب نے اسے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر کہا:

"پیتا ہوں۔ تیرے باپ کی کمائی میں سے تو نہیں پیتا۔"

"میرے باپ نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔" زینب اپنے مرے ہوئے باپ کا بڑا احترام
تی تھی۔

"تیرا باپ ــــ" اشرف نے اس کے باپ کو فحش گالیاں دینی شروع کر دیں زینب
اس کے منہ پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی تو اس زور سے اس کے گال پر تھپڑ مارا کہ وہ

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

چکرا کر گر پڑی اور جب تک وہ اُٹھے اشرف کمرے سے نکل چکا تھا۔

زینب کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ گرتے وقت اُس کا سر بھی دیوار سے جا ٹکرایا تھا۔ وہ چارپائی پر گر پڑی۔ تھوڑی دیر بعد اس کے شوہر کی آواز آئی:

"بوتل کہاں ہے؟"

"نہیں دیتی۔ تُو شراب پی کر میرے باپ کو گالیاں دیتا ہے۔ مجھے مارتا ہے۔"

"تُو تو شراب پی کر مجھے مارے گی۔ ہی ہی ہی ہی۔ ہا ہا ہا ہا۔" اشرف کے قہقہے رُکتے ہی نہیں تھے۔

زینب کو یوں محسوس ہُوا، جیسے یہ باتیں خواب میں ہوئی ہیں اور وہ سارا وقت سوتی رہی ہے۔

صبح جب آنکھ کھُلی تو اُس کے شوہر کا بستر پہلے کی طرح خالی تھا۔ اُس کا دل آج کام کرنے کو نہیں چاہتا تھا۔ تاہم اُس نے ساس کے لیے ناشتہ تیار کیا اور جب اُس کے پاس لے کر گئی تو وہ اسے دیکھ کر پھنکارنے لگی:

"نی زینبو گشتیے تیرا خصم کہاں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میں کیا جانوں۔ اس سے پوچھو۔ اپنے پُتر سے پُوچھو۔"

"نی سُنا ہے شراب پینے لگا ہے۔"

"پیتا ہوگا۔"

"نی زینبو۔" زینب کو مخاطب کر کے ساس نے اور کیا کہا تھا۔ وہ نہ سُن سکی۔ وہ کوٹھڑی سے باہر آگئی تھی۔ آدھی رات سے اُسے پیاس لگی تھی۔ اب تک پانی نہیں پی سکی تھی۔ وہ باورچی خانے میں جانے لگی مگر نہ جانے کیا ہُوا کہ اُس کے پاؤں اسے باورچی خانے کی بجائے ٹرنکوں والے کمرے میں لے گئے۔

وہ اس کمرے میں تھی جہاں صندوقوں اور ٹرنکوں کی ایک ڈیڑھ گز اُونچی قطار کے پیچھے ایک انگیٹھی میں پُرانے پھٹے ہوئے غلاف سے ڈھکی ہوئی بوتل پڑی تھی۔ اُس نے اپنا ہاتھ بوتل کی طرف بڑھایا۔ ایک دم اسے احساس ہوا کہ غلاف بوتل پر اس انداز سے نہیں پڑا

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ہوا جس انداز سے اُس نے رکھا تھا۔

"بوتل بے گیا ہے"۔ اُس نے خود سے کہا لیکن جب غلاف کا کپڑا ہٹایا تو بوتل ویسی کی ویسی پڑی تھی۔

وہ اسے ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگی۔

بوتل کا رنگ سیاہی مائل تھا اور اس کے اندر جو شراب تھی، اس کا رنگ وہ اچھی طرح دیکھ نہیں سکتی تھی۔

اس نے سوچا یہی شراب پی کر وہ لڑکھڑا کر چلا تھا۔ اسی کے نشے میں اس نے اس کے مرے ہوئے باپ کو گالیاں دی تھیں اور اسے مارا تھا: "یہ بوتل۔ اونہہ بوتل شراب کی۔ ہونہہ۔ بڑا آیا۔ میں اسے باہر نالی میں پھینک دُوں گی"۔

مگر وہ اپنی جگہ پر اس طرح بیٹھی رہی جیسے زمین نے اس کے پاؤں پکڑ رکھے ہیں۔ وہ بوتل کو کبھی ایک ہاتھ میں پکڑتی تھی اور کبھی دوسرے ہاتھ میں۔ انہی لمحوں میں اشرف کی آواز گونجی:

"او زینبو!"

"اشرف مجھے ڈھونڈ رہا ہے۔ وہ مجھ سے کہے گا۔ میری بوتل کہاں ہے اور جب وہ اسے میرے ہاتھ میں دیکھے گا تو بھاگ کر میری طرف آئے گا اور یہ بوتل چھینے گا۔ میں نہیں دوں گی۔ وہ مجھے گالیاں دے گا۔ مجھے مارے گا۔ میرے مرے ہوئے باپ کو گالیاں دے گا"۔

اور اشرف کی آواز پھر آئی:

"او زینبو"

زینب کو یوں لگا جیسے اس کی پیاس ایک دم بڑھ گئی ہے۔ اُس کے اندر آگ بھڑک اُٹھی ہے۔

جب تک اشرف اندر آتے، اس نے بوتل منہ سے لگا کر اسے خالی کر دیا تھا۔

اشرف زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔ زور سے اور زور سے اور اسی گھڑی زینب

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

کا ہاتھ اُوپر اُٹھا اور دوسرے ہی لمحے میں اشرف کے سر سے شرر شرر لہو بہنے لگا اور بوتل نیچے گر کر بے شمار چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں پھیل گئی۔

زینب اسے دیکھتی رہی۔ دیکھتی رہی۔

تھوڑی دیر بعد جب محلّے کے لوگ اشرف کو چارپائی پر ڈال کر ہسپتال لے جانے لگے تو وہ ہوش میں آگیا اور چیخ چیخ کر کہنے لگا۔

"لوگو! میں نے شراب پی کر۔ بوتل میں پانی بھر دیا تھا۔ یہ نشہ کہاں سے آگیا — یہ نشہ کہاں سے آگیا — لوگو یہ نشہ — کہاں —"

فرطِ نقاہت سے اس کی آواز بند ہوگئی اور ٹکڑوں والے کمرے میں صفیہ نے زینب کا بازو پکڑ رکھا تھا۔ اور زینب اس طرح لڑکھڑا کر چل رہی تھی جیسے اس نے شراب کی پوری بوتل چڑھا رکھی ہے۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

نیلم پری

ہمارے مکان کی چھت کے شمال مغربی سرے پر جو چھوٹا سا کمرہ آج بھی موجود ہے ہم اسے "چوبارہ" کہتے تھے اور اس چوبارے کی سب سے بڑی افادیت یہ تھی کہ گرمی کی راتوں میں جب سارا خاندان چھت پر سوتا تھا، بارش ہونے پر اپنی چارپائیوں کو اس کی چاردیواری میں محفوظ کر دیتے تھے اور یوں یہ چوبارہ چارپائیوں کی پناہ گاہ بن جاتا تھا۔ اس چوبارے کی ایک اور افادیت بھی تھی اور وہ یہ کہ میں اپنے سکول کا کام اور مطالعہ یہیں کرتا تھا۔ اس لیے مجھے اس کی دیواروں سے کچھ اُنس ہو گیا تھا۔ یہاں کتاب کھول کر بیٹھ جاتا تھا تو نہ جانے کیوں دل و دماغ کو ایک قسم کی سکون آمیز کیفیت محسوس ہونے لگتی تھی۔ چوبارے میں شمال کی طرف رُخ کر کے کھڑے ہوں تو اس کا مغربی دروازہ اُس چھت کی طرف کھلتا ہے جو ہمارے مکان کے پرلے کمرے کے اُوپر واقع ہے۔ یہ چھت جہاں ختم ہوتی ہے وہاں کچھ دُور ایک "تنگ" بنا ہوا تھا۔ اس تنگ کے نیچے جو کمرہ مکان کی دوسری منزل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے کچے فرش پر بھی اسی طول و عرض کا تنگ نظر آ جاتا تھا۔ اس تنگ کی غرض و غایت یہ تھی کہ اُوپر کے تنگ سے ہوا اور روشنی حاصل کر کے نچلے کمرے تک پہنچا دے۔ اسی راستے سے مینہ کا پانی بھی نیچے پہنچ جاتا تھا۔ اس پانی کے نکاس کی بھی ضرور کوئی صورت ہو گی جس کا مجھے علم نہیں ہے۔ کمرے کی شمالی دیوار میں ایک کھڑکی کھلتی تھی اور اس کھڑکی کے آگے مایا رام کی کٹڑی کے ایک حصے کی چھت پھیلی ہوئی تھی۔ یہ مکان

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

جس کا میں نے ذکر کیا ہے اسی مایارام کا مملوکہ تھا۔

میں نے چھت پر جا کر اس تگ سے بارہا نیچے دیکھا اور شاذ و نادر ہی کمرے کو خالی پایا تھا۔ اس کمرے میں ایک مختصر سا کنبہ آباد تھا۔ جس کے صرف تین افراد تھے۔ ایک بوڑھی عورت جو اس کنبے کی سربراہ تھی۔ یہ معمر خاتون عیسیٰ کی ماں اور عیسیٰ کی بیوی کی ساس تھی اور عیسیٰ کسی سرکاری دفتر میں کام کرتا تھا۔ میں سکول کا کام ختم کرتے یا مطالعہ کرتے کرتے اکتا جاتا تو چوبارے سے باہر نکل کر چھت پر ٹہلنا شروع کر دیتا۔ ٹہلتے ٹہلتے کبھی کبھی تگ کے پاس بھی چلا جاتا۔ اس وقت غالباً غیر ارادی طور پر نیچے جھانک لیتا اور پھر جلدی سے پیچھے ہٹ جاتا۔ یوں کسی کے گھر میں جھانکنا ایک معیوب فعل ہے مگر تگ کے پاس جا کر ایک دو بار نیچے نہ جھانکنا میرے لیے مشکل تھا۔ میں بالعموم کنبے کے تینوں افراد کو اس پرانی جھلنگا چارپائی پر بیٹھے ہوئے پاتا جو کھڑکی کے قریب دیوار کے ساتھ ہمیشہ بچھی رہتی تھی۔ ماں کے ساتھ اگر اس کا بیٹا دائیں جانب ہوتا تو اس کی بہو ذرا فاصلے پر سجاتی شرماتی ہوتی بیٹھی ہوتی۔ بہو، ساس کی موجودگی میں شوہر سے جُڑ کر نہیں بیٹھتی تھی۔ کبھی تینوں باتیں کرتے ہوتے کبھی کھانا کھانے میں مصروف ہوتے اور کسی دن یوں بھی ہوتا کہ میں انہیں دیکھتا تو وہ خاموش نظر آتے۔ مگر یہ عجیب بات تھی کہ میں نے بہو کو ہمیشہ سجاتے ہوئے، شرماتے ہوئے ہی پایا تھا۔ ماں بیٹا بڑے انہماک سے گفتگو کرتے تو وہ نظریں جھکائے شرماتی رہتی۔ کھانا کھاتے ہوتے تو وہ رک رک کر مسکرا مسکرا کر لقمہ توڑتی یا چمچ میں چاول ڈالتی اور اسی انداز میں اُس کا ہاتھ منہ کی طرف آتا۔ کبھی سربراہ خاتون چارپائی پر نہ ہوتی جب بھی بہو کے شرمانے کے انداز میں کوئی نمایاں فرق محسوس نہ ہوتا۔ شوہر ہنستا رہتا اور یہ مسکراتی رہتی۔ کھل کر قہقہہ کبھی نہ لگاتی۔

ماں اور بیٹا۔ دونوں حقے کے رسیا تھے لیکن بہو کو میں نے کبھی کش لیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ بڑھیا کے بالوں میں سفید تار چمکتے رہتے تھے۔ رنگ سُرخ و سفید تھا۔ اس کا بیٹا ماں سے گہری مماثلت رکھتا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں، ستواں ناک، لمبا چہرہ اور بھرا۔ مجھے وہ فلم پری دکھائی دیتی تھی جس کی کہانی میں نے کہانیوں کی ایک کتاب میں پڑھی

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ی اور جو ایک شہزادے پر عاشق ہو کر پرستان سے نکل کر انسانوں کی دنیا میں آگئی
ی۔ اُس کا رنگ گورا تھا۔ لمبی ناک، چھوٹے چھوٹے ہونٹ اور بال سنہری۔ میں
سے کم دیتیں روزانہ دیکھتا تھا اور میرا جی چاہتا تھا کہ اس کی آواز بھی سنوں اور یہ کبھی
ن نہ ہوا۔ کیونکہ اوّل تو وہ بولتی ہی نہیں تھی اور بولتی بھی تھی، تو بڑے مدھم لہجے
ں اور پھر میرا معاملہ تو فقط تانک جھانک تک تھا۔ ان چند لمحوں میں آواز سننے کی خواہش
ونکر پوری ہو سکتی تھی؟

میں انہیں دیکھتا تھا یقیناً وہ بھی مجھے دیکھ لیتے ہوں گے مگر انہوں نے کبھی
ری تاک جھانک پر تعرض نہیں کیا تھا۔ کبھی گرم نگاہی سے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ بس
جھتے ہوں گے ایک لڑکا ہی تو ہے۔ کیا ہوا جو اس نے جھانک کر ہمیں دیکھ لیا ہے۔
یں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ہمارا کوئی راز معلوم نہیں کر سکتا۔ معلوم کر بھی لے تو کیا
چ ہے، شاید وہ اسی قسم کی باتیں سوچ لیتے ہوں گے اور میں بھی ممٹی کے سرے
ے ہٹ کر دوبارہ اپنی جگہ پر جا کر کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا تھا۔ مثلاً یہ کہ تینوں آپس میں کیا باتیں
رتے ہیں۔ ان کی گفتگو کے موضوعات کیا ہیں۔ کیا انہیں ایک دوسرے سے کوئی شکایت
ی ہے۔ کوئی گلہ بھی ہے۔ ان کی سوچ کیا ہے۔ ان کے مسائل کیا ہیں۔ ان کے
ات و کوائف کیا ہیں؟ یہ نہیں کہ ان تینوں کو میں نے اکٹھا چارپائی کے اوپر ہی
ٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ ایسا نہیں ہے۔ کبھی کبھی ان میں سے دو یعنی ساس اور بہو بھی نظر
آتی تھیں۔ الگ الگ کاموں میں مصروف ساس چارپائی پر بیٹھی ہوتی کوئی کپڑا سی رہی
ے اور بہو زمین پہ چوکی کے اوپر بیٹھی ہے اور آٹا گوندھ رہی ہے یا اس جگہ جہاں مٹی
ے دو گھڑے پڑے ہیں۔ کپڑے دھو رہی ہے اور کپڑے نہیں دھو رہی تو جھاڑو دے
ی ہے۔ میں نے اُسے جس حالت میں بھی دیکھا تھا۔ مسکراتے ہوئے ہی پایا تھا۔
س کی مسکراہٹ بڑی عجیب تھی۔ اس میں شوخی نہیں تھی۔ تیکھا پن بھی نہیں تھا۔ وہ
یس مسکراہٹ تھی۔ نرم نرم سی، لطیف لطیف سی، اُجلی اُجلی سی۔ یہ مسکراہٹ اُس کے
نٹوں پر، اس کی آنکھوں میں بغیر کسی کوشش کے پھیلی رہتی تھی۔ اور مجھے کچھ یوں

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

محسوس ہوتا تھا کہ اس مسکراہٹ کو الگ کر کے اس کے چہرے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مسکراہٹ اس کے ساتھ ہی دنیا میں آئی ہے، اور ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گی۔

کبھی کبھی ایک سوال میرے ذہن میں در آتا تھا۔ وہ سچ مچ مسکراتی رہتی ہے یا میں ہی اسے مسکراتے ہوئے محسوس کرتا ہوں۔ مگر اس سوال پر میں نے زیادہ غور کرنا مناسب ہی نہیں سمجھا تھا۔ دل سے کہتا تھا۔ وہ اگر مسکراتی ہے تو لازماً مسکراتی ہے اور اگر نہیں مسکراتی جب بھی مسکراتی ہے۔ میں نے اُسے کبھی قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ نہ تو کبھی ہمارے ہاں آئی تھی اور نہ مجھے ان کے گھر کے اندر جانے کا موقع ملا تھا۔ اُس زمانے میں ہر تہوار بڑے زور شور سے منایا جاتا تھا۔ بسنت، ہولی، دیوالی۔ ہر ایک کی اپنی اپنی اہمیت تھی۔ دیوالی کے دنوں میں کھانڈ کے بنے ہوئے طرح طرح کے کھلونے بکتے تھے اور دیوالی کی رات کو ہندو گھروں میں مٹی کے دیئے جلا کر لکشمی دیوی کا سواگت کیا جاتا تھا۔ مسلمان دیئے نہیں جلاتے تھے مگر کھانڈ کے کھلونے ضرور خرید کر اپنے بچوں کو دیتے تھے اور یہ کھلونے کئی کئی دن گھروں میں سجے رہتے تھے۔

میں ایک شام لوہاری منڈی میں سے گزر رہا تھا کہ یونہی کھلونوں کی ایک دکان کے پاس جا کر رک گیا۔ ایک سفید چادر کے اوپر ترتیب کے ساتھ کھلونے رکھے ہوئے تھے۔ زیادہ تعداد تو ان کھلونوں کی تھی جو ہندو دیوتاؤں اور دیویوں کی نمائندگی کر رہے تھے۔ ان سے ہٹ کر چھوٹی بڑی گڑیاں تھیں۔ ایک گڑیا پر میری نظر پہنچ کر جم سی گئی۔ نازک سا پیکر، پتلی سی ناک، پتلے سے ہونٹ۔ مجھے یہ دیکھ کر کافی حیرت ہوئی کہ گڑیا اور میری مسکرانے والی ہمسائی کے چہروں میں غیر معمولی مشابہت پائی جاتی ہے۔ میں اسے دیکھتا رہا اور جب دکان سے آگے بڑھا تو وہ گڑیا میرے ہاتھ میں تھی۔

گھر آ کر میں نے گڑیا کو اخبار کے کاغذ میں اچھی طرح لپیٹ کر اپنی الماری میں کپڑوں اور کتابوں کے نیچے رکھ دیا اور مطمئن ہو گیا کہ کسی کی نظر اس پر نہیں پڑے گی۔ اور دوپہر کے وقت جب حساب کا کوئی سوال حل کرنے کی کوشش کر رہا تھا میرے دل میں یہ خیال آیا کہ دیکھوں تو کھانڈ کی گڑیا اور میری ہمسائی میں واقعی مشابہت ہے یا صرف میرا اپنا

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

خیال ہے۔

میں نے کاپی اور قلم کو تو رکھا ایک طرف اور چوبارے سے باہر آ کر کوٹھے پر ٹہلنے لگا۔ اس وقت ایک دُم تنگ کے پاس نہیں جاتا تھا۔ چند منٹ ٹہلنے کے بعد جاتا تھا۔ اس سے غالباً میں اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لیا کرتا تھا کہ ارادہ کر کے اس کے گھر میں نہیں جھانکتا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہاں جا پہنچا ہوں۔ وہ ایک چٹائی کے اوپر بیٹھی تھی اور اس کا ہاتھ کپڑے سینے والی مشین کی ہتھی کو گردش میں لا رہا تھا۔ وہ جھکی ہوئی تھی۔ میں اس کے چہرے کو نہیں دیکھ سکتا تھا اس کی ساس چارپائی پر بیٹھی ٹھٹھر رہی تھی۔ دھوپ میں میرا سایہ اس کے قریب پڑا تو وہ بولی :

"کون آیا ہے؟"

بہو نے جواب دیا: "کوئی نہیں اماں۔"

"نہیں کوئی آیا ہے۔" ساس یقیناً میرے سائے کو دیکھ رہی تھی۔

"وہی ہوگا۔ اوپر والا۔ پگلا۔" یہ لفظ جیسے ہی میرے کان میں پڑے میں بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا سر تو جھکا ہوا تھا اس نے مجھے کیونکر دیکھ لیا۔ میں حیران تھا اور کئی روز تک حیران رہا۔

رات میں نے الماری میں سے کہانیوں کی کتاب نکالی اور اس میں سے وہی کہانی پڑھنے لگا جو نیلم پری اور ایک شہزادے کے بارے میں تھی اور جسے میں پہلے بھی دو تین بار پڑھ چکا تھا۔ جس وقت کہانی کے اس حصے پر پہنچا جہاں نیم پری پرستان سے باہر آ کر شہزادے کے محل میں رہنے کا ارادہ کرتی ہے اور شہزادیوں کا سا لباس پہنتی ہے تو معاً مجھے خیال آیا کہ کھانڈ کی گڑیا کو بھی کوئی لباس پہنانا چاہیے۔ یہ لباس کس رنگ کا ہونا چاہیے نیلے رنگ کا لیکن یہ لباس آئے گا کہاں سے، یہ خاصا مشکل مسئلہ تھا مگر اتفاق ایسا ہوا کہ دو تین روز بعد میری نگاہ اچانک چھوٹی بہن زبیدہ کے اس تھیلے پر پڑ گئی جس میں وہ اپنی گڑیوں کے کپڑے رکھتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس میں نیلے رنگ کے کپڑے بھی ہوں گے اور جب میں نے تھیلے کو کھولا اور اس میں سے سارے کے سارے کپڑے

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

باہر نکال کر ڈھیر کر دیے تو پہلی نظر میں نیلے رنگ کا کوئی کپڑا دکھائی نہ دیا مگر جب انہیں دوبارہ تھیلے میں ڈال رہا تھا تو ایک نیلا سُوٹ نظر آ گیا۔ نیلا سُوٹ یعنی شلوار، نیلا کرتہ اور نیلا دوپٹہ۔ لگتا تھا میری بہن نے یہ کپڑے کھانڈ کی اسی گڑیا کے لیے بنائے تھے۔ اور اب یہ لباس میرے ہاتھ میں تھا۔ تھیلا تو مَیں نے وہیں رکھ دیا جہاں سے اُٹھایا تھا اور اس اطمینان کے بعد کہ گھر کے سب لوگ اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں۔ کمرے میں کسی کے فوری طور پر آنے کی توقع نہیں ہے۔ مَیں نے اخبار میں سے گڑیا نکالی اور اسے کپڑے پہنانے لگا۔ یہ زندگی کا پہلا تجربہ تھا اور مجھے کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی بڑی عجیب، بڑی مضحکہ خیز حرکت کر رہا ہوں۔ اگر بہن دیکھ لے تو۔

"بھائی جان! ہائے اللہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ یہ کیا ہے اور یہ میری گڑیا کے کپڑے امّی۔"

اور اگر اس خاتون کو میری اس حرکت کا علم ہو جائے تو کیا کہے گی۔ کیا سوچے گی۔ کہے گی نہیں یہ اُوپر والا پگلا کچھ زیادہ ہی پگلا ہو گیا ہے۔ اور مَیں واقعی کچھ زیادہ ہی پگلا ہو گیا تھا۔ مَیں ایسا کیوں کر رہا تھا۔ مَیں خود سے سوال کرتا تو کوئی جواب نہ دے سکتا۔ میرے ذہن پر ایک سنسنی سی چھا رہی تھی۔ چند منٹ میں کھانڈ کی گڑیا کی بجائے ایک چھوٹی سی نیلم پری تھی میرے سامنے۔ اور مَیں اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ اُس کا جائزہ لے رہا تھا مَیں نے اسے غور سے دیکھا۔ ہُو بہُو وہی شکل۔ لگتا تھا یہ اس کی طرح مسکرا بھی رہی ہے اور اس کی مسکراہٹ میں بھی وہی شرمیلا پن ہے۔ اس کی آنکھوں میں بھی وہی جھجک ہے، وہی لیے دیئے رہنے کا انداز ہے اور مَیں خیال کرنے لگا کہ یہ کوئی بے جان گڑیا نہیں۔ ایک زندہ انسان ہے۔ پرستان سے آئی ہوئی نیلم پری ہے۔

اس وقت مَیں نے نیلم پری کو دوبارہ اپنے ٹرنک میں کتابوں اور کپڑوں کے نیچے چھپا دیا۔ چھپا تو دیا پر رہ رہ کر دل میں یہ اندیشہ جاگ اُٹھتا تھا کہ کسی نے اسے دیکھ لیا تو اس کی خیر نہیں ہے۔ آخر یہ ہے تو کھانڈ کا ایک کھلونا ہی نا۔ اور کھانڈ کے کھلونے کھانے کے لیے ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ بھی یہی سلوک ہو گا۔ میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ شاید ان لمحوں میں

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

اذیت ناک خیال میرے ذہن میں آگیا ہوگا کہ یہ تو ایک جیتا جاگتا انسان ہے۔ کیا اسے بھی
بنایا جا سکتا ہے؟ اس شام میں نے نیلم پری کی کہانی پڑھتے ہوئے محسوس کیا کہ میرے
سینے پر ایک بوجھ آپڑا ہے اور یہ بوجھ ایک راز ہے۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ زبیدہ
کو یہ راز بتا دوں گا۔ اسے بتا دوں گا کہ میں نے اس کی گڑیا کے کپڑے چُرا کر ایک کھلونے
کو پہنا دیئے ہیں اور یہ کھلونا نیلم پری بن گیا ہے۔ وہ ہنسے گی لیکن اس سے یہ ضرور ہوگا
میرے سینے کا بوجھ اُتر جائے گا اور میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ صبح سکول جانے سے
پہلے زبیدہ کو اپنے کمرے میں لے آؤں گا اور اسے سارا واقعہ سُنا دوں گا۔ صبح ہوئی۔
میں ابھی ناشتے سے فارغ بھی نہیں ہوا تھا کہ زبیدہ خود بخود میرے پاس آگئی۔

"بھائی جان! آپ کا ٹرنک کہاں ہے؟"

"کیوں۔ تمہیں میرے ٹرنک سے واسطہ؟"

"میں نے پتہ نہیں اپنی گڑیا کا نیلا سوٹ اُس میں نہ رکھ دیا ہو؟"

"نہیں، نہیں، بالکل نہیں۔"

"اچھا، پر بھائی جان! ہے نا عجیب بات۔ میری گڑیا کے کپڑے گُم ہو گئے ہیں۔
شاید آپ نے دیکھے ہوں۔"

"دیکھے ہیں۔"

"کہاں!"

"وہ رات میں نے نیلم پری دیکھی تھی خواب میں۔ اُس نے یہ تمہارا سوٹ پہن
رکھا تھا۔"

زبیدہ کا چہرہ جو ایک ذہنی اُلجھن کی وجہ سے افسردہ نظر آرہا تھا۔ یک لخت
شگفتہ ہو گیا۔

"شاید وہ بھی گی جو کہانی والے شہزادے کے محل میں چلی گئی تھی۔"

"شاید۔"

میری بہن چلی گئی۔ یہ سارا مکالمہ چند لمحوں میں ختم ہو گیا۔ حیران تھا کہ یہ بات

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

آناً فاناً مجھے سُوجھ کیونکر گئی کہ اُسے اس طرح فریب دے دُوں۔ میں نے تو ارادہ کر لیا تھا کہ اُسے یہ راز بتا کر نہ جاؤں گا۔ یہ میں نے اس سے کیا کہہ دیا۔ کیوں کہہ دیا؟ اس دن کے بعد میں سچ مچ اس شرمیلی مسکراہٹ والی خاتون کو نیلم پری سمجھنے لگا۔

لیل و نہار کی گردش جاری رہی۔ اندھیرے لہراتے رہے، اُجالے مہکتے رہے، گھروں کے اندر مسکراہٹیں بکھرتی رہیں، گھروں کے باہر ہلچل مچتی رہی۔ وقت کا چہرہ چمکتا دمکتا رہا۔ یکایک کہیں سے ایک بھیانک سایہ لاہور کی فضا میں در آیا۔ چلتا گیا۔ آگے بڑھتا گیا۔ اور مایا رام کی کشٹری میں آکر رُک گیا۔ شور ہوا طاعون پھوٹ پڑی۔ موت غریبوں کے گھروں میں آگئی۔ پہلے روز ایک آدمی مر گیا اور رونے والوں نے رو رو کر آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ پھر لوگ مرنے لگے۔ آنکھوں میں آنسو خشک ہو گئے۔ آوازیں حلق میں جم گئیں۔ حادثۂ مرگ روزمرہ کا ایک واقعہ بن گیا۔ امّی نے مجھے کوٹھے پر جانے سے روک دیا۔ چوبارے کے دروازے پر قفل لگ گیا۔ میں دیکھ رہا تھا گھر کا ہر فرد سہما ہوا ہے۔ کہیں چھُپ جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بڑی طرح خوفزدہ ہے کہ وہ سایہ جو اپنے دامن میں چھوٹے بڑوں، مردوں، عورتوں کو سمیٹ رہا ہے۔ کہیں ادھر نہ آ جائے۔ ہر روز محلے کی کوئی نہ کوئی عورت بتا جاتی تھی کہ کشٹری کے کئی گھر خالی ہو چکے ہیں۔ مرنے والوں کے نام لیے جاتے اور آخر میں یہ سوال ضرور کیا جاتا ہے۔ "وبا رُک گئی؟" جواب سُننے کے لیے سب کے سانس رُک جاتے۔ سب کے چہرے اُتر جاتے۔ "نہیں۔"

یہ جواب سُن کر ہر شخص کانپ جاتا۔ امّی جلدی جلدی وضو کرتیں اور مصلّے پر جا بیٹھتیں۔ ابّا باہر چلے جاتے۔ بہنیں ایک ہی چارپائی پر جمع ہو جاتیں۔ رات کو جلدی جلدی کھانا کھا لیا جاتا۔ سب بستروں میں گھُس جاتے۔ امّی دُعا کرتے کرتے ذرا بلند آواز سے "اللہ جی" کہتیں تو سب کے سب ڈر کر اپنی اپنی چارپائیوں پر اُٹھ کر بیٹھ جاتے۔ دل بُری طرح دھڑکنے لگتے مگر کوئی بھی نہ پوچھتا "کیا ہوا؟" ساری رات دیا جلتا رہتا۔ کیونکہ اندھیرے میں ڈر لگتا تھا۔ ہر گھر کا دروازہ سرِ شام ہی بند ہو جاتا تھا۔ کئی گھروں سے بار بار اذان کی آواز آتی تھی۔ یہ آواز بڑی خوفناک لگتی تھی۔ یہ آواز اعلان کرتی تھی کہ موت آگئی ہے

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

سی وقت بھی کسی لمحے بھی کسی نہ کسی گھر پہ آ سکتی ہے۔ میں الماری میں سے کتابیں نکالنے
کوشش کرتا تو امی دیکھ کر کہتیں۔
"کہاں چلے؟"
"کہیں نہیں جا رہا۔"
امی کو یہ خدشہ رہتا تھا کہ میں اُوپر نہ چلا جاؤں۔ حالانکہ انہوں نے چوبارے کے دروازے
قفل کر رکھا تھا۔ گویا موت کو آنا ہے تو دروازے کے راستے ہی اندر آئے گی۔ اُس
میں نے ٹرنک کھولنے کی کوئی شعوری کوشش نہیں کی تھی۔ ٹرنک کھل گیا تو میں نے
رادی طور پر کپڑے اور کتابیں ہٹا کر لپٹا ہوا اخبار نکالا۔ اسے الگ کیا تو گڑیا میرے
میں تھی۔ وہ مُسکرا رہی تھی اور میرے دل میں اس نیلم پری کا خیال اس طرح جاگ اُٹھا
باقی سارے خیال اس کی لپیٹ میں آگئے۔ نیلم پری کا کیا حال ہوگا۔ اس کی ساس، اس
شوہر، یہ لوگ کیا کر رہے ہوں گے۔ کیا وہ اب بھی مسکرا رہی ہوگی؟ میرے دل میں یہ
ہش بیدار ہوگئی کہ اسی وقت وہاں جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھوں کہ وہاں کیا ہو رہا
ہے۔ مگر چوبارے کا دروازہ تو بند تھا۔ امی مجھے چابی دینے پر ایک لمحے کے لیے بھی
رنہیں تھیں۔
خواہش شدید سے شدید تر ہوگئی۔ میں سیڑھیاں طے کر کے اُوپر چلا گیا۔ ارد گرد سناٹا تھا۔
لگتا تھا کہ میں اپنے کوٹھے پر نہیں آیا، کسی ویرانے میں پہنچ گیا ہوں۔ چوبارے میں
سے گزر کر دوسری جانب جانا مشکل تھا۔ میں نے ایک چارپائی چوبارے کی دیوار سے
لگائی۔ اس پر چڑھ کر اُوپر چلا گیا۔ دوسری طرف نیچے جانا کوئی دقت طلب مسئلہ نہیں
تھا۔ ملحقہ مکان کے بنیرے پر پاؤں رکھ کر کوٹھے پہ پہنچ گیا۔ وہاں جا کر ایسی ویرانی کا
احساس ہوا جیسے میں کسی اجنبی مقام پر آگیا ہوں۔ میرے پاؤں تنگ کی طرف اُٹھنے لگے۔
پہلی نظر میں دیکھا کہ دونوں عورتیں چارپائی کے اُوپر جھکی ہوئی ہیں اور چارپائی کے اُوپر کوئی
لیٹا ہوا ہے۔ اچانک نیلم پری کی نظر اُوپر اُٹھی۔ اس نے دو تین بار یوں ہاتھ ہلایا جیسے کہہ رہی
ہو "چلے جاؤ۔" اور میں پیچھے ہٹ گیا۔ واپس جانے لگا۔ چوبارے کے پاس ہی پہنچا تھا کہ

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

چیخ کی آواز آئی اور میرے پاؤں وہیں جم کر رہ گئے۔ اُدھر جاؤں یا لوٹ جاؤں۔ یہ چیخ کس نے ماری تھی۔ نیلم پری نے؟ یقیناً اُسی کی ہے۔ مگر میں اُدھر جا نہیں سکتا۔ اس نے ہاتھ ہلا کر مجھے وہاں جانے سے منع کر دیا تھا۔ یہ دہشت زندگی کی کیفیت تھی کہ کچھ معلوم کرنے کی خواہش کر میں آگے بڑھ نہیں رہا تھا۔ توانائی جواب دے گئی تھی۔ چیخ کے بعد مکمل سناٹا چھا گیا۔ آخر بہت سے کام کر کے میں اپنے کوٹھے پر پہنچ گیا اور پھر نیچے تھوڑی دیر بعد جب میں نے ٹرنک میں سے گڑیا نکال کر دیکھی تو آج اس کے ہونٹ مسکراہٹ سے محروم نظر آرہے تھے۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ اِس کے بعد اُسے ٹرنک میں چھپا دیا۔

کئی دن گزر گئے۔ میرے مکان کے اندر مکان کے باہر اردگرد موت کا سناٹا چھایا رہا۔ پھر یوں ہوا کہ دھیرے دھیرے جیون کا نکھڑا سنورنے لگا۔ اس روز امی نے دلجمعی سے گھر کی صفائی کرتے ہوئے یہ خوشخبری سنائی کہ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے بلا ٹل گئی ہے طاعون کی وبا چلی گئی تھی۔ لیکن چہرے ابھی تک سہمے سہمے سے نظر آتے تھے۔ آنکھوں پر مُردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ جیسے وہ خوفناک سایہ جو کٹھڑی سے باہر نکل کر گیا ہے۔ کہیں قریب ہی رُک گیا ہے۔ واپس بھی آسکتا ہے اور اس تصور ہی سے اُترے ہوئے چہرے اور زرد پڑ جاتے تھے۔

کئی دن اور گزر گئے۔ پھر ہمیں زندگی کا احساس ہوا۔ ہمیں احساس ہوا کہ اوپر سورج چمکتا ہے جس کی روشنی میں گرمی ہے۔ رات چاند طلوع ہوتا ہے جس کی چاندنی میں ایک لطافت اور مٹھاس ہے۔ ہمارے قدموں کے نیچے دھرتی ہے جو ہم سے ہر لمحہ پیار کرتی ہے۔ لوگ ہمارے گھر میں آنے جانے لگے تھے۔ "ا ہم کوٹھڑی میں سے ابھی تک کوئی نہیں آیا تھا۔ اس شام ختے مستری کی بیوی آ گئی۔ گھر کے سب افراد اُس کے اردگرد جمع ہو گئے۔ کہنے لگی:

"طاعون کوٹھڑی میں جھاڑو دے گئی۔ بمشکل صفایا کر گئی۔ ہر گھر میں سے دو تین مر گئے۔"

"مینی بے چارہ بھی مر گیا۔" امی بولیں۔

"سارا کنبہ ہی مر گیا۔ پہلے مینی مرا۔ پھر اُس کی ماں۔ باقی نیلم رہ گئی۔ اس کے مرنے

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

کے دوسرے دن مرگئی۔

"نیلم!؟

یوں لگا جیسے مَیں سانس نہیں لے سکتا۔ مجھ میں سانس لینے کی قوت ہی نہیں۔ تماس کے مرنے پر اکیلی رہ گئی۔ سویرے چل بسی۔ اللہ اللہ خیر صلاّ۔ پُورے کُنبے کا صفایا ہو گیا۔"

مَیں وہاں ٹھہر نہ سکا۔ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اللہ یہ کیا طلسم ہے۔ نیلم پری۔ نیلم۔ وہ کون تھی؟ نیلم، نیلم! مَیں نے ٹرنک کھولا۔ اس میں سے گڑیا نکالی اور ایک گہری سوچ میرے ذہن پر چھا گئی۔ یہ کیا ہے میرے ہاتھ میں۔ وہ کون تھی جو چلی گئی۔ نیلم۔ نیلم اپنے ہی الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے اور پھر تھوڑی دیر بعد مَیں سیڑھیاں طے کر رہا تھا۔ چوبارے کا دروازہ کھُلا تھا اور مَیں نے اپنے کُرتے کے نیچے گڑیا کو چھپا رکھا تھا۔ سائیں سائیں کی سی آواز میرے کانوں میں آ رہی تھی۔ مَیں چلا جا رہا تھا۔ سیڑھیوں سے نیچے اُترا اور میری نظر چارپائی پر جا کر رُک گئی۔ مَیں نے کُرتے کے دامن سے گڑیا کو باہر نکالا اور اسے چارپائی پر لٹا دیا۔ مڑنا چاہتا تھا کہ نگاہ چارپائی پر پڑ گئی۔ اُف میرے خدا۔ وہ لیٹی ہوئی تھی۔ وہ نیلم۔ وہی مسکراہٹ اس کے چہرے پر۔ مَیں بھاگنے لگا۔ اور اپنے مکان کی سیڑھیوں پر سے گرتے گرتے بچا۔ کیا وہ میرا اپنا واہمہ تھا۔ میرا اپنا ہی تصوّر تھا؟ اس کے بعد مَیں کمرے سے کبھی نہ جھانک سکا۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

کاکا چڑیمار

وہ آغازِ بہار کی ایک رات تھی۔ دو بجنے میں کچھ منٹ باقی تھے کہ بارش شروع ہو گئی
اور صبح سات بجے تک جاری رہی۔ بہار کے موسم میں سردی کافی حد تک کم ہو جاتی ہے۔
فضا بڑی خوشگوار ہو جاتی ہے۔ مگر اس صبح رات بارش ہونے کی وجہ سے ہوا میں خنکی
آ گئی تھی جس سے سردی کا سماں پیدا ہو گیا تھا۔ ایسے میں کاکا چڑی مار تحصیل بازار میں سے
نکل کر اس گلی میں گامزن ہو گیا تھا جو کئی گوشے اور زاویے بناتی ہوئی چوک دیوی دتا سے
جا ملتی ہے۔

کاکا چڑی مار کو لاہور شہر کے اس حصے میں جسے اندرون بھاٹی گیٹ کہتے ہیں غالباً
طویل ترین آدمی سمجھا جاتا تھا۔ وہ زیادہ طویل اِس بنا پر بھی دکھائی دیتا تھا کہ بڑا دبلا پتلا اور
نحیف و نزار نظر آتا تھا۔ وہ لوگ جو اُسے خوب جانتے تھے اُس میں کسی قسم کی عجوبگی نہیں
پاتے تھے مگر جو لوگ بالخصوص بچے جب اُسے پہلی بار دیکھتے تھے تو ایک دم ٹھٹھک کر
رہ جاتے تھے اور جس وقت انہیں معلوم ہوتا تھا کہ اس کا نام کاکا چڑی مار ہے تو اُن کی
حیرت اور بڑھ جاتی تھی۔

وہ کاکا چڑی مار اس بنا پر کہلاتا تھا کہ اُس زمانے میں جب وہ بچہ تھا۔ چڑیوں کا
شکار بڑے شوق سے کرتا تھا۔ شکار کے لیے وہ خود ساختہ غلیل استعمال کرتا تھا۔ یہ الگ
بات ہے کہ اُس کی غلیل سے کبھی کوئی چڑیا مری نہیں تھی۔ کہنے والے کہتے تھے کہ وہ

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

دریا کو مارنا نہیں چاہتا صرف ڈرانا چاہتا ہے۔ معاملہ کچھ بھی ہو وہ چڑی مار بن گیا اور چونکہ کاکا پہلے سے کہلاتا تھا اسے کاکا چڑی مار بننے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔

کاکا چڑی مار نے اپنی زندگی میں صرف دو کام سیکھے تھے۔ وہ مچھلیاں پکڑنے کا سامان سستے داموں خرید لیتا تھا اور نفع کما کر بیچ ڈالتا تھا۔ پھٹے پرانے جال کی مرمت کرنا خوب جانتا تھا۔ ڈوری بنانے میں بھی اچھا خاصا ماہر ہو گیا تھا اور کنڈیاں تو اس کے پاس ہر قسم کی اور ہر سائز کی موجود رہتی تھیں۔ ضرورت مند آدمی سب سے پہلے اسی کی طرف آتا تھا اور کاکا ہر ضرورت مند کی ضرورت پوری کر دیتا تھا۔ یہ تو تھا اس کا ذریعۂ معاش۔ اس کی ایک "ہابی" بھی تھی اور وہ تھی مچھلیاں پکڑنا۔ ہر روز صبح سویرے دریائے راوی کے کنارے بارہ دری کے عین سامنے اپنی خاص جگہ پر جا کر بیٹھ جاتا تھا اور آٹھ ساڑھے آٹھ بجے تک قسمت آزمائی میں مصروف رہتا تھا۔ کبھی تو اس کی ٹوکری کئی چھوٹی بڑی مچھلیوں سے بھر جاتی تھی اور کبھی اس میں ایک بالشت بھر کی مچھلی بھی نہیں ہوتی تھی۔ رہو اور ھگے وہ اپنے گھر کے لیے محفوظ رکھتا تھا اور بڑی مچھلی وہ کسی نہ کسی ہمسائے کے ہاں بھجوا دیتا تھا۔ بڑی مچھلی دیکھنے میں جتنی خوبصورت ہوتی ہے اتنے ہی اس میں کانٹے ہوتے ہیں۔

کاکا چڑی مار نے پانچ پانچ، آٹھ آٹھ سیر کی مچھلی بھی پکڑی تھی لیکن اس کے دل کی گہرائیوں میں ہمیشہ سے یہ خواہش پرورش پا رہی تھی کہ کاش کسی دن وہ اپنی ڈوری کنڈی سے کوئی "مال شیر" بھی پکڑ کر لائے۔ ماہی گیروں کا عام خیال ہے کہ ایک دریا میں وہ بڑی مچھلیاں پچیس تیس سیر وزنی جسے وہ اپنی اصطلاح میں مال شیر کہتے ہیں تعداد میں چھ سات سے زیادہ نہیں ہوتیں اور چونکہ سال خوردہ اور تجربہ کار ہوتی ہیں، اوّل تو ڈوری کے قریب تک نہیں جاتیں اگر وہ کنڈی کو منہ میں لے بھی لیں تو اسے کارگر نہیں ہونے دیتیں اور عام ڈوری تو انھیں کھینچ ہی نہیں سکتی۔ ٹوٹ جاتی ہے۔

اس صبح کاکا کی یہ پرانی آرزو پوری ہو گئی تھی۔ کس طرح پوری ہوئی تھی اس بات پر وہ خود حیران تھا۔ مچھلی زیادہ وزنی نہیں تھی مگر عام مچھلیوں سے کافی بڑی تھی اور یہ کافی بڑی مچھلی اس صبح کو اس کے دائیں شانے سے لگی ہوئی تھی جسے اس نے دونوں ہاتھوں

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

سے تھام رکھا تھا اور اس کی ٹوکری اس کے گلے میں لٹک رہی تھی۔ اس ٹوکری میں کوئی مچھلی نہیں تھی۔ دو قسم کی ڈوریاں، ایک ڈبی میں کئی کنڈیاں اور دوسری ڈبی میں گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کیچوے اور گندھا ہوا آٹا تھا۔ گوشت کے ٹکڑے کیچوے اور یہ آٹا اب بیکار ہو گیا تھا۔ ماں شیر پکڑنے کے بعد ڈوری کو دریا میں ڈالنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی تھی مگر وہ ان چیزوں کو واپس لے آیا تھا۔

کاکا پہاس سے اوپر ہو چکا تھا اور اس صبح وہ جوانوں کی سی چال چل رہا تھا۔ وہ جلد از جلد گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اُسے فکر تھا کہ اس کے جاننے والوں میں سے کسی نے ماں شیر کو دیکھ لیا تو وہ اس کے ساتھ چلنے لگے گا اور اسے دیکھ کر اور لوگ بھی آ جائیں گے اور مفت میں ماں شیر کے حصہ دار بن جائیں گے۔ وہ اس سوچ میں گم تھا کہ اس کے نتھنوں میں بدبو کا بھبکا داخل ہو گیا۔ اسی لمحے صدر دین موچی کی صورت اس کے سامنے آ گئی جو صبح سویرے دکان کھول کر اُس میں بیٹھ جاتا تھا اور کام کرنے لگتا تھا۔

اس نے دائیں طرف دیکھا۔ اس کا پرانا دوست اور ہمسایہ دکان کے اندر اپنی چمڑے کی گدی پر بیٹھا چمڑے کے ایک ٹیڑھے میڑھے ٹکڑے کو پانی سے بھرے ہوئے مٹی کے پیالے میں ڈال رہا تھا۔

"صدرے! او صدرے!" کاکا کی آواز صدر دین کے کانوں سے جا ٹکرائی۔

"کاکا یار کمال کر دیا ہے تو نے!" کاکا کو داد مل رہی تھی۔

"کھاؤ گے ساری کی ساری۔"

"دکھ دو تھڑے پر۔"

کاکا نے قہقہہ مارا اور آگے جانے لگا۔ چند قدموں کے بعد اپنی کٹڑی کے تھڑے پر پہنچ گیا۔ تھڑے کی سیڑھیاں طے کر کے وہ اس کمرے میں آ گیا جس کے ایک جانب اُوپر کی منزل کو سیڑھیاں جاتی تھیں اور سامنے کٹڑی کے اندر جانے کے لیے دروازہ کھلا تھا۔ یہ کمرہ کٹڑی میں رہنے والوں کے لیے ڈیوڑھی کا کام دیتا تھا۔ ڈیوڑھی سے نکل کر کاکا دائیں دروازے میں داخل ہوا۔ گویا وہ اپنے گھر میں پہنچ گیا تھا۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

اُس کا گھر دو کمروں پر مشتمل تھا۔ پہلا کمرہ دوسرے کمرے کی نسبت کشادہ تھا۔ اس کمرے
ں گھر کا سارا کام کاج ہوتا تھا۔ کاکا اور اس کی بیوی سردیوں میں سونے بھی یہیں تھے۔ دوسرے
رے میں ان کا بیٹا رات گزارتا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے رات کا کچھ حصہ گزارتا تھا۔

کاکا کے گھر کے آگے کشٹری میں رہنے والوں کے لیے مشترکہ صحن تھا۔ یہاں کاکا کی
لنگا چارپائی ہر وقت بچھی رہتی تھی۔ کاکا اس چارپائی پر شام کا وقت حقہ پی کر اور صدر دین اور
سرے دوستوں سے گپ شپ لڑا کا گزارتا تھا۔

کاکا ایک منٹ اندر رہا۔ "داراں" کہہ کر اُس نے بیوی کو آواز دی اور پھر باہر صحن میں
یا۔ داراں پیڑھی پر بیٹھی اپنے پھٹے ہوئے دوپٹے کو سی رہی تھی۔ اُس کی انگلیاں بہت
ستہ آہستہ حرکت کرتی تھیں کیونکہ بائیں آنکھ سے اُسے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا اور دائیں
کھ میں بھی ایک پھپھولا تھا مگر اس سے کچھ نہ کچھ نظر آجاتا تھا۔

شوہر نے اُسے پکارا تو اس کی انگلیاں رک گئیں۔

"کچھ لائے ہو؟"

داراں کو صرف اس بات سے دلچسپی تھی کہ اسے بازار سے ترکاری نہ منگوانی پڑے اور
س کا شوہر گھر میں پکانے کے لیے مچھلی لے آئے۔

کاکا آج بہت اچھے موڈ میں تھا۔ بولا "داراں! یہ دیکھ مگر مچھ۔"

داراں شوہر کے اس طرح مذاق کرنے پر پریشان ہو جاتی تھی اور جواب میں مرجھائی
پنی بے شرمی سے باز نہ آنا" کہہ کر خاموش ہو جاتی تھی۔

کاکا باہر آگیا اور ماں شیرا اس نے چارپائی کے اوپر بچھا دیا۔

سب سے پہلے داراں نے اسے اپنی انگلیوں سے مس کیا۔ جیسے جیسے اُس کی انگلیاں
گے بڑھتی جاتی تھیں حیرت سے اس کی پھپھولے والی آنکھ پھیلتی جا رہی تھی۔

"ماں شیر ہے ماں شیر" کاکا بلند آواز میں بولا۔

یہ خبر آن کی آن میں ہر جگہ پھیل گئی کہ کاکا چڑی مار نے ماں شیر کو مارا ہے۔ لوگ
شٹری کی طرف آنے لگے ان میں بیشتر تعداد لڑکوں کی تھی جو "ماں شیر مارا ہے" جھنک

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

دیکھنے کے لیے بیتاب تھے۔ دس بجے تک کنڈی کا صحن کاکا چوہدری اور کے ماں شیری کی نمائش گاہ بنا رہا۔

لڑکے بار بار اپنا ہاتھ مچھلی کے جسم پر رکھ دیتے تھے۔ اور کاکا انہیں جھڑک دیتا تھا۔ وہ اپنی کامیابی پر بہت خوش تھا مگر دس بجے کے قریب اس کے چہرے پر افسردگی سی چھا گئی۔ اس نے اندر جا کر دیکھا کہ طفیل اپنے کمرے میں ہے یا نہیں۔ وہ نہیں تھا۔ وہ اپنے لڑکے کی آوارگی کے ہاتھوں کبھی کبھی بہت پریشان ہو جاتا تھا۔ اس نے طفیل کو بھاٹی دروازے کے اندر ایک درزی کی دکان پر بٹھا رکھا تھا مگر طفیل دکان پر بیٹھتا بہت کم تھا۔ ادھر ادھر آوارہ لڑکوں کے ساتھ گھومتا پھرتا رہتا تھا اور جب رات کے دو تین بجے گھر آتا تھا تو صبح دس گیارہ بجے تک سوتا رہتا تھا۔

کاکا لڑکوں کی مدد سے مچھلی اندر لے آیا اور اسے لکڑی کی میز پر ڈھیر کر دیا۔ جستو دھوبی کے بیٹے رونو نے کہا اگر شریف قصائی سے چھری لے آتے اور جب چھری آ گئی تو ماں شیری کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔

جب سب ٹکڑے تین دیگچیوں اور دو پراتوں کے اندر سما گئے تو کاکا لڑکوں سے مخاطب ہو کر بولا:

"کھیل ختم پیسہ ہضم۔" اس پر لڑکوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور وہیں کے وہیں جمے رہے۔ کسی نے بھی جانے کا نام نہ لیا۔

"میں نے کہا" داراں شہر کو اسی طرح مخاطب کیا کرتی تھی۔

"کہو بھری سرکار!" اس پر داراں تو جھینپ گئی اور لڑکے ہنس پڑے۔

"گھروں میں بھیج دو۔"

داراں نے ٹھیک ہی تو کہا تھا۔ لڑکوں سے مدد لے کر گھر گھر مچھلی پہنچائی جا سکتی تھی۔ کاکا نے مچھلی کا سب سے بڑا ٹکڑا جو دو سیر سے کم نہیں تھا۔ مرچ مسالہ لگا کر تھالی پر ڈال کر طفیل کے کمرے میں رکھ دیا کہ رات اس کے اپنے ہاں پکے گا اور باقی ٹکڑے اپنے دوستوں کے ہاں بھجوا دیئے۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا تھا۔ داراں نے صبح جو ماش کی دال پکائی تھی چولہا جلا کر اُسے گرم کیا۔ کاکا تندور سے پانچ روٹیاں خرید لایا۔ دو روٹیاں اور دال طفیل کے لیے رکھ دی گئی۔ دو روٹیاں کاکا نے کھائیں اور ایک داراں نے۔ کھانے پینے سے فارغ ہو کر کاکا صمدین کی دکان پر چلا گیا اور داراں کمر سیدھی کرنے کے لیے چارپائی پر لیٹ گئی۔ روٹی کھانے کے بعد وہ اونگھنے لگتی تھی۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی۔ پانچ بجے رات کے کھانے کا انتظام شروع ہو جاتا تھا اور آٹھ بجے چارپائی پر سو جانا اس کا روزمرہ کا معمول تھا۔

کالے بادل پھر آسمان پر چھا گئے تھے اور گھروں کے اندر اندھیرا ہو گیا تھا جن لوگوں کو کام کرنا تھا انہوں نے گھروں میں روشنی کا اہتمام کر لیا تھا۔ داراں کو بھلا کیا ضرورت تھی کہ گھر کے اندر روشنی کرے۔ وہ خراٹے لیتی رہی۔

اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اُسے پاؤں کی آہٹ سنائی دی تھی۔

"طفیل!"

کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے دوبارہ پکارا اور پھر یہ سوچ کر کہ طفیل نہیں آیا۔ خراٹے لینے لگی۔

"داراں!" کاکا اندر آ کر گرجا۔

داراں گہری نیند سو رہی تھی۔ آواز سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔

"کسی کو سونے بھی دو گے"، وہ بڑبڑائی۔

"شام تک سوتی رہے گی کانیے" وہ کانی تو یقیناً تھی مگر جب اس کا شوہر اُسے کانی کہہ کر پکارتا تھا تو غصے سے اس کا بُرا حال ہو جاتا تھا۔

ایسے موقع پر وہ اسے بانس ہونے کا طعنہ دیا کرتی تھی مگر اس دن وہ خاموش رہی۔

"ہانڈی پکانے گی کہ نہیں؟"

"سن لیا ہے۔ اب چپ کر۔" اور وہ اُٹھ بیٹھی۔ طفیل کے کمرے میں گئی کہ پچھلی دال تھالی لے آئے۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

"ہائے ربا۔"

"سانپ نے کاٹ لیا ہے۔" کاکا تیزی سے اُدھر گیا۔ چارپائی پر خالی تھالی پڑی تھی۔ مچھلی کا ٹکڑا غائب ہو گیا تھا۔

آخر مچھلی گئی کہاں؟ یہ بات کاکا اور داراں کے لیے ایک بہت بڑا مسئلہ بن گئی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ جب وہ سو رہی تھی تو کوئی لڑکا اندر آ کر مچھلی لے گیا ہوگا۔ اس کے سوا مچھلی کے غائب ہونے کی وجہ کیا تھی؟ داراں کہتی تھی کہ سارے کے سارے لڑکے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے اور اس سے پہلے طفیل کے گھر سے بھی کوئی چیز گم نہیں ہوئی تھی۔

"کیا طفیل آیا تھا؟"

"جانے میری جُوتی۔" داراں منہ پھُلا کر ایک طرف بیٹھ گئی۔ کاکا کچھ دیر بولتا رہا اور پھر چلا گیا۔

کاکا کے جانے کے بعد مولا حلوائی کی بہن تاباں آ گئی، تاباں داراں کی بڑی پُرانی سہیلی تھی۔ دونوں نے ایک سال تک چھوٹی مسجد کے مولوی صاحب سے قرآن مجید پڑھا تھا۔ دونوں کو ایک دوسری کی فکر رہتی تھی۔ تاباں نے جو اپنی سہیلی کو فکر مند پایا تو پریشانی کی وجہ پوچھنے لگی۔ داراں نے سارا قصہ سُنا دیا۔

"داراں!" تاباں نے اپنا چہرہ یوں بنا لیا جیسے کوئی بڑی اہم بات کہنے والی ہے۔ داراں جو بولنے والے کی آواز کے زیر و بم سے اس کے چہرے کی کیفیت کا اندازہ لگایا کرتی تھی کہنے لگی:

"تاباں! کسی کے پُتر پر الزام نہ لگانا۔ کوئی لڑکا مچھلی نہیں لے گیا۔"

تاباں ہنس پڑی۔

"میں جانتی ہوں وہ کس ہانڈی میں پک رہی ہے اور کون اُسے لے گیا ہے۔"

"تُو جانتی ہے تو کہتی کیوں نہیں؟"

"بھجوں گی نہیں۔"

"کیوں نہیں بھجے گی!"

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"بس میری مرضی۔ نی داراں! گراں والیئے! ایسے بھید چھپے نہیں رہ سکتے!"
داراں نے اندازہ لگا لیا کہ تاباں جارہی ہے۔ وہ اسے بلاتی رہی۔ اُسے "بارہویں والے پیر کی قسم دی مگر تاباں نے ایک منٹ توقف کرنا بھی مناسب نہ سمجھا۔ داراں کی بات، سُنی اَن سُنی کر کے چلی گئی۔

داراں اور کاکا کو اس بات پر افسوس ضرور تھا کہ وہ رات کو روٹی کے ساتھ پکوڑے کھا رہے تھے اور ان کے حصے کی مچھلی نہ جانے کس ہانڈی میں پک پکا گئی تھی۔ لیکن اصل غصہ انہیں اس چیز پر تھا کہ تاباں نے بھید نہیں بتایا تھا اور انہیں پریشان کر کے چلی گئی تھی۔

O

یہ زمانہ اس تحریک کے حوالے سے تاریخ ہند میں زندہ ہے جسے نمک سازی" کی تحریک کہتے ہیں۔ اس زمانے میں مہاتما گاندھی نے نمک کی اجارہ داری کے خلاف احتجاج کیا تھا اور خود نمک بنایا تھا۔ سیاسی فضا جو پہلے ہی کافی گرم تھی اب اس میں خاص قسم کی گہما گہمی پیدا ہو گئی تھی۔ موری دروازے کے باہر کانگریس کے آئے دن جلسے ہوتے رہتے تھے جن میں بڑی جوش انگیز اور باغیانہ تقریریں ہوتی تھیں۔ انہی جلسوں میں بڑی ولولہ انگیز نظمیں بھی پڑھی جاتی تھیں اس زمانے میں یہ شعر بڑا مشہور ہو گیا تھا ؎

شہیدوں کے مزاروں پہ لگیں گے ہر برس میلے
وطن پہ مٹنے والوں کا یہی باقی نشاں ہو گا

طفیل جب آوارہ گردی کرنے کے بعد تھک ٹوٹ کر گھر آتا تھا تو نیند آنے سے پہلے یہی شعر گایا کرتا تھا۔ مگر اس روز آدھی رات کو اپنے کمرے میں گیا تو داراں کچھ اور ہی سُننے لگی۔ طفیل گا رہا تھا ؎

پلا مار کے بجھا گئی دیوا تے اکھ نال گل کر گئی جھّی
چھٹی رن گئی بھرے نول گئی

داراں کو یہ آواز اپنے بیٹے کی نہیں کسی اجنبی کی آواز لگی۔ یہ کون ہے اس نے دل

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

سے سوال کیا۔ اور وہ چارپائی پر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

یہ طفیل ہے — طفیل ہی تو ہے اور کون ہو سکتا ہے۔ وہی بیٹھی بیٹھی آواز جو ذرا بلند ہوتی تھی تو چیخ سی بن جاتی تھی۔

یہ آج اُسے کیا ہو گیا ہے۔ اس کا باپ سُنے گا تو کیا کہے گا اور وہ طفیل کا نام لیے بغیر بولی۔ "وے بے شرماں۔ وے بے شرماں۔"

"بے بے تُو جاگ رہی ہے؟"

"کیا مراثیوں کی طرح گا رہا ہے؟"

"اچھا بے بے"— طفیل خاموش ہو گیا۔

داراں رات کو دیر تک نہ سو سکی۔ وہ سوچنے لگی۔ اس دن ماں شیر کا ٹکڑا کون لے گیا تھا۔ اور یہ طفیل آج ایسا بے شرمی کا گیت کیوں گا رہا ہے۔ دونوں باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں اور اس کی ذہنی کشمکش تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

صبح ایک اور بات بھی اُس کی سمجھ میں نہ آ سکی۔ طفیل دن کے دس بجے سے پہلے چارپائی چھوڑتا ہی نہیں تھا مگر اس صبح وہ سورج نکلنے سے پہلے ہی صابن اور تولیا لے کر باہر جانے لگا۔

"کہاں جا رہا ہے طفیل؟"

"چھوٹی مسجد — نہانے کے لیے۔"

"اللہ اسے کیا سوجھی ہے۔ طفیل اور اتنی سویرے مسجد میں جا کر نہائے۔"

وہ نہا کر آیا تو کنگھی شیشہ لے کر بال سنوارنے لگا۔ اس وقت تاباں آگئی۔ اس کے ہاتھ میں تربوز کی ایک قاش تھی جسے وہ داراں کے لیے لائی تھی۔ طفیل نے قاش دیکھی تو اس پر جھپٹ پڑا۔

"چاچی! تو بڑی اچھی ہے۔"

"تیرے لیے نہیں۔ میری بہن کے لیے ہے۔" تاباں کہتی رہ گئی مگر طفیل نے دیکھتے ہی دیکھتے گودا کھا کر چھلکا دروازے کے باہر پھینک دیا جو اس کے باپ کی جھلنگا چارپائی کی پائنتی جا پڑا۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

تاباں نے طفیل کو مسکرا کر دیکھا۔

"اچھا ـــ سمجھ گئی۔ شاباش! عیش کر بیٹے عیش کر۔"

طفیل نے زور سے قہقہہ لگایا۔ تیشے کو ٹرنک کے اُوپر رکھا اور جانے لگا۔

"کہاں دفع دفان ہونے لگا ہے؟"

داراں نے اُس کے جاتے ہوئے سائے کو دیکھا۔

"دکان پر" طفیل نے جواب دیا۔

"اس دکان پر جہاں ہیرے بکتے ہیں"۔ تاباں ہنس کر بولی۔

داراں کی آنکھیں جلدی جلدی بند ہوتی اور کھلتی رہیں۔

تاباں دو تین منٹ کھڑی رہی پھر جانے لگی اور دروازے پر رُک کر بولی: "داراں! کہے [illegible] ہوں۔ سوچ سمجھ لے۔ کہیں تیرے دروازے پر پولیس نہ آ جائے۔"

تاباں یہ فقرہ کہہ کر چلی گئی۔

داراں کو معلوم ہی نہ ہو سکا کہ کاکا کب اندر آیا، کب اس نے چلم میں آگ ڈالی اور کب [illegible]ے کر چولہے کے پاس چوکی پر بیٹھ گیا۔ وہ ایک پُرانا لحاف لے آئی تھی اور اسے ایک [illegible] پرانی چٹائی کے اُوپر پھیلا کر قینچی سے دھاگہ کاٹ کاٹ کر اس میں سے بوسیدہ رُوئی [illegible] رہی تھی۔

"تاباں آئی تھی؟" کاکا بولا۔

داراں کی اُنگلیاں حرکت کر رہی تھیں اور وہ اپنی ایک آنکھ سے سامنے دیوار کو دیکھنے [illegible]وشش کر رہی تھی۔ اس دیوار کے پیچھے طفیل کی خالی چارپائی پڑی تھی۔

"مَیں نے کہا تاباں آئی تھی؟"

"ہوں"

"کیا کہا تھا اُس نے؟"

کہتی تھی ہمارے گھر پولیس آئے گی۔"

"کیوں آئے گی۔ ہم نے تاباں کے گھر چوری کی ہے؟"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

داراں اس کا کیا جواب دیتی۔ آہ بھر کر اپنا کام کرتی رہی۔

گھر میں خاموشی طاری ہوگئی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کاکا کی کھانسی اس خاموشی کو چند لمحوں کے لیے مجروح کر دیتی تھی اس کے بعد پھر سکون چھا جاتا تھا۔ اس خاموشی اور سکون میں دو دلوں کے اندر اضطراب کی طوفانی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ مگر دونوں ان لہروں کو دبانے کی کوشش کر رہے تھے۔

رات کا اندھیرا چھا گیا۔ دونوں اپنے اپنے خیالوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ شمس دین کی دکان سے ایک لڑکا کاکا کو بلانے کے لیے آیا مگر وہ نہ گیا۔ اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔ داراں لحاف کو تہ کر کے ٹرنک کے اوپر رکھ چکی تھی۔ جو روئی اس نے لحاف میں سے نکالی تھی اسے اس نے اپنی ایک پھٹی ہوئی قمیص میں محفوظ کر لیا تھا اور اب یہ گٹھڑی اس کے سامنے پڑی تھی اور اس پر اس نے اپنا دایاں ہاتھ رکھا ہوا تھا۔

"کیا آج داراں لالٹین نہیں جلائے گی؟" کاکا سوچنے لگا۔ اس نے چاہا کہ بیوی کو آواز دے لیکن آواز اس کے ہونٹوں سے نہ نکلی۔ رات بیت رہی تھی۔ میاں بیوی اپنی اپنی چارپائی پر کروٹیں لے رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے کوئی لفظ بھی کہنا نہیں چاہتے تھے شاید انہوں نے سوچ لیا تھا کہ بات کر کے ایک دوسرے کو پریشان نہیں کریں گے۔

یکایک داراں نے اندھیرے میں پاؤں کی آہٹ سنی۔

"توبہ۔ حقہ پینا رات کو بھی نہیں چھوڑتا۔" داراں نے زیر لب کہا۔ وہ دل میں کہہ رہی تھی۔ اب کاکا حقے کے پاس گیا ہے۔ اب اس نے ہانڈی میں سے جلتے ہوئے کوئلے نکال کر انہیں چولھے کے اندر ڈالا ہے۔ اس پر رسیوں کا ایک گچھا رکھا ہے۔ اب تیل والے کنستر سے اس نے ماچس اٹھائی ہے۔ تیلی جلائی ہے۔ اور اب ـــــ ایسے ہی تیز جھونکا دروازے سے ٹکرائی اور معاً داراں کو تایاں کا فقرہ یاد آ گیا "تیرے دروازے پر پولیس نہ آ جائے۔"

وہ اتنی بے تاب ہوگئی کہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"میں نے کہا۔"

"طفیل کا ابا ہے؟"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"اور کون ہے --- میں نے کہا --- ہمارے گھر پولیس کیوں آئے گی؟"

"تاباں سے پوچھو۔"

"میں کیوں تاباں سے پوچھوں۔ میں نے کوئی چوری کی ہے۔ کسی کے گھر ڈاکہ ڈالا ہے۔ میں اس کے منہ پر تھوکتا بھی نہیں ---" مگر وہ صبح ہی صبح تاباں کے گھر پہنچ گیا۔

داراں کو یہ بات اس وقت معلوم ہو گئی جب کاکا کا پہلا قدم تاباں کی دہلیز پر پڑا، کیونکہ داراں نے اپنا جو جاسوس لڑکا اس کے پیچھے چھوڑا تھا۔ اس نے بھاگ کر بتا دیا تھا کہ کاکا تاباں کے گھر کی طرف جا رہا ہے۔

چلو ٹھیک ہے۔ کاکا گھر آ کر سب کچھ بتا دے گا۔

کاکا تھوڑی دیر بعد گھر آ گیا اور آتے ہی اس طرف قدم اٹھانے لگا جہاں کپڑوں کے ٹرنک ایک دوسرے کے اوپر پڑے تھے۔ اس نے ٹرنکوں کے پیچھے دیوار کے ساتھ لگی ہوئی لاٹھی اٹھائی اور اس پر دایاں ہاتھ پھیر کر گویا اس کا گرد وغبار دور کرنے لگا۔ لاٹھی صاف کرنے کے بعد اس نے اس کی لوہے کی نوک زور سے زمین پر ماری۔ داراں جو لسی کے گلاس میں گھیے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ڈال رہی تھی کہ جب نرم ہو جائیں تو انہیں کھائے یہ شور سن کر چونک پڑی۔

"طفیل کے ابا۔"

کاکا دروازے کے پاس پیڑھی کے اوپر بیٹھ گیا تھا۔

"تاباں کے گھر گئے تھے۔"

"گیا تھا۔"

داراں اپنے شوہر کی طرف جانے لگی۔ جیسے ہی اس کی نظر لاٹھی پر پڑی وہ بری طرح گھبرا گئی۔

"طفیل کے اباجی۔"

"اباجی کی بچی! بکتی کیوں نہیں؟"

"وہ کیا کہتی ہے۔"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"کہتی ہے تیرا سر۔ سُنا؟"

"ہائے اللہ۔ مجھ سے کیوں لڑتا ہے۔ میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے؟"

"تیرا لاڈلہ رنڈیوں کے گھر جاتا ہے۔"

"رنڈیوں کے گھر۔ توبہ توبہ۔"

"توبہ توبہ کیا کرتی ہے۔ ایک رنڈی سے اس کا یارانہ ہو گیا ہے۔ آج آئے تو سہی دونوں ٹانگیں توڑ دوں گا۔"

داراں کا غم و غصہ رنڈی کو بددعائیں دینے میں تحلیل ہونے لگا۔ جتنی بددعائیں دے سکتی تھی اس نے دے ڈالیں۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ لاٹھی کے سرے پر رکھ دیا۔ کاکا برس پڑا۔

"اس ماں پر کیوں ہاتھ رکھتی ہے۔ آرام سے بیٹھ جا کر۔"

داراں نے ہاتھ اُٹھا لیا۔

"اللہ کرے مر جائیں جو میرے طفیل پر الزام لگاتے ہیں" اور یہ کہہ کر اس نے لوٹا اُٹھایا بیت الخلا میں جانے کے لیے۔ کاکا اسے دیکھ رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ اس کی بیوی کیا کارروائی کرنے والی ہے۔ اس نے کوئی دخل نہ دیا۔ وہ خود بھی چاہتا تھا کہ داراں یہ کارروائی کرے۔ باہر نکل کر داراں نے لوٹا دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ اور تھڑے سے اُتر کر صدر دین کی دکان پر پہنچ گئی۔

"وے بھرا صدر دے!"

صدر دین چمڑے پر ٹی لگا رہا تھا۔

"کیوں بہن داراں!"

"وے بھرا — وہ ڈرامگ لے کر بیٹھ گیا ہے۔ میرے طفیل کی دونوں ٹانگیں توڑنے کے لیے — اللہ کرے میں مر جاؤں۔ طفیل کے دشمنوں کو کسی کی آئی آئے۔"

"فکر نہ کر داراں! ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ کچھ نہیں ہوگا۔"

"اچھا۔ اللہ تیرا بھلا کرے۔" داراں واپس جانے لگی۔ اس نے لوٹا اُٹھایا اور دروازے کے اندر پہنچ گئی۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

دن گزر گیا اور طفیل نے اپنی شکل نہ دکھائی، رات آدھی ہو گئی اور دروازے پر دستک نہ ہوئی۔ داراں زور زور سے رونے لگی تو کاکا چارپائی سے اُٹھ بیٹھا:

"چپ کرتی ہے کہ نہیں۔ سر پھوڑ دوں گا۔" اس نے لاٹھی فضا میں بلند کر دی۔

"مار دے ——— دیکھتا کیا ہے ——— مار دے ——— مار ناں۔" داراں روتی جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی۔

"کمینی! لوگوں کو تماشا دکھاتی ہے۔"

"میں کیا تماشا دکھاؤں گی۔ تماشا تو تُو دکھاتا ہے۔ ڈانگ لے کر بیٹھ گیا ہے۔"

"تیرا پُتر رنڈی کے گھر جائے اور میں اس کو گلے سے لگاؤں۔ یہ چاہتی ہے تُو؟"

قریب تھا کہ معاملہ بڑھ جائے اُس وقت منشی رمضان علی دوسرا شو دیکھ کر گھر لوٹ رہا تھا۔ اس نے جو داراں کی آواز سُنی تو اپنے گھر جانے کی بجائے کنڈی کے تھڑے پر چڑھ گیا اور صحن میں آ گیا۔

"چاچی! کیا ہے؟"

کاکا آواز پہچان کر بولا۔

"رمضان یار! اندر آ جا۔ اِس سور کی بچی کو سمجھا۔"

منشی رمضان علی اندر آ گیا۔

"بات کیا ہے۔ طفیل کی تو نہیں، بڑا نالائق نکلا ہے۔ نہ ماں باپ کی عزت کا خیال اپنی آبرو کی فکر۔"

"میں کہتا ہوں۔ آ جائے ایک بار ٹانگیں توڑ ———"

کاکا اپنا فقرہ مکمل نہ کر سکا۔ داراں نے اپنی چھاتی پر دو ہتڑ مارا۔ "ہائے ڈُسے میرے بآ۔

"دیکھا رمضان! کیا کہہ رہی ہے۔"

"چاچی!" رمضان نے داراں کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ "کیوں اپنی جان کی دشمن بنی ہو۔ اللہ اسے ہدایت دے دے گا ایک نہ ایک روز۔"

"رمضان!" کاکا بولا۔ "جو آدمی ایک بار رنڈی کے کوٹھے پر چڑھ گیا وہ نیچے نہیں

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

اُترا۔ مَیں اِسے اُوپر چڑھنے کے قابل ہی نہیں چھوڑوں گا۔"

رمضان دیر تک دونوں کو سمجھاتا رہا۔ اور جب وہ بولتے بولتے تھک گئے اور اپنی اپنی چارپائیوں پر ڈھیر ہو گئے تو رمضان باہر نکل آیا اور اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔

داراں نے گھر کا دروازہ بھیڑ دیا۔ اندر سے کُنڈی نہ لگائی۔ اسے یقین تھا کہ طفیل کسی نہ کسی وقت آجائے گا مگر وہ نہ آیا۔ دوسرا، تیسرا دن بھی بیت گیا۔

تاباں نے داراں کے کان سے ہونٹ لگا کر کہا:

"داراں! وہ رنڈی کو لے گیا ہے۔"

"کون لے گیا ہے؟"

"تیرا طفیل۔ اللہ خیر کرے۔ تو بڑی بدنصیب ہے داراں۔"

کاکا بھی یہ خبر سُن چکا تھا۔

"اب کیا ہو گا طفیل کے ابا؟" داراں نے شوہر سے تسلّی کے لفظ سُننے کے لیے یہ سوال کیا۔

"طفیل مر گیا ہے۔"

داراں کے دل میں جیسے آگ لگ گئی۔

"مریں اس کے دُشمن جو اس پر الزام لگاتے پھرتے ہیں۔ میرا طفیل ایسا نہیں۔"

کاکا کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا۔ "عجیب پاگل عورت ہے۔ اسے اعتبار ہی نہیں آتا کہ اس کا لڑکا رنڈی کے ساتھ بھاگ گیا ہے۔" اس کا جی چاہتا تھا کہ بیوی سے کہے میں تجھے اس رنڈی کے اس گھر میں لے چلوں جہاں سے رنڈی گئی ہے، مگر اس نے ضبط کیا اور خاموش رہا۔

سات روز گزر گئے۔

داراں روز کہتی تھی۔ آج طفیل ضرور آجائے گا۔ اور طفیل نہیں آتا تھا۔

نویں روز اس نے بڑے اہتمام سے پاؤ بھر گوشت میں آدھ سیر چنے کی دال ڈالی۔ ساتھ باسمتی چاول پکائے۔ یہ طفیل کا من بھاتا کھاجا تھا۔ اس نے تاباں سے کہہ رکھا تھا کہ شام کو طفیل ضرور آجائے گا اور وہ بڑے اضطراب سے شام کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے خود چاول کا ایک دانہ بھی حلق سے نیچے نہیں اُتارا تھا۔ شام سے ذرا پہلے چوک میں شور

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

...ا۔ یہ شور اس بنا پر ہوا تھا کہ مہتاب آتش باز کی کیتھی نکل آئی تھی اور اس کے دوست اس سے
...ٹائی مانگ رہے تھے۔ نہ جانے داراں کو کیا سوجھا۔ تیزی سے باہر آگئی۔ صحن سے ڈیوڑھی
...جا رہی تھی کہ اس کے پاؤں کے آگے ڈبل اینٹ آگئی اور وہ ٹھوکر کھا کر تیورا کر گر پڑی۔
...پھٹ گیا اور اس سے لہو کی دھار بہنے لگی۔

کاکا گھر میں تھا نہیں۔ مچھلی منڈی گیا ہوا تھا۔ صدر دین نے اس کے سر پر پٹی باندھ
... مگر لہو تھا کہ رکتا ہی نہیں تھا۔ صدر دین اور دو آدمی اسے چارپائی پر ڈال کر تحصیل بازار
... ڈاکٹر بنیا لال کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر نے مرہم پٹی کر دی اور آٹھ گولیاں دیں کہ آدھ
... گھنٹے بعد کھاتی رہے۔

داراں گھر واپس آئی تو اس کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ کمزوری کی وجہ سے بول
... نہیں سکتی تھی۔ مچھلی منڈی میں کاکا کو اطلاع کر دی گئی۔ وہ بھاگا بھاگا آیا داراں کی حالت
... کی ویسی تھی۔

کاکا آتے ہی اس پر جھک گیا۔

"داراں!" اس نے چیخ کر کہا۔

داراں نے آنکھیں کھول دیں۔

"چاول — دال — طفیل —" ان تینوں لفظوں کے سوا وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی اور
... کے لیے خاموش ہو گئی۔ کاکا نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"ہائے نی میریئے ساری عمر دیئے محرمیں" کاکا نے کہا اور اس کی آنکھیں ٹپ ٹپ
... گراتے یک دم خشک ہو گئیں۔

چاول اور دال۔ دونوں چیزیں دیگچی اور ہانڈی میں پڑی رہیں۔ دوسرے دن دوپہر کو
...دین کی بیوی نے کوٹھے پر جا کر انھیں بنیرے پر ڈال دیا کہ کوے کھا لیں۔ بیوی کے چلے
...نے کے بعد کاکا آہستہ آہستہ سنبھل گیا۔ شروع شروع میں وہ گھنٹوں چپ چاپ چارپائی
...تھے کی نے ہاتھ میں لیے بیٹھا رہتا تھا مگر اس کی یہ کیفیت ایک ماہ کے بعد نہ رہی اور
...روزمرہ کے معمولات میں حصہ لینے لگا۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

طفیل کے بارے میں صرف یہی معلوم ہوا تھا کہ وہ ایک رنڈی خورشید بیگم کے ساتھ کہیں چلا گیا ہے۔ اور اب کیا کر رہا ہے کوئی بھی اس سوال کا جواب نہیں جانتا تھا۔ پندرہ دن گزر گئے۔ ایک دوپہر کاکا کو ایک خط ملا جسے وہ منشی رمضان علی کے پاس لے گیا جو ایک وکیل کے ساتھ کام کرتا تھا۔ رمضان علی نے کاکا کو بتایا کہ یہ خط تیرے بیٹے طفیل نے لکھا ہے اور کہا ہے کہ اُسے بے بے کے مرنے پر بہت دُکھ پہنچا ہے۔ اور اس کا سینہ شق ہو گیا ہے۔

خط کی تحریر کافی لمبی تھی ـــ مگر کاکا نے کاغذ منشی کے ہاتھ سے چھین کر اسے پُرزے پُرزے کر دیا۔

"حرام زادہ میرے لیے مر گیا ہے۔"

داراں کو مرے ہوئے چھ ماہ گزر گئے تھے۔ کاکا نے اپنی بساط سے بڑھ کر اُس کا ختم کروایا اور رونے کی حسرت لے کر چارپائی پر گر پڑا۔ دروازہ بند کرنا بھی بھول گیا۔ صبح اُس کی آنکھ کھلی تو اسے زمانے یہ احساس کیوں ہو گیا کہ آج کچھ ہونے والا ہے بلکہ ہو چکا ہے۔

صحن سے آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ باہر آیا۔ اس کے دروازے کے سامنے بہت سے لوگ جمع تھے اور سب سے آگے چھوٹی مسجد کے مولوی صاحب کھڑے تھے۔

"کاکا! مولوی صاحب دھاڑے۔

"جی مولوی جی!"

"یہ شریفوں کا محلہ ہے۔ یہاں کسی گھر میں کوئی رنڈی نہیں رہ سکتی۔"

کاکا کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی۔ وہ ہونقوں کی طرح مولوی صاحب کو دیکھ رہا تھا۔

"مولوی جی بات کیا ہے؟"

مولوی صاحب گرج پڑے۔

"میں کہتا ہوں یہاں ـــ شریفوں کے اس محلے میں رنڈی نہیں رہ سکتی۔ نکالو گندگی کی اس پوٹلی کو ـــ"

کاکا کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ صدرالدین آگے بڑھا۔

"کاکا! کیوں اپنی بے عزتی کراتا ہے۔ اس رنڈی کو نکال دے اپنے گھر سے۔"

"رنڈھی - کہاں ہے؟" کاکا بولا۔

"کیسا بھولا بنتا ہے ___ مولوی صاحب نے مسکرا کر اور مجمع کو دیکھ کر کہا "سبحان اللہ۔ پروردگار کے رنگ دیکھو" پھر وہ کاکا سے بولے "رات رنڈھی نہیں آئی تیرے گھر میں؟"

کاکا نے نفی میں سر ہلایا۔

"ہٹ جاؤ ایک طرف۔ میں خود جاتا ہوں"۔ مولوی صاحب نے کہا۔

"ٹھہرو مولوی صاحب ___ مجھے کچھ پتا نہیں ___" اور یہ کہہ کر کاکا اندر چلا گیا۔ اس نے دیکھا کہ طفیل والے کمرے کے دروازے پر ایک عورت کھڑی ہے۔ کاکا نے اپنی چارپائی کے نیچے سے لاٹھی نکالی۔

"تو کب آئی ___ اور وہ کہاں ہے حرام زادہ؟"

کاکا لاٹھی لے کر عورت کی طرف بڑھا۔

"نکل میرے گھر سے فاشہ ___ رنڈھی"۔

کاکا کی لاٹھی اوپر اٹھی ___ اور جب تک وہ نیچے آتے عورت اس کی ٹانگوں سے لپٹ چکی تھی۔

"بابا! میں اب تیری بہو ہوں ___ میں تیرے گھر کی عزت ہوں۔ بابا"

"تو ___؟" کاکا اور کچھ نہ کہہ سکا۔

"میں تیری بہو ہوں ___ تیری عزت ہوں۔ میں اب رنڈھی خورشید بیگم نہیں ہوں۔ میرا نکاح ہو چکا ہے تیرے بیٹے سے ___ میں تیری....." اُس وقت، اندر سے طفیل بھی باہر آ گیا۔ باہر لوگ تماشا دیکھنے کے لیے بڑے بیتاب تھے۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ ایک عورت کو چوٹی سے پکڑ کر کس طرح گھسیٹا جاتا ہے اور کس طرح اسے شریفوں کے محلے سے نکالا جاتا ہے۔ مگر کاکا ابھی تک اسے باہر لایا ہی نہیں تھا اور ان کی بے تابی بڑھتی جا رہی تھی۔

مولوی صاحب اپنی دسمہ لگی داڑھی میں انگلیاں پھیر رہے تھے اور ان کی نظریں دروازے پر لگی تھیں۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

دو تین منٹ بعد کاکا دروازے سے برآمد ہوا۔ مگر وہ اکیلا تھا۔ البتہ اس نے لاٹھی پکڑ رکھی تھی۔

"وہ کیوں نہیں آئی؟" مولوی صاحب نے پوچھا۔

"نہیں آئے گی ---- میری بہو ہے ---- میرے گھر کی عزت ہے"۔ کاکا کے یہ الفاظ سن کر لوگ ہنس پڑے۔

"اسے لاؤ باہر" مولوی صاحب کی آواز گونجی۔

"نہیں آئے گی"۔ مولوی صاحب نے اپنی انگلیاں ڈاڑھی میں سے نکالیں اور اپنا ہاتھ لاٹھی کی طرف بڑھایا۔

"خبردار مولوی"۔ کاکا نے یہ لفظ پورے زور سے کہے۔

"کوئی شخص آگے نہ آئے"۔ کاکا نے لاٹھی کا سرا زور سے زمین پر مارا۔

کاکا کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ مرنے مارنے پر تیار ہو کر باہر آیا ہے۔ مولوی صاحب کی بصیرت نے صورتِ حال کا جائزہ لے کر لوگوں سے کہا۔

"آؤ سب مسجد میں۔ دیکھتے ہیں یہ کب تک اسے چھپا کر رکھتا ہے"۔

مولوی صاحب جانے لگے اور لوگ بھی مزید تماشے کی خواہش لیے پیچھے پیچھے قدم اٹھانے لگے۔

چھوٹی مسجد میں کاکا کے بارے میں کئی قسم کی باتیں ہوئیں اور اس کے لیے طرح طرح کی سزائیں تجویز کی گئیں۔ منشی رمضان علی یہ باتیں سنتا رہا اور خاموش رہا۔ اس سے مشورہ دینے کے لیے کہا گیا۔ تو وہ بولا:

"سزا ---- کس کے لیے سزا۔ بھائیو! یہ کاکا تو ہے ہی پاگل اوّل درجے کا۔ جو شخص بڑھاپے میں بھی کاکا ہو اس کو کیا سزا دو گے؟"

لوگ ہنس پڑے۔ فضا کی سنگینی میں ملائمت سی آ گئی۔ صدر دین نے منشی کی تائید کرتے ہوئے کہا "بچپن میں چڑیلوں کے پیچھے بھاگا کرتا تھا۔ اب مچھلیاں پکڑتا ہے۔ کیا کرے گا بھلا رنڈی بھی کبھی کسی کے گھر میں بسی ہے۔ دیکھنا کاکا خود ہی تنگ آ جائے گا اور اسے بے عزت

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

نکال دے گا۔"

یہ بات سب کی سمجھ میں آگئی۔ بڑے بوڑھوں نے مثالیں دے دے کر بتایا کہ طوائف
ے پر ہی رہ سکتی ہے گھر میں شریفانہ زندگی بسر نہیں کر سکتی۔
مولوی صاحب نے کاکا کی طرف سے توجہ ہٹالی البتہ لوگوں کو نماز کی تلقین کرنے کی خاطر
لہ کمیٹی بنا دی گئی جس کے عہدہ داروں کا بھی انتخاب ہو گیا اور یوں غیر نمازی اسی وقت
ی ظہر کی نماز پڑھ کر مسجد سے باہر آگئے۔

○

طفیل باپ کے سلوک سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے آوارگی کی عادت چھوڑ دی۔ اب
غمدکان پر جاتا تھا اور دکان سے نکل کر سیدھا گھر آجاتا تھا۔ کاکا کی وہی مصروفیات تھیں
ں وہ کبھی کمی یا تبدیلی نہیں آنے دیتا تھا۔ البتہ اب اس نے صمدردین کی دکان پر بیٹھنا
یا تھا۔ بے وقت بھی وہ جال یا دری کی مرمت میں صرف کر دیتا تھا۔
خورشید بیگم ایسی گھریلو عورت ثابت ہوئی کہ نانا کو کہنا پڑا "اسے طوائف بنے زیادہ
یں گزری ہو گی ورنہ طوائف اور گرہستی توبہ توبہ۔"
وہ گھر کے سارے کام کرتی تھی اور خسر کی تو اتنی خدمت کرتی تھی کہ دیکھنے اور سننے والے
رہ جاتے تھے۔
چار پانچ ماہ تک طفیل بالکل ٹھیک ٹھاک رہا۔ پھر یوں ہوا کہ اس کے پرانے دوست
ن اُسے گھیر گھار کر بھاٹی دروازے کے باہر کراؤن سینما کے سامنے پرانے بڑ کے
کے نیچے "بھنگیوں کے تکیے" میں لے گئے اور اُسے بھنگ پلا دی۔ جب طفیل گھر
رشید بیگم تاڑ گئی کہ معاملہ کیا ہوا ہے۔ اس نے صبح طفیل سے کہہ دیا اگر پھر کبھی بھنگ
ی تو میں بابا سے کہہ دوں گی۔ طفیل نے دونوں ہاتھوں سے اپنے دونوں کان اس
ینچے کہ خورشید بے اختیار ہنس پڑی مگر اُس کا وعدہ صرف چند روز ہی برقرار رہا۔
کیے میں پہنچ گیا اور اب کے ایسا پہنچا کہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر ہی وہاں سے نکلا۔
کاکا غریب آدمی تھا لیکن اس نے بیٹے پر دل کھول کر خرچ کیا۔ اُسے ہسپتال میں داخل

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

کر دیا گیا جہاں آٹھ روز کے بعد وہ مر گیا۔

ایک مہینہ گزر گیا تو ایک روز کاکا بھرائی ہوئی آواز میں خورشید سے بولا:

"بیٹی! اب تیرا کیا ارادہ ہے؟"

خورشید بیگم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کہنے لگی۔

"بابا! میں کہاں جاؤں گی۔ میرا دنیا میں کون ہے تیرے سوا۔ اب تو ہی میرا سب کچھ ہے۔ مجھے اپنے گھر سے نہ نکال۔"

اور یہ الفاظ سن کر کاکا نے اس کے آنسو اپنے ہاتھ سے خشک کیے اور اس لہجے میں جو اعتماد سے بھرپور تھا، بولا: "بیٹی! تو میری بہو ہی نہیں، بیٹی بھی ہے۔ میرے گھر کی عزت ہے۔ میں تجھے ہمیشہ خوش رکھوں گا۔ جب جائے گی اپنی مرضی سے جائے گی۔ میں تجھے جانے کے لیے کبھی نہیں کہوں گا۔" اور خورشید نے پیر دستگیر کی قسم کھا کر کہا کہ وہ مر کر اس کے گھر سے نکلے گی۔

○

کاکا میں نہ جانے کام کرنے کی اتنی اُمنگ، اتنا ولولہ کہاں سے آ گیا تھا کہ وہ آرام لینے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ جو کچھ کماتا تھا خورشید کے ہاتھ پر رکھ دیتا تھا۔ اور خود دو وقت کی روٹی ہی سے سروکار رکھتا تھا۔ خورشید روپیہ کہاں خرچ کرتی ہے۔ کس طرح خرچ کرتی ہے اس سے اُسے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

اور کہنے والے کہتے تھے کہ سسر ہو تو ایسا ہو اور بہو ہو تو ایسی ہو۔

خورشید کی گھریلو مصروفیات جلد ختم ہو جاتی تھیں۔ فارغ ہو کر وہ اِدھر اُدھر کسی نہ کسی کے گھر میں چلی جاتی تھی۔ کاکا اس کے آنے جانے پر کوئی اعتراض نہیں کرتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ آدمی تنہائی سے گھبرا جاتا ہے اور وہ چاہتا نہیں تھا کہ اس کی بہو دُکھی اور پریشان ہو۔

کئی ہفتوں کے بعد کاکا نے محسوس کیا کہ اس کی بہو غمگین بیٹھی ہے۔

"کیا بات ہے بیٹی!" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں بابا! وہ یاد آ جاتے ہیں۔"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

اسی لمحے کاکا کے سامنے طفیل کی شکل اُبھر آئی۔ اس نے آہ بھر کر منہ دوسری طرف پھیر
ں دن اس نے عہد کر لیا کہ بہو کو زیادہ آرام پہنچائے گا اور وہ خورشید کی ناز برداری سے
ی نہیں تھا۔

○

ایک شام چوک دیوی دتا میں کوئی شخص منشی رمضان علی سے پوچھ رہا تھا۔
مچھلیوں والے کاکا کا گھر کہاں ہے"؟
آپ کا کاکا سے کیا رشتہ ہے"؟ منشی نے استفسار کیا۔
جی۔ ان کے گھر میں میری بہن ہوتی ہے"۔
خورشید بیگم تمہاری بہن ہے"؟
نووارد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
منشی نووارد کو کاکا کے گھر لے گیا۔ خورشید پرات میں چاول ڈالے انھیں صاف کر
ں۔ نووارد اندر آگیا تو وہ ایک دم گھبرا گئی۔ مگر یہ گھبراہٹ دو تین لمحے رہی۔ پھر وہ
بولی:
گئے"۔

ں ـــــ بڑی مشکل سے تمہارا پتا ملا ہے ـــــ کیا حال ہے بہن"؟
ٹھیک ہوں اکرم بھائی۔ میرا سائیں مر گیا ہے۔ بابا نے سہارا دیا ہے"۔
ی لمحے کاکا بھی باہر سے آگیا۔ خورشید نے نووارد کا اپنے خسر سے تعارف کرایا: "یہ میرا
ے۔ اکرم اس کا نام ہے"۔
بات سنتے ہی کاکا سوڈا واٹر کی بوتلیں لینے باہر نکل گیا۔
رم کاکا کے ہاں آٹھ روز رہا۔ کاکا نے اس کی بڑی تواضع کی۔ اور نویں دن وہ اجازت
ست ہو گیا۔

○

ڑے کی اندھیری رات تھی۔ کاکا اپنے کمرے میں سو رہا تھا اور اس سے کچھ فاصلے پر

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

خورشید چارپائی کے اُوپر خراٹے لے رہی تھی۔ وہ بڑی بے چین تھی آخر وہ اُٹھ بیٹھی کاکا اور طفیل کے کمروں کے درمیان دیوار کے ساتھ ایک کیل سے لالٹین لٹک رہی تھی جس کی روشنی بہت مدھم تھی۔ لالٹین سرِشام ہی بجھا دی جاتی تھی مگر اُس شام خورشید نے لالٹین کو بجھایا نہیں تھا۔ ہاں اس کی بتی کافی نیچے کھینچ لی تھی۔

اُس نے بتی کو اُونچا کیا ۔ کاکا کے پاس گئی ۔ کاکا سو رہا تھا۔ وہ لالٹین اٹھا کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ دن کے وقت ٹرنکوں میں سے اچھے اچھے کپڑے اور صندوق میں سے اپنی ساس کا زیور نکال کر اس نے ان چیزوں کو ایک تھیلے میں محفوظ کر لیا تھا اور یہ تھیلا اس چارپائی کے نیچے پڑا تھا جس پہ طفیل سویا کرتا تھا۔

اس نے چارپائی کے نیچے سے تھیلا نکالا۔ لالٹین کی بتی کو نیچے کھینچ لیا۔ اب اس کے ایک ہاتھ میں تھیلا تھا اور دوسرے میں لالٹین۔ بہت احتیاط سے قدم اٹھا کر خسر کی چارپائی کے پاس آئی۔

کاکا خراٹے لے رہا تھا۔

اس نے لالٹین کو وہیں لٹکا دیا جہاں سے اُتارا تھا۔ اور بڑی آہستہ سے دروازے کا ایک پٹ کھول کر باہر آگئی۔ باہر نکل کر اس نے وہ پٹ بند کر دیا۔

○

چوک دیوی دتا میں مایا رام کے مکان کے اُونچے تھڑے سے کچھ فاصلے پر ایک سایہ حرکت کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک اور سایہ اس کے قریب آگیا۔

"خورشید جانی!"

"ہاں اکرم جانی!"

"لے آئیں ہو؟"

"ہاں!"

"نہیں تیریاں رلیاں!"

دونوں سائے حرکت کرنے لگے۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

چند قدم چلے ہوں گے کہ خورشید رُک گئی۔

"کیوں میری جان!"

"کوئی آ رہا ہے!" خورشید نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"کوئی نہیں۔ پاگل ہو گئی ہو۔ چلو۔ اندھیرے میں کوئی کتا ہو گا۔"

وہ پھر چلنے لگے۔

"وہ" خورشید نے زمین پر روشنی کی ایک لکیر کو دیکھ کر کہا۔

اکرم ادھر دیکھنے لگا۔ دونوں کے قدم رُک گئے تھے۔ چند لمحوں کے بعد ان سامنے کاکا کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔

"خورشید بیٹی! رات بڑی اندھیری ہے۔ لالٹین لے جاؤ۔"

کاکا نے لالٹین وہیں رکھ دی۔ مڑا اور چلنے لگا۔ اور اندھیرے میں جذب ہو گیا۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

اُستاد فضل الٰہی فضل

اے خدائے بزرگ و برتر! مَیں آج تیرے حضور بصد عجز و نیاز اُس جُرم کا اعتراف کرتا ہوں جو کافی مدّت ہوئی ایک ناروا حرکت کی صورت میں مجھ سے سرزد ہوا تھا۔ تو دانا و بینا ہے۔ خوب جانتا ہے کہ میرے اس جرم کی تحریک کس جذبے سے ہوئی تھی اور مَیں کس حد تک مجرم سمجھا جا سکتا ہوں۔ مگر مَیں اس وقت دُور از کار تاویلات سے کام نہیں لُوں گا۔ جب اعترافِ گناہ ہی کرنا ہے تو اس میں جرح و تاویل کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ پر ایک بات ضرور کہوں گا۔ اِس جرم، گناہ یا قصور کا ارتکاب مَیں نے اُس وقت کیا تھا۔ جب مجھے یہ حقیقت معلوم نہیں تھی کہ ایک شاعر کا سیروں لہو صَرف ہوتا ہے جب کہیں جا کر ایک مصرعِ تر کی صُورت نکلتی ہے۔ مَیں نے اپنی بے بصری کی وجہ سے ایک غیر مناسب رویّے کو تفریحِ طبع کا ایک ذریعہ سمجھ لیا تھا میری مراد کسی کی دلآزاری ہرگز نہیں تھی۔ لیکن یہ کیا؟ مَیں نے تو خواہ مخواہ دلیل آفرینی شروع کر دی ہے۔ اعترافِ گناہ کے موقع پر عذرِ گناہ بدتر از گناہ کے مترادف ہوتا ہے اور مجھے لازماً اس کا خیال رکھنا چاہیے تو اب وہ واقعہ بے کم و کاست بیان کر دینا چاہیے۔ جس کا تعلق اس جُرم سے ہے جو کبھی کبھی میرے ذہن پر بوجھ سا بن جاتا ہے۔

وہ چوک دیوی دتا میں آ گیا تھا۔ رہنے کی خاطر، شاعری کرنے کی خاطر اور شعر سُنانے کی خاطر۔ اُس کے آنے پر کسی نے حیرت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ہر محلے میں نئے لوگ آتے ... ب، یہ

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

وہاں سے چلے بھی جاتے ہیں۔ یہ تو ہوتا رہتا ہے اور وہ ہمارے ہاں آگیا۔ سنا تھا
مصری شاہ میں اپنے مکان کے نیچے اس کی دکان تھی، وہ دکان چھوڑ کر لوہاری منڈی
کاروبار کرنے لگا اور پھر اُدھر سے چوک دیوی دتا میں آگیا۔

ایک روز صبح سویرے میں اپنی گلی سے باہر نکل رہا تھا۔ دہی خریدنے کے لیے۔
نے دیکھا کہ چاچا چاچا محمد دین بھی ہاتھوں میں گلاس لیے مجھ سے آگے آگے چلے جا رہے ہیں۔
ان زمانے میں اُس دکان سے دودھ دہی خریدا کرتے تھے جو ستّہ سے بازار میں واقع تھی۔
لسی کے لیے دودھ لیتا تھا اور چاچا چاچی چائے کے لیے ___ ستّہ سے بازار کو سیدھا
جاتا ہے مگر وہ تو مُڑ کر دائی مرادو کی بیری کی طرف جانے لگے۔

میں نے پوچھا: "چاچا جی! کدھر جا رہے ہیں؟"

بولے: "اِدھر آؤ۔ نئی دکان کھل گئی ہے۔"

یہ نئی دکان تھی۔ صدر دین موچی کے اڈّے سے چند قدموں کے فاصلے پر، کاکا چڑیمار
ڑی کے تھڑے کے متصل اور اس کے تھڑے کے اوپر بیٹھا ہوا تھا ایک ایسا آدمی
میں نے پہلی بار دیکھا تو طبیعت بیزار ہو گئی۔ اس کے چہرے پر ذرّہ برابر بشاشت
ں تھی۔ رنگ کالا، رخساروں پر جا بجا چیچک کے داغ۔ ایک آنکھ سے رطوبت بہہ
رہی تھی جسے وہ بار بار اپنے تہمد کے پلّو سے پونچھ لیتا تھا۔ سر کے بالوں میں سفیدی
رہی تھی۔ ناک بیٹھی ہوئی اور صاف معلوم ہو رہا تھا کہ جناب نہانے سے پرہیز
تے ہیں۔ وہ سودا دینے سے پیشتر تہمد ہٹا کر دائیں ہاتھ کے گندے ناخنوں سے
ں پنڈلی کھجانے لگا اور اس پر ایسے نشان پڑنے لگے جیسے راکھ کے ڈھیر پر چیونٹیوں
لمبی قطار چلی جا رہی ہو اور اپنے پیچھے ایک لکیر سی چھوڑ رہی ہو۔

"یہ ہے اُستاد فضل الٰہی فضلی،" چاچا جی نے میرا تعارف کرایا۔

شاعر ہے شاعر۔ ہاں،" چاچا جانے نئی خبر سنائی۔

شاعر نے اپنا سر ہلایا۔ گویا چاچا جی کے الفاظ کی تائید کر رہا ہے۔

یہ میری پہلی ملاقات تھی اُستاد فضل الٰہی فضلی سے۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

اس کے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہوگئیں۔

اُستاد پنجابی زبان کے نامور شاعر گاموں خاں کا شاگرد ہے اور اس بات پر اسے فخر ہے کہ وہ اتنے بڑے شاعر کا شاگرد ہے۔ اپنا کلام سُنانے سے پہلے اپنے اُستاد کے دو چار شعر سنانا ضروری سمجھتا ہے۔ اَن پڑھ ہے۔ دستخط کرنا بھی نہیں جانتا۔ شعر سُناتا ہے تو گلا کہ شروع شروع میں تو اس کی آواز۔ آواز ہی رہتی ہے مگر جب پنجم پر پہنچ جاتی ہے تو ایک چیخ بن جاتی ہے۔ اُستاد کے کچھ اُستاد بھائی بھی ہیں اور کئی ایک شاگرد ہیں۔ شاگردوں کے شعر سنتا ہے تو بار بار ناک بھوں چڑھا لیتا ہے اور کہتا ہے۔ "تُسی لوگ دِل لگا کے شعر نہیں کہندے۔ محنت کیتا کرو۔"

یہ بھی معلوم ہوا کہ اُستاد چھوٹا سا مشاعرہ ہر تیسرے چوتھے روز منعقد کر لیتا ہے اور اس معاملے میں اتنی دلچسپی لیتا ہے کہ اس کے گاہک پریشان ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ شعر سننے نہیں آتے، دودھ ہی خریدنے کے لیے آتے ہیں۔

اُستاد کی چھوٹی سی دکان تھی اور دو حصوں میں منقسم تھی۔ بیرونی حصہ لکڑی کے ایک لمبے چوڑے تختے پر مشتمل تھا۔ تختے کی حد جہاں ختم ہوتی تھی وہاں دیوار کے ساتھ سیمنٹ کا بنا ہوا ایک چولہا نظر آتا تھا جس کے اُوپر ایک کافی بڑی کڑھائی دھری رہتی تھی۔ اس کڑھائی میں دُودھ ہوتا تھا۔ اُستاد تختے کے اُوپر ایک چوکی پر بیٹھ کر چولہے میں آگ جلا کر کڑھائی میں مسلسل کڑچھ پھیرتا رہتا تھا اور ساتھ ساتھ گاہکوں سے بھی نمٹتا جاتا تھا۔ اس دوران میں کوئی شاگرد آوارد ہوتا تھا تو اُس کے شعر سُننے اور اصلاح دینے میں بھی کسی تکلف سے کام نہیں لیتا تھا۔ کوئی اچھا شعر کان میں پڑ جاتا تو اس کا ہاتھ بے اختیار رُک جاتا اور یہ ہاتھ دوبارہ اس وقت حرکت کرتا جب دُودھ کڑھائی میں سے نکل کر اُس کے پاؤں یا زانو پر گر کر اُسے اپنی موجودگی سے مطلع کر دیتا۔

یہ تختہ بہت پرانا تھا۔ اس میں کئی جگہ سُوراخ پڑ گئے تھے۔ پانی ان سوراخوں سے نکل کر نیچے فرش پر گرتا رہتا تھا اس لیے محتاط گاہک اپنے برتن تختے کے اُوپر رکھ کر خود دو تین قدم پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور جو گاہک اس معاملے

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

تیاط نہیں کرتے تھے وہ اُستاد سے کپڑوں کے خراب ہونے کی شکایت کرتے تھے۔
ہنس کر کہتا تھا۔

"یار! پانی اے۔ لگاتے دا مُوتر تے نہیں۔"

اس پہ بات ختم ہو جاتی۔

دکان کے اندر، دیواروں اور چھت پر منجمد دھویں کے علاوہ بھی کچھ چیزیں موجود
تھیں۔ مثلاً ایک چارپائی جسے دن کے وقت دیوار کے ساتھ لگا دیا جاتا تھا تاکہ بیٹھنے
کے گنجائش نکل سکے۔ اس چارپائی کے ایک پائے کے ارد گرد اُستاد کا بستر لٹکتا رہتا تھا۔
پر ایک گندی دری بھی رہتی تھی جس کا رنگ دکان کی دیواروں کی دھواں کھائی سیاہی سے
مختلف نہیں تھا۔ ایک دیوار میں ایک کھونٹی تھی جس پر اُستاد کے کپڑے دکھائی دیا کرتے
ان کپڑوں کے نیچے کوئلوں کی بھری ہوئی یا ادھ بھری بوری پڑی رہتی تھی۔ بوری کے
ایک فالتو چمٹا، ایک پھونکنی اور بوٹوں کا ایک جوڑا نظر آ جاتا تھا۔ یہ جوڑا اُستاد نے کچھ
پہلے خریدا تھا اور جب اس نے پاؤں کو تکلیف دی تھی تو اسے پہننے سے توبہ کر لی
اس وقت سے لے کر اب تک یہیں پڑا تھا۔

اُستاد نے بتایا تھا کہ یہ بوٹ اُس نے اپنے فیشن ایبل شاگرد شیدے کو دے دینے
مگر اس نے لینے سے اس بنا پر انکار کر دیا تھا کہ شاگرد کا کام اُستاد کی خدمت کرنا ہے
سے کوئی چیز لینا نہیں۔

اُستاد دو ہی شخصوں کی تعریف کرتا تھا۔ ایک تو اپنے اُستاد گاموں خاں کی اور ایک
شاگرد کی جس کا نام رشید تھا مگر وہ جسے پیار سے شیدا کہا کرتا تھا۔ شیدے کو وہ دودھ
ملائی اتار کر دے دیا کرتا تھا۔ حیرت ہے کہ فرض شناس شاگرد نے بالائی والا پیالہ لینے
بھی عار محسوس نہیں کی تھی اور بوٹ لینے سے انکار کر دیا تھا۔

اُستاد اپنے دوسرے شاگردوں کے کلام پر تو سب کے سامنے اصلاح دیا کرتا تھا
اپنے اس نوجوان شاگرد کا کلام تنہائی میں سنتا تھا۔ لوگوں کی زبان بھلا کون پکڑ
ہے۔ کہنے والے کہتے تھے کہ یہ شاگرد اُستاد کا چہیتا ہے اور اُستاد اسے خود شعر لکھ کر

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

دیا کرتا ہے۔ اسے شاعری سے کوئی واسطہ نہیں۔ اُس کے بارے میں یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک زمانے میں اُستاد کی شادی ہوئی تھی۔ چند ماہ بعد میاں بیوی میں ناچاقی ہو گئی۔ وہ نیک بخت اُستاد کی عدم موجودگی میں گھر کا سارا سامان لے کر اپنے میکے جا بیٹھی اور پھر کبھی واپس آئی۔

مَیں ذکر اُستاد کی دکان کا کر رہا تھا۔ دکان کے ایک کونے میں ایک الماری بھی تھی جس کا سر چھت سے جا لگا تھا۔ اس کے چار خانے تھے۔ دو خانوں میں دودھ سے بھرے ہوئے کونڈے ہوتے تھے۔ یہ دودھ دہی بن جاتا تھا۔ سب کے اُوپر کے خانے میں مٹی اور شیشے کے پیالوں کے علاوہ کچھ چمچے پڑے رہتے تھے۔ ایک کڑچھ اور دہی کاٹنے والی ایک کٹنی۔ سب سے نچلے خانے میں ایک پھٹی پرانی کاپی کے اندر ایک پنسل بھی ہوتی تھی۔

مَیں کہہ چکا ہوں کہ اُستاد ان پڑھ تھا پھر اسے الماری میں کاپی پنسل رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ ضرورت اس بنا پر تھی کہ لین دین کے معاملے میں انسان کا حافظہ کتنا بھی قوی کیوں نہ ہو، کہیں نہ کہیں ٹھوکر کھا جاتا ہے۔ اس لیے حساب کتاب لکھ لینا ضروری ہے۔ اُستاد اپنے جن گاہکوں کو اُدھار مال دیتا تھا ان کا حساب اس کاپی میں درج کر لیتا تھا۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ حساب کتاب کے لیے وہ اپنی تکنیک استعمال کرتا تھا اور یہ تکنیک ذرا وضاحت کی طالب ہے۔

اُستاد نے ہر اُدھار لینے والے گاہک کے لیے ایک خاص صفحہ مخصوص کر رکھا تھا اور دودھ دہی کی مقدار کے لیے بھی خاص خاص علامتیں مقرر کر دی تھیں۔ مثلاً ایک پاؤ دودھ یا دہی کے لیے وہ ایک نقطہ ڈال دیتا تھا۔ آدھ سیر کے لیے دو نقطے۔ مقدار کے ساتھ ساتھ نقطوں کی تعداد بھی بڑھتی جاتی تھی۔ کبھی کبھی نقطوں کی بجائے چھوٹی چھوٹی لکیریں بھی ڈال دیتا تھا۔ مہینے کے اختتام پر وہ ان نقطوں یا لکیروں کو گن کر اپنے گاہک سے رقم وصول کر لیتا تھا۔ اس معاملے میں اسے کبھی دقت پیش نہیں آئی تھی۔ اگر کوئی گاہک اعتراض کرتا تو اس کا جواب ایک ہی ہوتا۔ "میرا حساب غلط نہیں ہو سکتا۔ جاؤ دکھلا لو کسی نوں جا کے"۔ عام طور پر سب کے سب گاہکوں کو اس پر کلی اعتماد تھا۔ اعتراض کی گنجائش شاذ و نادر ہی نکلتی تھی۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

نادحساب کتاب کا معاملہ تو یوں طے کر لیتا تھا اب رہ گئے اس کے شعر تو حیرت انگیز
اس۔ اپنا ایک ایک شعر یاد رکھتا تھا۔ کیا مجال جو اسے وہ شعر بھول گئے ہوں جو
س بارہ سال پہلے کہے تھے۔ کبھی کبھی اپنے چہیتے شاگرد شیدے سے حساب
ں تازہ نظم لکھوا لیتا تھا۔ اور شاگرد کو اس کی محنت کا صلہ دودھ سے بھرے
پیالے کی صورت میں دے دیتا تھا۔

رسے محلے میں اُستاد جلد ہی ہر دلعزیز ہو گیا تھا۔ اپنے شعر سُنا سُنا کر اس نے
دل موہ لیے تھے۔ جب کبھی اپنے شاگردوں کے مجمعے میں بیٹھ کر ہاتھ ہلا ہلا کر
ا تو مرد کیا عورتیں بھی اِردگرد کے مکانوں کی کھڑکیوں میں سے جھانکنے لگتی تھیں۔
رجس وقت کسی کھڑکی میں سے کسی دستِ حنا آلود کی جھلک دیکھ لیتے تھے تو
وش وخروش کے اعتبار سے ایک طوفان بن جاتی تھی۔ ایسے میں ہر شاگرد کی یہ
ی تھی کہ وہ اس طرح بڑھ چڑھ کر داد دے کہ اُستاد کی نظروں کے علاوہ اِس
ڈ والی کی آنکھوں میں بھی سما جائے۔

د ان لمحوں میں واقعی اپنی جنت میں ہوتا۔ اُسے دین دنیا کی قطعاً کوئی پروا نہ
کا ہک آتا تو بیچارا ایک طرف کھڑا ہو جاتا اور انتظار کرتا کہ اُستاد فارغ ہو تو
یٹھ کر دودھ یا دہی دے۔ گوجر جو اُستاد کو روزانہ دودھ سے بھرے ہوئے تین
کرتا تھا، بد قسمتی سے اپنی رقم وصول کرنے کے لیے اس موقع پر آجاتا تو
طرف نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ گوجر عہد کر لیتا کہ اب وہ اُستاد کو دودھ نہیں دیگا
ے بعد میں گلے سے لگا لیتا اور یوں تعلقات بحال ہو جاتے۔

ایک نشست میں نہ جانے کتنی نظمیں سُنا دیتا۔ بلکہ پورے کا پورا کلام جو
شتہ پندرہ بیس سال میں کہا تھا۔ سُنانے پر آمادہ رہتا لیکن کبھی کبھی ایک
یا تا کہ جنت کی ساری کی ساری شادابیاں ختم ہو جاتیں۔ مجلس درہم برہم ہو
کہ کہیں سے مہتاب آتش باز آجاتا اور آتے ہی اُستاد سے مخاطب ہو کر کہتا۔
یا شاعرا! کیا شور مچا رکھا ہے؟

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

اُستاد کا مُوڈ خراب ہو جاتا۔ وہ اُسے آتش بار نظروں سے دیکھتا۔

"جا اوئے اپنا کم کر۔" اُستاد جواب دیتا۔

مہتاب خاموش ہونے والی جنس کب تھی۔ جو لوگ ارد گرد کھڑے ہوتے تھے انہیں مخاطب کر کے کہتا۔ "یارو! غضب خدا کا۔ شریفوں کا محلہ ہے۔ کوئی جنگڑ محلہ تو نہیں۔ ہماری بہو بیٹیاں چھتوں سے لگی کھڑی ہیں اور اُستاد کے غنڈے نظر بازی کر رہے ہیں۔"

اِس پر ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ اُستاد کے شاگرد مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے۔ مگر محلے کے بزرگ بیچ بچاؤ کر دیتے۔ ہنگامہ فرو ہو جاتا، لیکن اُستاد لہُو کے گھونٹ پی کر رہ جاتا کیونکہ وہ اپنی سخت توہین محسوس کرتا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ وہ مہتاب کو اُٹھا کر آگ پر رکھی ہوئی کڑھائی میں ڈال دیتا۔

مَیں نہیں جانتا کہ اُستاد اور مہتاب آتش بازی اس دشمنی کی وجہ کیا تھی۔ کوئی کچھ کہتا، کوئی کچھ، اقربِ قیاس یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جس زمانے میں اُستاد کی دکان سوہاری منڈی میں واقع تھی۔ مہتاب اس کی ساتھ والی دکان میں کاروبار کرتا تھا۔ اُستاد بے دریغ پانی بہاتا تھا تو مہتاب کا آتش بازی کا سامان خراب ہو جاتا تھا۔ اس طرح اِن دونوں میں تُو تُو مَیں مَیں قریباً روز ہوتی تھی۔ بعد میں دونوں الگ ہو گئے۔ دکانیں چھوڑ دیں مگر پرانی دشمنی ختم نہ ہو سکی۔

شبِ براءت کی آمد آمد تھی۔ صرف چند روز باقی رہ گئے تھے۔ اُن دِنوں آتش بازی پر اتنی قدغن نہیں تھی۔ گو مسجدوں کے اندر مولوی صاحبان آتش بازی کو کارِ شیطان ثابت کرنے کے لیے پُورا پُورا زورِ بیان صرف کر دیتے تھے اور کچھ لڑکے شبِ براءت سے دو تین روز پہلے گروہ بنا کر گلیوں میں گاتے پھرتے تھے ؎

آتش سے بازی مت کرو۔ آتش سے بازی مت کرو

اس سے بچو یہ آگ ہے۔ یہ آگ کا لا ناگ ہے۔ آتش سے بازی مت کرو۔

مسلمان بڑے خضوع و خشوع کے ساتھ مولویوں کا وعظ بھی سُنتے تھے، دکانوں

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ز بھی ان کے کانوں میں پہنچ کر دلوں میں اُتر جاتی تھی۔ مگر جب ان کے بچے، پوتے،
ہ وغیرہ پٹاخوں کے لیے اصرار کرتے تو دو تین روپے کا سامان گھر میں ضرور آ جاتا۔
نابالغ بچے کسی بالغ سرپرست کی راہنمائی میں کوٹھوں کے اُوپر چلے جاتے اور خوب
آتش سے بازی کرتے۔ جوان لڑکے ایک دوسرے کے مدِ مقابل آ کر چھچھوندریں
تے۔ کسی راہ گیر کی دھوتی، پاجامے یا کُرتے پر چھچھوندر گرتی تو زور زور سے تالیاں
اور اُدھر راہ گیر دہشت زدہ ہو کر بھاگ نکلتا۔ اُستاد کئی روز سے ایک شاندار مشاعرہ
ہ کی فکر میں تھا۔ ایک روز میں نے دیکھا کہ اُستاد کا چہیتا شاگرد رشید احباب کتاب والی
ں شاعروں کے نام لکھ رہا ہے اور اُستاد اسے تاکید اً کہہ رہا ہے کہ کوئی شاعر
جائے۔

محلے والے اس مشاعرے کا انتظار کر رہے تھے۔ جس شام کو مشاعرہ ہونے والا
دوپہر ہی کو مایارام کے بلند مکان کے تھڑے کے آگے دریاں بچھ گئیں۔ میں اُستاد
ن کے پاس سے گزرا تو دیکھا کہ اُستاد نے نہ صرف ستھرا لباس پہن رکھا ہے بلکہ
ں میں سُرمہ بھی ڈال رہا ہے۔ مجھے اس وقت بھاٹی دروازے کی ایک دکان سے
اقی کے حقّے کے لیے تمباکو خریدنا تھا۔ میں نے تمباکو تو خرید لیا لیکن گھر کی طرف
ی بجائے بازار حکیماں کی طرف جانے لگا۔
اُن دنوں مہتاب آتش باز کی دکان شمشان بھومی کے پہلو میں واقع تھی۔ شمشان بھومی
و اپنے مردوں کو جلایا کرتے تھے۔ یہ عمارت آج بھی راوی روڈ پر نظر آ جاتی ہے۔
دکان پر پہنچ کر میں نے کہا۔
چاچا! کچھ سُنا ہے؟
کیا بات ہے باؤ۔"
مشاعرہ ہو رہا ہے۔ بڑا زبردست۔"
اچھا۔ بس مزا آ جائے گا۔"
مہتاب سخت مصروف تھا۔ یہ لفظ کہہ کر وہ کام کرنے لگا۔ مجھے افسوس ہوا کہ

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ستاد نے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ کوئی کارروائی کرے گا یا نہیں اور کرے گا تو کون سی کارروائی
رے گا۔ چونکہ دیوی دتا میں مایا رام کے تھڑے کے ساتھ ساتھ کئی کرسیاں بچھی تھیں۔
گیس جل رہے تھے۔ ایک طرف میز تھی۔ جس کے وسط میں تازہ پھولوں سے سجا ہوا
لدستہ گلدان میں اپنی بہار دکھا رہا تھا۔ بڑی چہل پہل تھی۔ دریوں پر لوگ بیٹھے شاعروں
کا انتظار کر رہے تھے اور شاعر۔ سب کے سب اُستاد کی دکان کے اندر بیٹھے باتیں کر رہے
تھے۔ پان کھا رہے تھے۔ حُقّہ پی رہے تھے۔

خدا خدا کر کے شاعر آئے اور کرسیوں پر بیٹھنے لگے۔ سامعین نے زور زور سے
تالیاں بجائیں۔ شاعروں نے سر کے اشاروں سے سلام کیے اور ہاتھ ہلا ہلا کر شکریہ ادا کیا۔

جب تمام کے تمام شاعر کرسیوں پر بیٹھ گئے تو اُستاد میز کے کنارے سے ذرا ہٹ
کر کھڑا ہو گیا۔ آج اُس کا ہر انداز فاتحانہ تھا حالانکہ اُس نے کسی پر بھی فتح نہیں پائی
تھی۔ شاید وہ دل میں سمجھتا ہو گا کہ آج اتنے شاعروں اور سامعین کو دیکھ کر مہتاب
ضرور بالضرور حسد کی آگ میں جل رہا ہو گا۔

اُستاد نے سگریٹ کا لمبا کش لیا اور سامعین کو دیکھنے لگا۔ سگریٹ اس کی انگلیوں
میں تھا کہ ایک شاگرد تیزی سے اُس کے پاس پہنچا اور سگریٹ لے کر واپس آ گیا۔ اُستاد
کا چہرہ اور سُرخ ہو گیا۔ یہ خیال اس کے لیے بڑا خوش آئند تھا کہ اس کے شاگرد اس کا کتنا
احترام کرتے ہیں۔

اُستاد نے دایاں ہاتھ فضا میں لہرایا اور بولا

"بزرگو تے بھراؤ۔

مَیں اپنے شاعر بھراواں دا بڑا احسان مند آں کہ او سُوکم چھڈ کے آ گئے نیں۔ سامنے
بیٹھے سارے لاہور دے وڈے شاعر نیں پر تُسی انہاں دا کلام سُن کے خوش ہو جاؤ گے۔"

تالیاں زور زور سے بجنے لگیں اور شاعر حضرات مسکرانے لگے۔

اُستاد کہنے لگا:

"مَیں پہلے اپنے جگ اُستاد گاموں خاں دے شعر سناؤناواں فیر تُسی میرا کلام

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

تے:"

اُستاد نے دونوں ہاتھوں کی اُنگلیوں سے اپنے دونوں کانوں کی لوئیں چھوئیں
استاد کے دو شعر سُنائے۔ لوگوں نے خوب خوب داد دی۔

"ہُن عرض کرناواں:"

اُستاد شعر سنانے لگا۔ شاعروں اور سامعین کی طرف سے تحسین کے ڈونگرے
لگے۔ میں نے دیکھا کہ مجھ سے دُور مہتاب جھک کر ایک لڑکے کے کان میں کچھ
ہے اور لڑکا سر ہلا رہا ہے۔

استاد کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھی اسی نسبت سے داد و تحسین میں بھی
ہو رہا تھا۔ اس نے مقطع کا دوسرا مصرع پڑھا ؏

فضل مالی ہوواں اپنے باغ دا ایں ہتھ وصل دی پھڑی غلیل ہوئے

واہ اُستاد جی۔ واہ واہ۔ اُستاد کے شاگردوں نے شور سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ یکایک
طرف سے شوں کی سی آواز آئی اور میں نے دیکھا کہ سامعین بے تحاشا بھاگنے لگے۔
آدمی شاعروں سے ٹکرا گئے۔ کرسیاں کہیں سے کہیں جا پڑیں۔ گیس اُلٹ گئے۔ اس
میں کوئی کسی کا پُرسانِ حال نہیں تھا۔

یا الٰہی یہ کیا ہوا۔

اُستاد نے ہر چند کوشش کی کہ مشاعرہ از سرِ نو جم جائے مگر لوگ دریوں پر بیٹھنے سے
تھے کیونکہ دو تین آدمیوں کی ٹانگیں بھاگنے میں زخمی ہو گئی تھیں۔ البتہ وہ چار چار
کے گروہ بنا کر اِدھر اُدھر کھڑے ہو گئے تھے اور آپس میں باتیں کرنے لگے تھے۔
چاچا محمد دین نے لڑکوں کو اکٹھا کر کے کہا: "تمہیں اپنے اپنے باپ کی قسم۔ بتاؤ چھچھوندریں
چھوڑی ہیں؟" سب کے سر انکار میں ہل رہے تھے۔ اس رات شاعر کلام سُنانے
بیٹھنے کی حسرت ہی لے کر گھروں کو روانہ ہوئے۔ صبح مہتاب دکان کی طرف جا رہا
مجھے دیکھ کر رُک گیا۔

"یار آ مزا آیا رات کو؟"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"واہ چاچا! تیرا جواب نہیں۔"

مہتاب لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا اور کہیں سے کہیں جا پہنچا۔

مشاعرہ تباہ ہو گیا۔ اُستاد اندر ہی اندر کڑھائی کے دودھ کی طرح اُبل رہا تھا مگر کچھ [کر] نہیں سکتا تھا۔ جو شخص بھی مشاعرہ تباہ ہونے پر اس سے ہمدردی کرتا تھا وہ اُس سے ضرور کہتا تھا۔ "ایہہ ساری شرارت اوس مہتابے دی اے۔ میں کڑچھ مار کے اوہدا سر توڑ [د]یاں گا۔" لوگ اِسے سمجھاتے تھے کہ یہ شرارت مہتاب کی نہیں ہے۔ کسی شریر لڑکے [ک]ی ہے مگر اُستاد مانتا ہی نہیں تھا۔ وہ تو کڑچھ کا استعمال آزادی کے ساتھ کر دیتا۔ لیکن بزرگوں نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا اور وہ شاید انتقام کے کسی بہتر موقع کا انتظار کرنے لگا۔

آج سوچتا ہوں اگر میں اُس دن مہتاب کو مشاعرے کی اطلاع نہ دیتا تو مہتاب کام سے فارغ ہو کر بڑی دیر سے گھر پہنچتا۔ شب برات کے قریبی دنوں میں وہ رات کے بارہ بارہ بجے گھر آتا تھا۔ میری اطلاع پر وہ جلدی گھر آ گیا اور پھر وہ واقعہ ہو گیا۔ جس سے اُستاد اور مہتاب کی دشمنی پہلے سے کئی درجے بڑھ گئی۔

اُس زمانے میں میونسپل کارپوریشن کا الیکشن بڑی دھوم دھام سے ہوتا تھا۔ شہر کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک دھوم مچ جاتی تھی اور ہنگامہ مسلسل کئی ہفتے جاری رہتا تھا۔ ہمارے حلقے میں ایک بزرگ کو مدت سے 'فادر آف دی سٹی' ہونے کا شرف حاصل تھا۔ یہ بزرگ تھے میاں گھسیٹا، بڑے رعب داب والے آدمی تھے۔ چھوٹا قد لمبی سفید براق ڈاڑھی جو اُن کے سینے پر چھائی رہتی تھی۔ جدھر سے گزرتے تھے لوگ اُٹھ اُٹھ کر انہیں سلام کرتے تھے۔ لباس ان کا سفید تہمد اور سفید ہی کُرتا ہوتا تھا۔ پاؤں میں لال کھل کی جُوتی۔ کبھی کبھی کُرتے پر واسکٹ بھی پہن لیتے تھے۔ اپنے وقت کی بڑی عجیب و غریب شخصیت تھے۔ ہر چھوٹے بڑے سے پیار کرتے تھے مگر اُن کا پیار کرنے کا انداز ذرا مختلف تھا۔ کسی دکان پر بیٹھ جاتے تھے۔ وہ پھل کی دکان ہوتی تو سب سے پہلے پھل والے پر پیار کا مظاہرہ کرتے اور وہ یوں کہ اپنے ہاتھ کی انگلیوں

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ے اس کے دونوں رخسار زور زور سے کھینچتے۔ وہ اسے اپنی مخصوص اصطلاح میں
یر بنانا" کہتے تھے۔ دکاندار کو شیر بنانے کے بعد وہ اس کے پھلوں پر بھی ہاتھ صاف
رتے تھے۔ مگر دکاندار کو بھی اس کا ملال نہیں ہوتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میاں گھسیٹا
یسروں کا کام کرنے میں حاتم تھے۔ کسی کو بھی ان سے یہ شکایت نہیں ہوتی تھی کہ میاں جی
ے اس کا کام نہیں کیا تو میاں جی جدھر سے گزرتے تھے لوگوں کو "شیر بنانا" نہیں بھولتے
ے اور اس میں چھوٹے بڑے کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔

میاں گھسیٹا مدت تک ہمارے حلقے میں گرجتے رہے۔ کوئی بھی ان کے مقابلے
ں امیدوار بننے کی جرأت نہ کر سکا۔ جب وہ ضعیف ہو گئے تو بیک وقت کئی آدمی
ر ان میں آ گئے۔ ان میں چودھری سردار علی، شیخ اکبر علی اور میاں سلطان محمود بطور خاص
ایاں تھے۔

الیکشن کے دنوں میں اُستاد کی بن آتی تھی۔ وہ کسی نہ کسی امیدوار کا ساتھ دے کر
ں کے حق میں نظم لکھ دیتا تھا۔ اور عام طور پر راتوں کو اس امیدوار کے حامیوں کے
ے آگے چل کر وہ اپنی نظم سُنایا کرتا تھا۔

مجھے معلوم نہیں کہ اُستاد اپنی اس نظم کا کیا صلہ وصول کرتا تھا اور کس انداز سے کرتا
ا۔ بہرحال الیکشن کے زمانے میں اُستاد فضل الٰہی فضل کی چیختی ہوئی آواز محلے کی
ں فضاؤں میں کئی روز گونجتی رہتی تھی اور چونکہ یہ آواز راتوں کو گونجتی تھی۔ لوگوں کی
ند حرام ہو جاتی تھی۔ لیکن کوئی بھی اُستاد کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ کیونکہ اس کے ساتھ اپنے
ید وار کے بیسیوں حمایتی ہوتے تھے جو وقفے وقفے کے بعد اپنے اُمیدوار کا نام لیکر
ندہ باد کے نعرے لگایا کرتے تھے۔ ایک رات اُستاد اپنے جلوس کے ساتھ گلیوں
ں گشت کر رہا تھا کہ اُمیدوار کے مخالفوں نے موقعہ پا کر اس کی اچھی خاصی پٹائی کر دی۔

بہت بڑی بات تھی۔ سب نے اسے قابلِ نفرت فعل گردانا مگر چونکہ اُستاد کو
ندھیرے میں پیٹا گیا تھا وہ مجرموں کی نشاندہی نہ کر سکا۔ اُستاد کے امیدوار نے اُستاد کو علاج
ا لجے کے لیے ایک معقول رقم دے دی۔ خیر یہ واقعہ گزر ہی گیا مگر مجھے اس بات

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

یرت ہوتی تھی کہ اُستاد کو پٹیا اس کے اُمیدوار کے مخالفوں نے تھا۔ مناسب
رت یہی تھی کہ وہ انہیں گالیاں دیتا، بد دعائیں دیتا یا چیلنج کرتا۔ لیکن وہ ہر ایک
ہ کہتا تھا:

"ایہہ کافر اگ وِچ جل کے مرے گا"۔ ظاہر ہے کافر سے اس کی مراد مہتاب
ں باز تھی۔

"وہ کیوں؟" کوئی سوال کر بیٹھتا۔

"ایہنے میرا مشاعرہ خراب کر دِتا سی"۔

گویا اُستاد کو ابھی تک اپنے مشاعرے ہی کے برباد ہونے کا ملال تھا۔ اس کی جو
ں پٹائی ہو گئی تھی اس کا اسے زیادہ رنج نہیں تھا۔

دنیا کا کوئی محلہ بھی اچھے لوگوں سے محروم نہیں ہوتا۔ یہ لوگ صُلح کُن ہوتے ہیں
لڑائی دنگہ کو بالکل پسند نہیں کرتے۔ ہمارے محلے میں بھی اچھے لوگ آباد تھے۔ وہ
د اور مہتاب کی باہمی چپقلش سے لطف اندوز ہونے کی بجائے اسے ختم کرنے کی
شش میں لگے رہتے تھے۔ ان میں چاچا محمد دین پیش پیش تھے۔ ان کی کوششوں
ہ یہ طے ہوا کہ محفل منعقد کی جائے جس میں اُستاد اور مہتاب کی صلح صفائی کرائی جائے
اس محفل میں لذتِ کام و دہن کا بندوبست ہو۔ یہ بھی طے ہو گیا کہ لسی اور چائے
ہ پیے دودھ جلیبی کا اہتمام استاد کرے گا اور مٹھائی مہیا کرنے کی ذمہ داری مہتاب پر عائد ہو گی
ہ ازیں اس امر کا بھی فیصلہ ہو گیا کہ کھانے پینے کے علاوہ اُستاد اپنا کلام سُنائے گا اور مہتاب
کھول کر داد دے گا۔

محفل کے انعقاد اور متعلقہ چیزوں کی فراہمی پر اُستاد اور مہتاب۔ دونوں رضامند ہو
ئے تھے۔ بڑے زور شور سے تیاریاں ہو رہی تھیں یہاں تک کہ چند لڑکوں نے گلیوں
ں خالی کنستر بجا بجا کر اعلان کر دیا کہ آج شام ایک شاندار دنگل ہو گا۔ جس میں اُستاد
ل الٰہی نقشی پٹھہ گاموں خاں، مہتاب آتش باز سے کشتی لڑے گا۔ ٹکٹ کوئی نہیں
ہے۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

شریر بچوں کو شرارت سے بھلا کون روک سکتا ہے؟

میں دودھ خریدنے کے لیے اُستاد کی دکان پر پہنچا تو دیکھا کہ کڑھائی چولہے کی بجائے تھڑے کے نیچے پڑی ہے اور اُستاد کا ایک شاگرد راکھ سے اُسے مانجھ رہا ہے۔ اُستاد بڑے اچھے موڈ میں تھا۔ شاگردوں اور اُستاد بھائیوں سے باتیں کر کر کے ہنس رہا تھا۔ میں نے کہا:

"اُستاد جی! وہ غلیل والی نظم ضرور سُنانا مہتاب کو۔ مہتاب تڑپ اُٹھے گا۔ بہت اچھی نظم ہے۔"

اُستاد بولا:

"باؤ! اوہ کی کہندے نیں۔ او یار بین والی گل۔"

"بھینس کے آگے بین بجانا۔"

"بس اج ایہہ ہووے گا۔ اوہ چِٹا میرے شعر سمجھ سکدا اے؟" اُستاد، مہتاب کو کبھی کبھی چِٹا ابھی کہہ دیتا تھا۔

جمعہ کا دن تھا۔ مہتاب گھر میں تھا۔ میں دودھ خریدنا بھول گیا۔ سیدھا مہتاب کے مکان پر پہنچا۔

"چاچا! اُستاد کے شعروں کی ذرا سوچ سمجھ کر تعریف کرنا۔"

"وہ کیوں؟"

"اُستاد کہتا ہے۔ آج بھینس کے آگے بین بجانی پڑے گی۔"

مہتاب گھور گھور کر میری طرف دیکھنے لگا۔

"باؤ! بین تو سانپ کے لیے بجائی جاتی ہے۔"

"چاچا! وہ تمہیں بھینس کہتا ہے۔ جس کی عقل بڑی موٹی ہوتی ہے۔"

یہ لفظ سنتے ہی مہتاب کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اسی وقت اُستاد کے پاس گیا۔

"اوو ڈیا شاعرا! میں بھینس ہوں۔ میں بھینس ہوں تو تُو بکری ہے۔"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

اس سے پیشتر کہ اُستاد صورتِ حال کا جائزہ لے اس کے شاگردوں کو غصہ آگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہاتھا پائی تک نوبت پہنچ گئی۔ لوگوں نے بیچ بچاؤ کر دیا مگر محفل دھری کی دھری رہ گئی۔ چاچا محمد دین نے دونوں کو بہت سمجھایا لیکن بے سُود۔ سُنا ہے اُس وقت اُس فتنہ پرداز شخص کو بہت بُرا بھلا کہا گیا جس نے اُستاد کی بات مہتاب کو پہنچا دی تھی۔ میں جانتا تھا کہ مہتاب میرا نام نہیں بتائے گا اور اُس نے نہیں بتایا۔ لیکن آج میرا ضمیر مجھے کتنی ملامت کر رہا ہے۔ یہ میں جانتا ہوں۔

اُس روز صبح ہی سے ٹاؤن ہال کے ارد گرد لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ نو دس بجے تک۔ یُوں لگتا تھا جیسے لاہور کی آدھی آبادی یہاں پہنچ گئی ہے۔ اصل میں اُس دن میونسپل کارپوریشن کے الیکشن کے اُمیدواروں کا نتیجہ سُنایا جانے والا تھا۔

اُمیدوار بار بار ٹاؤن ہال کے اندر جاتے تھے اور پھر واپس آ کر اپنے حمایتیوں کے پاس جا کر کوئی نہ کوئی گرما گرم خبر سُنا دیتے تھے۔ جگہ جگہ اُمیدواروں کے حمایتی ہاتھوں میں پھولوں کے ہار اور چھوٹے چھوٹے ڈنڈے لیے نتیجے کے اعلان کا انتظار کر رہے تھے۔

بارہ بجے نتائج کا اعلان ہونے لگا۔ ہمارے حلقے کے اُمیدوار چودھری صاحب ہاتھی کی طرح جھومتے ہوئے اپنے حمایتیوں کی طرف آنے لگے۔ ایک طرف میں بھی اُستاد کے پاس کھڑا تھا۔

چودھری صاحب نہ بھی جھومتے جب بھی وہ اپنے تن و توش کے اعتبار سے پُورے پُورے ہاتھی تھے۔ خاص خاص آدمیوں نے آگے بڑھ کر ان کے گلے میں اتنے ہار ڈالے کہ اُن کا چہرہ چھُپ گیا۔ چودھری صاحب کی نظر اُستاد پر پڑی تو انہوں نے کم و بیش آدھے ہار اپنے گلے سے اُتار کر اُستاد کے گلے میں ڈال دیئے۔ چودھری صاحب کے ساتھ ساتھ اُستاد زندہ باد کے نعرے بھی بلند ہونے لگے۔

تھوڑی دُور جا کر چودھری صاحب تو موٹر میں بیٹھ گئے اور ان کے حمایتی موٹر کے گرد بھنگڑا ڈالنے لگے اور یُوں یہ جلوس فاتحانہ انداز میں بھاٹی دروازے کی طرف گامزن ہو گیا۔ چوک دیوی دتا میں پہنچ کر بھنگڑا ڈالنے والوں نے آدھ گھنٹہ تک اپنے کمالات

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ظاہر کیا۔ اور پھر یہ لوگ پرانی تحصیل کو روانہ ہو گئے۔ چوہدری صاحب وہیں رہتے
ہے۔ ظاہر ہے چوہدری صاحب نے اپنے حمایتیوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ دوپہر کا کھانا
کے ہاں کھائیں۔

اُستاد بہت خوش تھا۔ ایک تو اس کے اُمیدوار نے فتح پائی تھی۔ دوسری بات
یہ کہ اُس کا دشمن مہتاب مخالف گروپ کا آدمی تھا اور اس گروپ کے اُمیدوار میاں
ان محمود کو شکست ہوئی تھی۔

اُستاد کے شاگرد بھنگڑہ ڈالتے ہوئے اُستاد کو اُس گلی میں سے گئے جہاں مہتاب
واقع تھا۔ شاگرد اُستاد فضل الٰہی زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ چند منٹ
پر کھڑکی کی چق ذرا ہلی اور ہلی۔ میں نے دیکھا کہ مہتاب کی بیوی نے ہاتھ میں ایک
پکڑ رکھی ہے۔

میں نے فوراً سمجھ لیا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اُسی لیے دُور جا کھڑا ہوا۔ دوسرے
بالٹی کا سارا پانی اُستاد اور اس کے شاگردوں پر آ پڑا۔ شاگرد گالیاں دینے لگے۔ مگر
نے انہیں روک دیا۔ اب اُوپر سے گالیوں اور بددعاؤں کا سیلاب اُمنڈ آیا۔

اُستاد نے سر جھکا کر کہا:

"بہن! اپنے مردوں بھیج۔ تینوں اُسی کچھ نہیں کہنا۔"

مگر مہتاب کی بیوی گالیاں دیتی رہی اور اُستاد بڑی مشکل سے اپنے شاگردوں کو
سے نکالنے میں کامیاب ہوا۔

اس واقعے کو دو دن گزرے تھے کہ محلے کے ایک لڑکے نے مجھ سے آ کر کہا:

"کچھ سُنا ہے؟"

"کیا؟" میں نے پوچھا۔

"اُستاد کے دودھ میں سے مرا ہوا چوہا نکلا ہے۔"

میں اُسی وقت اُستاد کے پاس جا پہنچا۔ اُستاد چوکی پر بیٹھا کڑاہی کے دودھ
ڈچھ پھیر رہا تھا۔ میں نے کہا:

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"اُستاد کیا تیرے دُودھ میں سے مرا ہوا چوہا نکلا ہے؟"

"ہاں! اکدی میرے دُودھ وچوں مکھی وی نکلی اے۔ چوہا کتھوں آ گیا؟" اُستاد نے کہا۔

مَیں وہیں کھڑا تھا کہ صدرالدین کا لڑکا ہدایت اللہ آ پہنچا۔

"اُستاد جی! تمہارے دُودھ میں چوہا کیسے چلا گیا۔ دکان میں پنجرہ رکھو نا۔"

"اوتوں کتھوں ایہہ گل سُنی ایں؟" اُستاد کی بھنویں تن گئیں۔ اتنے میں سیا جھاد دھوبی آ کر کہنے لگا۔

"یار! چوہا۔"

وہ اپنا فقرہ بھی مکمل نہ کرنے پایا تھا کہ اُستاد نے کڑچھے کو تو چھوڑا کڑھائی ہی میں اور کود کر دکان سے نیچے آ گیا۔

"مَیں اُہدا سر توڑ دیاں گا۔ چوہے دا پُتر۔" اُستاد نے سمجھ لیا تھا کہ یہ ساری شرارت مہتاب کی ہے۔ اُس وقت اس کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے۔ اس دن اُستاد نے طے کر لیا تھا کہ جب مہتاب دکان سے واپس آئے گا تو وہ اسے گھر کی بجائے ہسپتال میں پہنچا دے گا۔ بعد میں اُس نے اپنے بیان میں خود ہی ترمیم کر دی اور اپنے دشمن کو ہسپتال کی بجائے قبرستان پہنچانے کا تہیہ کر لیا۔ محلے کے نیک لوگوں نے اُس کا غصہ ٹھنڈا کیا اور اُس کا سارا دُودھ خرید لیا۔

○

ایک دم مجھے یُوں محسوس ہوا کہ جون کے ایک تپتے ہوئے دن کی دوپہر کو لوگ اپنے گھروں کے اندر گھس گئے ہیں اور سُورج کی تمازت سے بچنے کے لیے انہوں نے کھڑکیاں اور دروازے بند کر لیے ہیں مگر موسم تھا برسات کا جب زندہ دلانِ لاہور گھروں میں بیٹھنا گناہ سمجھتے تھے۔ فوراً آموں کی ٹوکریاں بھیسی یا قیمے والی روٹیاں لے کر شالامار، نہر کے کنارے یا راوی کے ساحل پر پہنچ جاتے تھے۔ وہاں تاش کھیلتے تھے اور سارا دن گزار کر شام کے قریب گھروں کو لوٹ آتے تھے۔ ایسے موسم میں مجھے محلے کی اُداسی اور بے رونقی کا احساس کیوں ہوتا تھا، لگتا تھا جیسے دیوی دیوتا کے رہنے

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ے کچھ کھو چکے ہیں اور اس کا انہیں افسوس ہے۔

ویسے لوگ آ بھی رہے تھے، جا بھی رہے تھے، کام کاج بھی کر رہے تھے
ر ذرا بے دلی کے ساتھ جیسے ان کے اندر نشاطِ کار کا شعلہ پہلے کی طرح روشن نہیں ہے۔
ر ہوا کیا تھا؟

ہوا یہ تھا کہ کئی دن سے اُستاد فضل الٰہی فضلی کی دکان بند تھی۔ کئی روز سے کوئی
کا سہ کھڑا نہیں ہوا تھا۔ کئی دن سے اُستاد کی چیختی ہوئی آواز فضا میں نہیں گونجی تھی۔

اُستاد بیمار تھا اور مصری شاہ میں اپنی بہن کے گھر جا کر اپنی بیماری کا علاج کروا
تھا۔ میں چاچا محمد دین کے ساتھ اس کی عیادت کو گیا۔ دیکھا کہ اس کا چہرہ پہلے سے
زہ سیاہ پڑ چکا ہے اور اس کی چارپائی کے نیچے اُگالدان پڑا ہے جس کے سر سے
ن کی سُرخی جھلک رہی ہے۔

اُستاد بہت کمزور ہو چکا تھا مگر جب باتوں باتوں میں مہتاب کا ذکر آیا تو نہ جانے
کی آواز میں کیسے زور پیدا ہو گیا۔ بولا،

"اوس کانے دی دُوجی اکھ بیں اَئی کر دیاں گا۔"

اصل میں مہتاب کی ایک آنکھ بارود کی وجہ سے زخمی ہو گئی تھی اور ڈاکٹر نے
لگا کر اس پر پٹی باندھ دی تھی۔ یہ خبر اُستاد کو مل گئی تھی اور وہ اُسے کانا کہہ کر خوش
رہا تھا۔

اُستاد کی بیماری لمبی ہوتی جا رہی تھی۔ کئی لوگوں کی دکان پر نظر تھی مگر محلے کے بزرگ
ں کو بھی دکان پر قبضہ کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ اُستاد
ت یاب ہو کر واپس آئے گا تو روٹی کیسے کمائے گا لیکن ایک روز شیدے نے رات
وقت دکان کا تالا توڑ کر اس کا سارا سامان باہر نکال کر اپنے ایک عزیز کو اس میں
دیا۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

اُستاد کی بیماری بڑھتی گئی۔ بڑھتی چلی گئی۔

اب اُس کے صحت یاب ہونے کی کسی کو بھی اُمید نہیں تھی۔ سب اُس کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے مگر اس کی اور اس کے رشتہ داروں کی مصیبت یہ تھی کہ اس کی جان نکلتی ہی نہیں تھی۔ سورۂ یٰسین کئی بار اُس کے سرہانے پڑھی گئی۔ کئی مرتبہ اس کی مشکل آسان کرنے کے لیے دُعا کی گئی۔ لیکن وہ تھا کہ موت کے دروازے پر پہنچ کر رک گیا تھا۔ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتا تھا۔

محلے کے لوگ اس کے ہاں جاتے تھے اور یہ اُمید لے کر آتے تھے کہ صبح اس کی موت کی خبر پہنچے گی مگر خبر یہی پہنچتی تھی کہ بے چارا ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔ اب تو محلے میں یہی سنسنی خیز خبر پھیلتی رہتی تھی کہ اُستاد زندہ ہے۔ مرتا نہیں اور مہتاب کہتا تھا:

"وہ نہیں مرے گا۔ سب کو مار کر مرے گا۔"

اس روز میں چاچا محمد دین، صدر دین، ساجھا دھوبی اور اُستاد کے کچھ شاگرد اُستاد کے پاس بیٹھے تھے۔

اُستاد کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں اور اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ حرکت کر رہے تھے۔ یقیناً وہ اپنی موت کی دُعا مانگ رہا تھا۔

دروازے کا پٹ کھلا اور ہم سب نے حیرت سے دیکھا کہ مہتاب اُستاد کی چارپائی کی طرف چلا آرہا ہے: "السلام علیکم" اس نے بلند آواز میں کہا۔ پھر وہ چارپائی کے پاس پہنچا اور بولا:

"اوڈیا شاعرا، میری جوتی بھی یہاں نہیں آتی تھی۔ پر رات تیرا اُستاد گاسوں خواب میں آیا تھا۔ کہہ رہا تھا جنت میں مشاعرہ ہونے والا ہے۔ فضل کو بھیج دو۔ جان اور تیرا کام۔"

مہتاب ذرا رکا اور پھر ذرا جھک کر کہنے لگا:

"میں تیرے استاد کا پیغام پہنچانے آیا تھا۔ بس" اور وہ جانے لگا۔

چاچا محمد دین نے اُسے روکا۔ صدر دین اُٹھا کہ اُسے پکڑ لے مگر وہ اتنی تیزی

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

سے چلا گیا کہ صدر دین اس کا پیچھا نہ کر سکا۔

دوسری صبح یہ سنسنی خیز خبر ملی کہ رات اُستاد مر گیا ہے۔

مَیں گلی کی نکڑ پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ مہتاب نے کل شام حرکت کیا کی تھی۔ کہ یُوں محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے آواز دی ہے۔ سامنے دیکھا۔ مہتاب مجھ پر جھکا ہوا اپنی انگلی سے پٹی بندھی آنکھ کے اُوپر پیشانی کھجلا رہا ہے۔

"باؤ چلو گے نا؟"

"کہاں چاچا؟"

"مصری شاہ اور کہاں۔ تجھے پتہ نہیں رات . . . "

"پتہ ہے چاچا! پر یہ خواب والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

مہتاب نے کوئی جواب نہ دیا البتہ اس کے اُوپر کے ہونٹ پر ایک کرن سی پھوٹ گئی۔ جیسے سارا بارُود جل جانے کے بعد انار کے کنارے کچھ ذرّے ہوا کے جھونکے سے یک بیک چمک اُٹھیں۔

مہتاب چلنے لگا اور مَیں اُس کے پیچھے پیچھے قدم اُٹھانے لگا۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

شیشے کی کرچیاں

دلبر اپنی ماں کا دلبر بیٹا تھا۔ باپ تو اُس کی کچھ زیادہ پروا نہیں کرتا تھا کیونکہ اپنے کام دھندے میں مصروف رہنے کی وجہ سے وہ گھر میں صرف رات سو کر گزارتا تھا مگر اُس کی ماں اُسے سارا دن گود میں اُٹھائے پھرتی تھی اور اِس حالت میں سارے کام انجام دیتی تھی۔

ماں دلبر کو اس قدر چاہتی کیوں تھی؟ اِس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ دلبر اپنے بڑے بھائی اکبر کی موت کے تیرہ سال بعد پیدا ہوا تھا۔ اور اکبر کی موت بڑے دردناک طور پر واقع ہوئی تھی۔ وہ کچھ دوستوں کے ساتھ ایک صبح چھٹی کے روز دریا پر نہانے کے لیے گیا تھا اور پھر کبھی واپس نہیں آیا تھا۔ اُس کی لاش پانیوں میں نہیں مل سکی تھی۔ اُس کی بیوی اور دو بچوں کا بوجھ ماں باپ پر ہی آ پڑا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اپنے شوہر کی بے توجہی ——— کے کارن جو خلا زینب کی زندگی میں پڑ گیا تھا اُسے ایک حد تک پُر اسی دلبر نے کیا تھا۔

دلبر کے آنے کے بعد وہ اپنے پہلوٹی کے بیٹے کا حادثۂ مرگ قریب قریب بھول گئی تھی۔ اُسے گود میں اُٹھاتی تھی تو پاگلوں کی طرح چومنے لگتی تھی اور چومتی ہی جاتی تھی۔ دلبر سات سال کا ہوا تو باپ نے اُسے قرآن مجید پڑھنے کے لیے محلّے کی مسجد میں مولوی صاحب کے سپرد کر دیا۔ وہاں اور بھی سات آٹھ لڑکے اور لڑکیاں پڑھتے تھے۔ چھ ماہ تک تو دلبر باقاعدہ مسجد میں جاتا رہا۔ ایک روز مولوی صاحب نے سبق یاد کرنے پر اُسے آدھ پون گھنٹہ مرغا بنائے رکھا، تو دوسرے دن وہ مسجد کے نام پر زار و قطار رونے لگا۔ باپ کے بے

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

را معاملہ ہوتا تو وہ اُسے اُسی حالت میں کان پکڑ کر مولوی صاحب کے ہاں چھوڑ آتا
س کی ماں کی مرضی بھی دخیل تھی۔ اور وہ اپنے چہیتے بیٹے کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ
تی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میاں بیوی میں جو تھوڑی سی کش مکش ہوتی اُس میں زینب نے شوہر
ایس کر دیا اور وہ دلبر کو گھر میں چھوڑ کر بیوی کو گندی گالیاں دیتا ہوا حیدری ریپیرنگ
میں دروازے کے پاس اپنے پُرانے موڑھے پر جا بیٹھا۔

حیدری ریپیرنگ شاپ دلبر کے دادا حیدر علی نے قائم کی تھی اور اُس میں اڑگرد
دیا تمام محلوں کی سائیکلیں ریپیر ہوتی تھیں۔ کام زیادہ ہونے کی وجہ سے مستری شبر علی
ے اور بعض اوقات شام کے بعد بھی مصروف رہتا تھا۔ اُس کی دکان میں دو شاگرد بھی
ا ہاتھ بٹاتے رہتے تھے تاہم کام پُورا نہیں ہوتا تھا۔ اب جو شبر علی نے دیکھا کہ بیوی دلبر
میں بھیجنا نہیں چاہتی اور آئندہ بھی وہ اُسے بھیجے گی نہیں تو دلبر کو بھی دکان پر لے جانے لگا۔
ماں کے لاڈ پیار نے دلبر کو بڑا شرمیلا بچہ بنا دیا تھا۔ دوسروں کے ساتھ بے تکلفی سے
یت کرنا تو الگ رہا ــــــــــــــــــــــــ وہ نارمل طریقے سے
نے میں بھی کافی دقت محسوس کرتا تھا۔ باپ اُسے صبح سویرے بستر سے اُٹھا کر اپنے ساتھ
لے جاتا اور اُس کے سپرد صرف یہ کام ہوتا تھا کہ باپ یا اُس کے شاگرد جو اوزار مانگیں وہ
انہیں دے دے یا کبھی کبھار سائیکل کی ٹیوب میں ہوا بھر دے۔ اُس کے بازوؤں میں
ت نہیں تھی کہ ہوا بھر کر گاہک کو مطمئن کر دے۔ چنانچہ اُس کا ادھورا کام اُس کے باپ کا
اگرد ہی مکمل کرتا تھا۔

دلبر نو برس کا ہوا تو گھر میں اُس کے بھائی یا بہن کا انتظار کیا جانے لگا۔ ماں بہت کمزور
تی۔ نیز طرح طرح کی بیماریوں نے بھی اُس کا لہو چُوسنا شروع کر دیا تھا۔ محلے کی دائی نے
کو مشورہ دیا کہ بیوی کو ہسپتال میں داخل کرا دے۔ اچھے اچھے ڈاکٹر اور ڈاکٹرنیاں علاج
ں۔ گھر میں کیس خراب ہو جائے گا۔ شبر علی کے خاندان میں کبھی کسی عورت کو زچگی کے لیے
ل میں نہیں بھیجا گیا تھا۔ اِس لیے وہ روایت شکنی کے لیے تیار نہ تھا البتہ اُس نے یہ
یا کہ بیوی کو ایک مشہور ڈاکٹرنی کے پاس لے گیا۔ اُسے دس روپے فیس دی اور

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

بائیس روپوں کی دوائیں خرید کر گھر لے آیا۔

زینب تین دن اور تین راتیں تڑپتی رہی۔ چیختی رہی۔ چوتھی رات ایک ننھی سی جان کو دائی کے ہاتھوں میں دے کر بے ہوش ہو گئی اور اُسی بے ہوشی میں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔

نومولود کی پرورش ایک بہت بڑا مرحلہ تھا۔ تاہم شبر علی نے ہمت نہ ہاری۔ اپنی بہو پر پیار کی مقدار دوگنی سہ گنی کر دی تاکہ وہ ماں بن کر بچے کو پالے اور بچہ پلتا رہا اُس کی پرورش میں زیادہ حصہ شبر علی ہی نے لیا لیکن چند سال سے اُس کی صحت بھی مسلسل گرتی جا رہی تھی اور بیوی کی موت کے چار سال بعد وہ بھی چل بسا۔

اصغر چار چار برس کا ہو چکا تھا اور اب اُس کی پرورش کوئی پریشان کن مسئلہ نہیں تھا تاہم اُس کی بھابی انوری جو ایک لحاظ سے اُس کی ماں بھی تھی اُس سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ اُس کے اپنے دو لڑکے تھے جو دلبر کے ساتھ دکان پر جاتے تھے۔ اور گھر آ کر دکان کا سارا حساب کتاب بتا دیتے تھے۔ انوری کے اپنے مستقبل کا سوال درپیش تھا وہ چاہتی تھی کہ دکان سے جو کچھ ملے وہ اُسی کے حصے میں آئے مگر دلبر لاکھ بھلا سہی روپے پیسے کے معاملے میں کافی حد تک ہوشیار تھا۔ ویسے بھی دکان پر زیادہ وقت صرف کرنے کی وجہ سے اُسے خاصا تجربہ ہو چکا تھا اُس کے دونوں بھتیجے مسجد میں قرآن مجید ختم کرنے کے بعد دکان میں آتے تھے۔ اس لیے انہیں کام کا کچھ زیادہ تجربہ نہیں تھا۔

دلبر اپنے باپ کی طرح زیادہ وقت دکان پر ہی صرف کرتا تھا اور روزانہ جو کمائی ہوتی تھی اُس کا بڑا حصہ بھابی کے ہاتھ میں دے کر اپنی ساری گھریلو فرائض داریوں کے معاملے میں بے فکر سا ہو جاتا تھا۔ وہ بھابی کی کسی بات میں بھی دخل نہیں دیتا تھا۔ اصغر اب آٹھ سال کا ہو گیا تھا۔ اور دلبر نے اُسے مسجد میں داخل کرا دیا تھا۔ یونہی لیل و نہار گزر رہے تھے کہ ایک شام دلبر کی ملاقات افضل سے ہو گئی۔ افضل کی سائیکل کا ٹائر پھٹ گیا تھا اور وہ اُس کی مرمت کے لیے دلبر کی دکان پر آیا تھا۔ اُس روز اتفاق سے دکان پر بہت کم گاہک آئے تھے۔ دلبر کو فرصت تھی اس لیے وہ ٹائر کے مرمت ہونے تک افضل سے باتیں کرنے لگا۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

اقات اُسی شام تک محدود رہتی تو کوئی بات نہیں تھی مگر ہوایوں کہ افضل دوسرے
رہاں آگیا۔ تیسرے دن بھی۔ اس طرح دلبر اور اُس کے درمیان قدرے بے تکلفی ہو گئی۔
یہاں تک بڑھا کہ شام کے بعد دونوں ایک ساتھ نوردین حلوائی کے ہاں جانے لگے۔
ر دیر بنچ پر بیٹھ کر برفی یا جلیبیاں کھائی جاتیں اور آدھ پَون گھنٹہ بعد دونوں اپنے اپنے
ں کو روانہ ہو جاتے۔ دلبر اگرچہ افضل سے کافی حد تک بے تکلف ہو گیا تھا تاہم اُسے
وست کے ذریعہ معاش کا قطعی طور پر کوئی علم نہیں تھا۔ نوردین کی دکان پر جا کر مٹھائی عموماً
ی خریدتا تھا۔ اس لیے دلبر کو اس نتیجے تک پہنچنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی کہ افضل
ب میں تھوڑی بہت رقم ہر وقت رہتی ہے اور وہ بڑی بے نیازی سے یہ رقم صَرف کر
ہے۔

ایک روز افضل نے نوردین کی دکان سے اُٹھ کر دلبر کا ہاتھ پکڑ لیا۔
چلو گے؟" اُس نے پوچھا۔
کہاں۔ تمہارے گھر۔ کیوں؟" دلبر نے یہ تینوں باتیں ایک ہی سانس میں پوچھ لیں۔
چلو تو سہی"
اُس شام دلبر زندگی کے ایک ایسے موڑ پر چلا گیا جہاں سے اُس نے ایک بالکل نئے
پر چلنا شروع کر دیا۔
وہ ایک کوٹھڑی جیسا کمرہ تھا۔ آٹھ دس سیڑھیاں طے کرنے کے بعد جب افضل کے
تھ میں اپنا بایاں ہاتھ دیتے ہوئے اُکھڑے ہوئے گرد آلود فرش پر اپنا پہلا قدم رکھا تو
ور سے کھانسی آنے لگی۔ یہ کھانسی اُس دھوئیں کی وجہ سے آئی تھی جس سے اُس کمرے کی
ی ہوئی تھی۔ اُس کی ناک اور آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔

مَیں مر گیا یار۔"
دلبر کے اس فقرے پر افضل زور سے ہنس پڑا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کے آگے لے گیا۔
چند منٹ کے بعد جب دلبر کی حالت ذرا سنبھلی تو اُس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے کی
ڑکی بند تھی۔ کھڑکی کے آگے ایک پھٹی پرانی میلے رنگ والی دری بچھی تھی۔ جس پر تین آدمی

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M, Mazhar Kathia|03037619693

بیٹھے تھے۔ ان میں ایک تو کافی بوڑھا تھا۔ اور باقی دو نوجوان تھے۔ بوڑھے کے ہاتھ میں تاش تھی جسے وہ دلبر کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے برابر پھینٹ رہا تھا۔ پھینٹنے کا انداز بہت حد تک مشینی تھا۔

دلبر ذرا اور آگے بڑھا تو اُس نے تاش والے بوڑھے کو غور سے دیکھا۔ اُس کے چہرے کی ہڈیاں نکلی ہوئی تھیں۔ ناک گدھ کی ناک کی طرح مڑی ہوئی۔ آنکھیں یوں نظر آ رہی تھیں۔ جیسے راکھ کے ڈھیر میں دو جلتے ہوئے کوئلے ہوں۔

دلبر پر پھر کھانسی کا دورہ پڑا اور وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتا ہوا سیڑھیوں کی طرف مڑا۔ مگر افضل کی گرفت مضبوط تھی۔ وہ ہاتھ نہ چھڑا سکا۔

"مر گیا" دلبر کو یہ لفظ حلق سے نکالتے ہوئے بڑی دقت ہوئی۔

"پانی لاؤ"

وہ نوجوان جس کے ماتھے پر ایک سیاہ داغ نظر آ رہا تھا۔ نہ جانے کہاں سے ٹین کے گلاس میں ٹھنڈا پانی لے آیا اور افضل نے اُس کا کنارا دلبر کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ تھوڑی دیر بعد افضل نے اُن تینوں کا تعارف کرایا۔ مڑی ہوئی ناک والا بوڑھا سائیں تھا۔ ایک نوجوان کا نام فضلو تھا۔ اور دوسرے کا اشرف۔

سائیں نے گرم جلیبیوں اور دودھ سے دلبر کی خاطر تواضع کی لیکن جب دلبر دس گیارہ بجے افضل سے رخصت ہو کر گھر جا رہا تھا تو بڑا بیزار تھا۔ دھوئیں کا احساس کر کے بار بار کھانسنے لگتا تھا اور کمرے کے گندے فرش کے خیال آتا تھا تو اُسے کچھ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی قے کر دے گا۔ وہ کپڑے اُتارے بغیر بستر پر گر پڑا۔ سردی کا موسم تھا اور اُس کی بھابی اپنے دونوں لڑکوں کے ساتھ دالان کی دوسری طرف اپنی کوٹھڑی میں سو رہی تھی۔ وہ عام طور پر اُس سے بے پرواہ رہتی تھی۔ اور اُسے پرواہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ دونوں کے حساب کتاب میں طاق تھے۔ دن بھر کی کمائی کا معقول حصہ وصول کر کے ہی گھر کو جاتے تھے۔

دلبر کی طبیعت اور خراب ہو گئی۔ بار بار کروٹ بدلنے کے بعد اُسے شدید پیاس لگی تو بستر سے اُٹھنے لگا۔ مگر ابھی پاؤں جوتوں کے اندر گئے ہی نہیں تھے کہ چکرا کر گر پڑا۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

اصغر اُس سے کچھ دُور اپنی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ اندھیرے میں اُسے کس طرح معلوم ہو
تھا کہ اُس کے بھائی پر کیا گزر رہی ہے۔

نیم غنودگی کے عالم میں اُسے یوں محسوس ہوا جیسے سخت پیاسا ہے اور دُور ایک
ں نظر آ رہا ہے۔ وہ اُس طرف بھاگنے لگتا ہے۔ کنوئیں میں جھانک کر دیکھتا ہے تو وہاں
ں چھوٹی اینٹوں کا انبار لگا ہے۔

تھوڑی دیر بعد اُس کی آنکھ کھُل گئی۔ اُس کے پاس کنستر کے اُوپر لالٹین جل رہی تھی
صغر پانی کا گلاس لیے کھڑا تھا۔

"اصغر!"

"ہاں جی! آپ کو پیاس لگی ہے۔" دلبر نے فوراً گلاس منہ سے لگا لیا اور تین چار لمحوں
بعد اُسے خالی کر دیا۔ خالی گلاس لے کر اصغر اپنی چارپائی تک گیا اور جلد ہی لوٹ آیا۔

"سو رہو جا کر۔"

"آپ بیمار ہیں۔"

"سو رہو۔ ٹھیک ہوں۔" یہ الفاظ سُن کر اصغر چلا گیا۔

صبح کے وقت دلبر کی طبیعت قدرے بہتر تھی۔ وہ دکان پر چلا گیا اور ابھی اُسے بیٹھے
تھوڑا ہی گزرا ہوگا کہ سائیں رومال میں لپٹی ہوئی کوئی شے لے آیا۔ "یار دلبر۔ تو نے تو مجھ پر
ر دیا ہے۔" سے کہا۔ "عیش کر۔" دلبر اُس کے چہرے کو تک رہا تھا کہ سائیں نے رومال کھول
پوریاں تیری ماسی نے پکائی ہیں۔ حلوہ بھی۔ میں نے کہا ہم کھائیں اور ہمارا یار دلبر
ے۔ یار شرم آتی۔ تو دیکھ کیوں رہا ہے۔ اِس طرح۔"

دلبر سوچ رہا تھا کہ اُسے کیا کہے کہ سائیں نے رومال بچھا کر اُس پر پوریاں رکھ دیں۔

"ں جی۔"

"وہ کیوں۔ ہمیں کوئی غیر سمجھا ہے۔"

"ز سائیں جی۔ آپ غیر کیوں ہوں گے بھلا۔"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"تو کرو بسم اللہ۔ مجانہ آئے تو کہنا۔"

دلبر ایک ہی پوری کھا سکا باقی پوریاں اُس نے اپنے دونوں بھتیجوں کو دے دیں۔ سائیں
نے لگا تو اُس سے کہہ گیا: "شام کو آنا بیٹھک پر گھر چلیں گے۔ یارہویں کا ختم ہے سب آئیں گے۔"

دلبر نے اُس دن بہت کم کام کیا اور شام کو اُس کا جی چاہتا تھا کہ گھر جا کر لیٹ جائے کہ افضل
گیا اور وہ اُسے مجبور کر کے پہلے بیٹھک پر اور پھر سائیں کے گھر لے گیا۔ بارہویں کا ختم ہوا۔ بھاتی
بٹی گئی۔ حاضرین کے آگے چائے کے پیالے رکھے گئے اور اُس رات وہ دو بجے گھر پہنچا۔ اصغر
جاگ رہا تھا۔ اُس نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ دلبر لیٹ گیا۔ چند منٹ کے بعد اندھیرے میں
قریب سے اصغر کی آواز آئی: "پا جی۔"

"اصغر۔ کیوں؟"

"پانی۔ پیاس لگی ہے آپ کو۔"

"میں نے کب پانی مانگا تھا؟" اور ان الفاظ کے ساتھ دلبر نے تاریکی میں ہاتھ بڑھا کر
اپنی طرف سے اصغر کو چلے جانے کے لیے کہا۔ ہاتھ گلاس سے جا لگا اور وہ اصغر کے گرتے
کو بھگو کر زمین پر ایک چھناکے کے ساتھ گر کر چکنا چور ہو گیا۔ دلبر کی آنکھوں میں نیند کا غبار
چھا رہا تھا اُس نے گلاس کے ٹوٹنے کی آواز نہ سُنی مگر جب چند منٹ بعد ہانپنے کی آواز اُس کے
کان میں آئی تو وہ جاگ پڑا۔

"کیا ہے حرام زادے؟" اُس نے غصّے سے پوچھا۔

"ہاتھ میں شیشہ چُبھ گیا ہے۔" اصغر نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"یہاں شیشہ کہاں سے آ گیا۔ تیری ماں لاتی ہے!"

"گلاس ٹوٹ گیا ہے۔ اُس کی کرچیں۔"

"گلاس کی کرچیں؟"

"اُٹھا رہا تھا۔ آپ کے پاؤں میں چُبھ جائیں اندھیرے میں۔ آپ پیشاب کے لیے
اُٹھتے نا۔" دلبر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"جاؤ اصغر سو جاؤ۔ میں نہیں جاؤں گا۔ سو جاؤ۔ جاؤ۔ دفع ہو جاؤ۔"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

اصغر چلا گیا۔ دلبر دوبارہ لیٹ گیا۔ اب نیند اُس سے کوسوں دُور ہو چکی تھی۔ وہ سو
چاہتا تھا صرف اُس ذہنی اذیت سے نجات پانے کے لیے جس میں وہ مبتلا ہو گیا
لیکن یہ اذیت ناک کیفیت اُس پر مسلط ہو گئی تھی۔ وہ کروٹ پر کروٹ بدل رہا تھا کہ
ایک لخت احساس ہوا کہ اصغر ہاتھ کے زخمی ہو جانے سے رو رہا ہے۔

"اصغر!"

خاموشی۔

"اصغر!"

پھر خاموشی۔ اُس نے سمجھ لیا کہ یہ محض اُس کا واہمہ تھا۔ اصغر رو نہیں رہا تھا۔ سو یہ کا
ر یہ واقعہ اُس کے ذہن سے دُور ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس کے اندر یہ احساس جاگ اُٹھا
اُس کا بھائی صرف اس وجہ سے بولتا نہیں کہ اس سے اُس کی نیند خراب ہو گی اور وہ
سو نہیں سکے گا۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔ رات گزر گئی۔

"دلبر!" بھابی کی آواز گونجی۔ دلبر سو رہا تھا۔ آواز سُن کر جاگ اُٹھا۔ "گھر میں ڈاکو آ گئے ہیں؟"
نے غصے سے کہا۔

"میرے بیٹے تیرے نوکر نہیں ہیں۔ وہ رات تک دکان پر بیٹھیں اور تو مزے سے ہے سوئے خا
رہے۔ چیزیں لائی ہیں بازار سے۔ ہاں وہ نہیں جائیں گے۔ نوکر سمجھ رکھا ہے میرے
کھائے سارا گھر اور کمائیں وہ"۔ بھابی کہے جا رہی تھی۔

"بک بک بند کر" وہ غصے سے چیخ اُٹھا۔

بھابی بڑبڑاتی ہوئی دروازے میں سے نکل گئی۔ اُس کے جانے کے بعد بھی دلبر اُسے
رہا رہا اور یہ سلسلہ شاید جاری ہی رہتا کہ اُسے اصغر کا خیال آیا وہ اُٹھ کر چارپائی پر بیٹھا
کو پٹی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ دلبر نے دیکھا کہ اُس کی آنکھیں سُرخ ہیں اور جیسے ہی اُس کی
کے ہاتھ پر پڑی۔ جھڑکی ایک سوتی سی لہر اُس کے جسم میں سرایت کر گئی۔ اُس کی انگلیاں
آ رہی تھیں اور کُرتے کا دامن بھی سُرخ تھا۔

کُرتے کا ستیاناس کر دیا ہے

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

اصغر کو بھابی سے ہمدردانہ الفاظ کی توقع تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اُس کا بھائی جب
[اُ]س کی اُنگلیوں کو زخمی اور کُرتے کے دامن پر لہو کے داغ دیکھے گا تو تڑپ اُٹھے گا لیکن اُس کی
[تو]قع کے برعکس وہ کرتے کے خراب ہو جانے پر اُسے ڈانٹ رہا تھا۔ وہ زار و قطار رونے لگا۔
[م]یں نے جیا تو تو نہیں مار دیا، کُتّے کے بچّے!"
اصغر نے رونا بند کر دیا مگر اُس کا بدن بار بار لرز رہا تھا۔ دلبر نے زور سے تھوک زمین
پر ماری اور پاؤں جُوتوں کے اُوپر رکھ دیے۔ ٹوٹے ہوئے گلاس کے ٹکڑے جا بجا پڑے
تھے اور یہ ٹکڑے دلبر کو نظر آ رہے تھے۔ اُس نے پاؤں کو حرکت دی تو اُس کی بھابی اندر آ گئی
اور جیسے ہی اُس کی نگاہ شیشے کی کرچوں پر پڑی وہ چیخ اُٹھی۔ "گلاس توڑ ڈالا۔"
"ہاں۔ پھر کیا ہوا؟" دلبر گرجا۔
"ہوا ہی کچھ نہیں۔ تینوں گلاس توڑ ڈالے۔"
"خرید لیں گے۔ شور کیوں مچا رہی ہے۔"
بھابی نے موضوعِ گفتگو بدل دیا۔ "تو روز روز دیر سے آنے لگا ہے۔ چوری ہو جائے گی۔
پرسوں نواب بیگم......"
دلبر پہلے ہی بیزار بیٹھا تھا۔ بھابی کی لعن طعن اُسے بہت بُری لگی۔ اُس نے دوبارہ تھوکا۔
"صبح ہی صبح لڑنے آ گئی ہو۔ نہ اللہ کا نام نہ محمدؐ کا کلمہ۔"
"تو بڑا اللہ کا نام لیتا ہے۔ سارا دن سائیں کی بیٹھک میں جوا۔"
"میں جوا کھیلتا ہوں تو اپنے پیسے سے۔ تیرے باپ سے نہیں مانگ کر لاتا۔"
"ہوش کر میرے باپ کا نام لیتے ہوئے۔" بھابی آگے بھی کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اصغر چارپائی
سے اُتر آیا۔ بھابی نے پہلی بار اُسے دیکھا۔
"ہائے یہ کیا ہوا؟" بھابی کا اشارہ کرتے کی طرف تھا۔ اصغر نے کوئی جواب نہ دیا۔ بھابی اُس
کی طرف قدم اُٹھانے لگی۔ دلبر نے زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹہ گھر کے اندر گزارا اُس کے بعد وہ
باہر نکل آیا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ دکان پر جانے کی بجائے اُس کے قدم اُسے سائیں کی
بیٹھک کی طرف لے جا رہے تھے۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

سائیں کی بیٹھک کے اُوپر سائیں کا گھر بھی تھا۔ وہ رات کے ایک دو بجے اُوپر جا کر سو جاتا تھا اور اُس کے ساتھیوں میں سے کبھی ایک اور کبھی دو بیٹھک ہی میں کمبل اوڑھ کر پڑے رہتے تھے۔ دلبر وہاں گیا تو اُس نے دیکھا کہ افضل پھٹا پرانا کمبل اوڑھے گھٹنوں میں سر دیے کمرے کے ایک کونے میں بیٹھا ہے اور سگریٹ پی رہا ہے۔ دلبر کو دیکھ کر اُس نے اپنی طرف سے مترنم لہجے میں۔

"ڈال دلبرا سب دا واسطہ ای"

"کیوں واسطے دے رہے ہو صبح ہی صبح"

دلبرا! ادھر آ۔ ہے کچھ جیب میں۔ تجھے ایک بڑی وڈیا خبر سُناتا ہوں۔"

"بہت کچھ ہے جیب میں۔ وڈیا خبر کیا ہے؟"

افضل نے اپنے ہونٹ دلبر کے دائیں کان سے لگا دیے۔ "ایک بیوپاری پھنسا ہے۔ کل سو روپیہ ہار گیا ہے۔ آج بھی آئے گا۔ یاروں کے مزے ہو جائیں گے۔ بس اب جا۔ دس بارہ ان اور سری پائے کا بھرا ہوا پیالہ لے آ۔"

دلبر کو سخت بھوک لگی تھی۔ فوراً سیڑھیوں سے نیچے اُتر گیا۔

وہ سارا دن دلبر نے سائیں کی بیٹھک ہی میں گزار دیا۔ ایک بار بھی دکان پر نہ گیا۔ اُس کی جیب میں دس بارہ روپے باقی رہ گئے تھے وہ دودھ مٹھائی پان اور سگریٹوں کی خریداری میں اُڑ گئے تھے اور اب اُس کے کُرتے اور واسکٹ کی تینوں جیبیں بالکل خالی تھیں۔

وہ رات کے دس بجے گھر پہنچا۔ سیدھا اپنے کمرے میں گیا۔ اصغر لیٹا ہوا تھا اور بھابی پاس بیٹھی تھی۔ "اب کیا ضرورت تھی آنے کی؟"

بھابی کے اس فقرے نے دلبر کے دل میں پہلی چنگاری چھوڑ دی مگر اُس نے ضبط سے کام لیا اور ہاتھ منہ دھونے کے لیے کمرے سے نکل گیا۔ جب واپس آیا تو بھابی بڑبڑا رہی تھی۔ "اللہ ایسا جلاد بھائی کسی کو نہ دے۔ لڑکے کو نمونیہ ہو گیا ہے اور یہ مزے سے جُوا کھیل رہا ہے۔" بھابی نے اُسے سُنانے ہی کے لیے یہ فقرہ کہا تھا۔ "کیا بکواس کرتی ہے؟"

"میں بکواس نہیں کرتی۔ ڈاکٹر کہتا ہے۔ حالت بڑی خراب ہو گئی ہے۔ ڈبل نمونیہ

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ہے۔ پھر تجھے کیا؟"

دلبر بھابی پر برسنے ہی والا تھا کہ اصغر کا ہاتھ ایک لمحے کے لیے فضا میں لہرا کر چھاتی پر گر پڑا۔ دلبر اس پر جھک گیا۔

"یار جی!"

دلبر نے سر ہلایا۔

اصغر کی بڑی کمزور سی آواز دلبر کے کان میں آئی۔

"د۔ دائی!"

"یہ جواری یا دوائی لائے گا تیرے لیے؟" بھابی نے طعنہ زنی کے لیے موقعے سے فائدہ اٹھایا۔

دلبر نے بھابی کو خونخوار نظروں ہی سے دیکھنے پر اکتفا کیا۔ وہ ایک منٹ بھی وہاں نہ رکا اور واپس بیٹھک میں آ گیا۔

فضا میں شراب کی بُو رچی ہوئی تھی۔ ایک طرف خالی بوتلیں پڑی تھیں، تھالیوں میں بچے کھچے نان اور کباب نظر آ رہے تھے۔ اور بیٹھک آدمیوں سے بھری ہوئی تھی۔ بیوپاری اور اس کے دو ساتھی بڑے انہماک سے تاش کے پتے پھینک رہے تھے۔ اُن کے اِرد گرد سائیں اور اُس کے آدمیوں نے حلقہ سا بنا رکھا تھا۔

دلبر سائیں کے پاس گیا۔ جھکا اور اُس کے کان میں کہا:

"سائیں کچھ روپے!"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ صبر کر ذرا۔ بازی ہو جائے۔" دلبر بیٹھ گیا۔ ایک بازی، دوسری بازی، تیسری بازی، بازی پر بازی ہوتی رہی اور رات گزرتی رہی۔ دلبر جب بھی سائیں کے کان میں کھسر پھسر کرتا تھا سائیں صرف ایک ہی جواب دیتا تھا: "یار ذرا صبر کر نا۔ بازی ہو جانے دے۔"

صبح جس وقت مسجد کے مینار سے مؤذن نے اذان دی تو جواریوں کے حرکت کرتے ہوئے ہاتھ رک گئے۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

اذان ختم ہوئی تو سب نے کلمہ پڑھا۔ دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے اور سائیں نوٹوں سے بھری ہوئی جیبوں کے ساتھ سیڑھیوں سے نیچے اُترنے لگا۔ اُس کے آدمی بھی جانے لگے۔ بیوپاری اور اُس کے ساتھی پہلے ہی جا چکے تھے وہاں صرف افضل رہ گیا۔

"افضل کچھ پیسے دو۔"

"کتنی رقم چاہیے۔ سو۔ دو سو۔ تین سو۔"

"پندرہ بیس روپے۔"

"سائیں ابھی آجاتا ہے۔ وہ دوسرے گھر میں گیا ہے۔"

افضل اُسے بتانے لگا کہ جب سائیں کی جیبیں بھر جاتی ہیں تو وہ اپنی دوسری بیوی کے گھر میں چلا جاتا ہے۔ اس بیوی سے اُسے بڑی محبت ہے۔"

دو گھنٹے بیت گئے۔ افضل گرم نان اور پکوڑے لے آیا۔ دونوں نے ناشتہ کیا۔ ناشتے کے بعد افضل بولا۔ "مَیں سائیں کو بلا کر لاتا ہوں۔ ٹھیک ہے نا؟"

"جلدی آجانا!" افضل نے چٹکی بجائی اور چلا گیا۔ آدھ پون گھنٹہ گزر گیا تو دلبر ساری رات جاگنے کے کارن لیٹ گیا۔ روشندانوں سے چمکیلی دھوپ آرہی تھی۔ کمرہ گرم ہو گیا تھا۔ دلبر کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو گئیں اور پھر بند ہو گئیں۔

تین بجے کے قریب وہ جاگا۔ کمرے میں افضل کے ساتھ کچھ ایسے لوگ بیٹھے تھے جنہیں وہ جانتا نہیں تھا مگر وہ سمجھ گیا کہ افضل انہیں گھیر گھار کر لے آیا ہے اور اب جوئے میں انہیں لُوٹا جائے گا۔ اس سے پیشتر کہ دلبر افضل سے سائیں کے بارے میں کوئی سوال کرے افضل کہنے لگا "سائیں آرہا ہے۔ مَیں نے اُس سے کہہ دیا تھا۔"

سائیں آگیا۔ اور دلبر کو دیکھ کر چٹکی بجا کر اجنبیوں سے اُن کا حال چال پوچھنے لگا۔ محبت آمیز باتیں ہوتی رہیں۔ اور پھر سائیں کے تجربہ کار ہاتھ تاش کے پتے پھینٹنے لگے۔ ایک بازی ختم ہوتے ہی دوسری بازی شروع ہو جاتی۔

ساری رات بیت گئی۔ دن چڑھا۔ دھوپ چمکتی رہی۔ پھیلتی رہی۔ روشندانوں کے رستے سے کمرے کے اندر آکر جواریوں کے چہروں پر اُن کی اندرونی کشمکش کے اثرات کو

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

زیادہ نمایاں کرنے لگی۔ بکتوں کی ڈھیریاں ادھر سے اُدھر، اُدھر سے ادھر حرکت کر رہی تھیں۔ دھوپ میں سگرٹوں کا دھواں باریک باریک خطوط میں پھیل رہا تھا۔ یہاں تک کہ گیارہ بج گئے۔ کچھ جیبیں خالی ہو گئیں۔ کچھ جیبیں بھر گئیں۔ اب کے سائیں خوش دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اُس کی محنت بار آور نہیں ہوئی تھی۔

جس وقت سب چلے گئے تو سائیں اُوپر جانے لگا۔ یکایک اس کی نظر دلبر پر پڑی۔ وہ چلتے چلتے رُک گیا۔ اور دو منٹ بعد اُس کی بند مٹھی دلبر کی واسکٹ کی بائیں جیب کی طرف بڑھنے لگی۔ پھر اُس نے آنکھ کے اشارے سے دلبر کو جانے کے لیے کہا اور اُوپر جانے لگا۔ دلبر نے جیب میں ہاتھ ڈال کر یہ بات معلوم کرنے کی کوشش نہ کی کہ سائیں نے اُسے کیا دیا ہے۔ وہ گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہ دروازے پر پہنچا تو دیکھا کہ محلّے کے چند آدمی کچھ دُور کھڑے اُسے خاص نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ اندر گیا۔ سامنے چارپائی پر اصغر سفید کفن میں لپٹا پڑا تھا۔ وہ آگے قدم نہ اُٹھا سکا۔ وہیں رُک گیا۔

اُس کی بھابی کی آواز آئی۔ "اصغر اُٹھ! تیرا بھائی تیری دوائی لے کر آیا ہے۔"

دلبر کو یوں محسوس ہوا جیسے ایک نشتر اُس کے دل میں چُبھ گیا ہے۔ وہ وہیں کھڑا تھا۔ کھڑا رہا۔ بے حرکت، جامد۔ ایک پتھر کی طرح۔ اُسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ کس وقت وہ مُڑا تھا اور کس وقت اُس نے دروازے کے باہر قدم رکھا تھا۔

سائیں کی بیٹھک کے نیچے پہنچ کر وہ ایک بار پھر رُک گیا۔ بیٹھک میں لوگ جمع ہو گئے تھے۔ مسلسل آوازیں نیچے آ رہی تھیں۔

ایک تانگہ آہستہ آہستہ اُس کے قریب سے گزر گیا۔ ایک سائیکل سوار نے ٹن ٹن گھنٹی بجائی۔ ایک چھوٹی سی لڑکی جو تنور سے روٹیاں لگوا کر آ رہی تھی سر پر تھال اُٹھائے ایک ہاتھ کی مدد سے گنا چُوس رہی تھی۔ سامنے نور دین حلوائی کی دکان کے تھڑے کی دائیں جانب علیا موچی کسی کے پشاوری چپل پالش کر رہا تھا۔ ایک آدمی نیچے آیا اور اُسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ "دلبر! یار کیا ہوا اُوپر چل۔"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"نہیں۔"

"دال دلبرا رب دا۔۔۔"

"تیری ماں کا واسطہ۔"

وہ شخص اور حیران ہو گیا۔ وہ دلبر کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ دلبر ایک طرف جانے لگا۔
وہ چلا جا رہا تھا۔ کسی منزل کا تعین کیے بغیر چلتے چلتے سورج ڈوب گیا تھا اور شام
تھی۔

وہ میکلوڈ روڈ پر تھا۔ اور سٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔ بغیر ارادے کے اُس نے جیب میں
ا۔ اس کی انگلی ایک پڑیا سے چھوئی۔ اُس نے پڑیا باہر نکالی۔ یہ ایک پانچ کا مڑا تڑا نوٹ
ٹ دیکھ کر اُس کے چہرے پر ایک خندۂ استہزاً در آیا اور اُس نے نوٹ پھاڑ کر پھینک دیا۔
او دلبرا۔" ایک تانگہ اُس کے پاس آکر رُک گیا تھا۔ دلبر نے دیکھا تانگے کا کوچوان اُس کے
پرانا دوست نبی بخش ہے جسے وہ چاچا کہا کرتا تھا۔
دلبرا کدھر جا رہے ہو۔ یار کبھی ملے ہی نہیں۔ تمہارا باپ کیا مرا ہم بھی تیرے لیے مر گئے۔
یا حال ہے؟"

مر گیا۔"

"صغرا مر گیا دلبرا۔"

دلبر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ب مرا؟"

دلبر نے اُس کے جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ نبی بخش کہنے لگا: "اچھا یار۔ اُس کے
تا ہی نہ چلا۔ سب ٹر جائیں گے دلبرا۔ کیا غم کرنا۔ بیٹھ تانگے میں۔ چل میرے ساتھ گھر
وں کی چھاؤں میں نکلا تھا۔ گھر جا رہا ہوں۔ میرے مولا نے چاہا تو ایک آدھ پھیرا اور
ے گا۔" نبی بخش اُسے ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا مگر دلبر وہیں کا وہیں کھڑا تھا۔
برا چلو گے نہیں میرے گھر؟" اُس نے پوچھا۔

"ں پرسوں سہی۔"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"تمہاری مرضی۔ میرے گھر کا پتہ ہے نا؟ گجر سنگھ میں" نبی بخش نے گھوڑے کی پشت پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے "چل میرے شیرا" کہا اور گھوڑا اُونچی چال چلنے لگا۔ اُس وقت اُسے یاد آ گیا کہ لنڈا بازار میں اُس کے باپ کا ایک پرانا دوست رہتا ہے اور وہ اُدھر جانے لگا۔

کریم بخش اُستاد کریم بخش کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ پتنگیں اُڑانے اور پیچ لڑانے میں بڑا ماہر تھا اور یہ شوق اُس کے لیے ذریعۂ تفریح بھی تھا اور ذریعۂ معاش بھی۔ ذریعۂ معاش اس بنا پر کہ وہ خوبصورت پتنگیں بنا کر انہیں بیچ دیتا تھا۔ پتنگ باز اُس کی منہ مانگی قیمت ادا کر کے پتنگیں خرید لیتے تھے اور جمعہ کے روز تیسرے پہر منٹو پارک میں کئی اُستاد اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اُستاد کریم بخش بھی بیس پچیس پتنگیں اور ڈور کے تین چار بڑے بڑے پنے لے جاتا تھا۔ وہ خود تو ایک آدھ پیچ ہی لڑاتا تھا مگر جہاں کہیں بھی اُس کا کوئی شاگرد کسی مشکل میں پھنس جاتا تھا تو اُستاد فوراً اُس کی مدد کو پہنچ جاتا تھا۔

دلبر جب بچہ تھا تو باپ کے ساتھ کئی بار اُس کے گھر گیا تھا۔ اور اُسے تین چار بار منٹو پارک میں بھی جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ باپ کی موت کے بعد وہ اُس کے ہاں نہیں گیا تھا۔ بچپن کے زمانے میں اُستاد اُس پر بڑا مہربان رہا تھا۔ اس لیے وہ بلا کسی تامل کے اُس کے گھر ہی کی طرف جا رہا تھا۔

جب دلبر اُس کے گھر کے سامنے پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ ڈیوڑھی میں ایک بوڑھا آدمی میز کے پاس بیٹھا ہے۔ میز کے اُوپر رنگا رنگ کاغذ اور بانس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پڑے ہیں اور وہ ایک ٹکڑے کے سرے کو چاقو سے چھیل رہا ہے۔ دلبر نے ڈیوڑھی سے چند قدم اِدھر رُک کر کہا: "سلاماں لیکم چاچا!"

اُستاد نے نظر اُٹھا کر دیکھا۔ اپنی آنکھوں کے اُوپر ہاتھ رکھ لیے۔ وہ دلبر کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا۔

"کون ہے؟"

دلبر فوراً آگے بڑھ گیا: "میں ہوں دلبر"

"دلبر۔ ہے دلبر کون؟"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

اُستاد کے ہاتھ ابھی تک اُس کی آنکھوں پر سایہ کیے ہوئے تھے۔

"مستری شبر علی کا بیٹا۔"

"مستری۔ شبر علی۔ تو اُس کا بیٹا ہے۔ آ جا۔ تیرا باپ میرا بہت اچھا دوست تھا۔ مر گیا۔
ر ابہو سفید ہو گیا۔ کبھی آیا نہیں۔ کبھی پوچھا نہیں تیرا چاچا کس طرح زندہ ہے۔ بینائی
ن ہے۔ کہیں جاتا آتا نہیں۔ یہ کام کر کے روٹی کما لیتا ہوں۔ تو سُنا۔ تیرا کیا حال ہے۔
ل رہی ہے؟" اُستاد نے بیک وقت کئی باتیں کہہ دی تھیں۔ "آ جا اندر۔" دلبر ڈیوڑھی
کا تھا۔

اُسی شام دلبر نے اُستاد کو اپنی ساری کہانی سُنا دی اور اُستاد یہ کہانی سُن کر بولا: "تو بھی اپنا
یہ تیرا گھر ہے۔ میں تیرے لیے دکان کا انتظام کر دوں گا۔ فکر نہ کر۔" مگر دلبر کے لیے ایک
ت ضرور تھی۔ اُستاد کی اپنی بیوی فوت ہو چکی تھی لیکن اُس کی ستائیس سالہ بیوہ لڑکی بھتے
جلتی تھی اُس کی آمد پر کچھ خوش دکھائی نہیں دیتی تھی۔ تاہم اُس نے اعتراض نہ کیا۔
رہی۔

دلبر پتنگیں بنانے میں اُستاد کی مدد کرنے لگا۔ آمدنی میں قدرے اضافہ ہو گیا اور اُس
ند ساتھ بر کتے کا رویہ بھی تبدیل ہو رہا تھا۔ وہ اب دلبر کو دیکھ کر ناک بھوں نہیں
ستی۔

اُستاد کو صرف دو موضوع سے دلچسپی تھی۔ ایک دلچسپ موضوع تھا پیچ لڑانے
ہے۔ اُستاد اِس معرکے کی کارروائی بتاتے وقت دونوں بانہوں کو بڑی تیزی سے لہرا لہرا کر
کے پیچ و خم بتاتا تھا۔ "نور محمد مانا ہوا اُستاد تھا۔ بڑے بڑے اُستادوں کو ہرا چکا تھا۔
سے پیچ لڑانے کا چیلنج دے دیا۔ شاگرد بولے۔ اُستاد کیا کرتے ہو کیوں عزت گنواتے
ند کی نظر عقاب سے زیادہ تیز ہے۔ مانجھا لگانے میں بڑی محنت کرتا ہے۔" میں نے
ب کچھ ٹھیک ہے پر دیکھو تو ہوتا کیا ہے۔" اُستاد ذرا رُک کر سانس درست کرتا اور
جمعہ کی شام کو بڑے بڑے کھلاڑی اُستاد آ پہنچے۔ ہزاروں لوگ آ گئے۔ میرے شاگرد
لے رنگ کی پتنگ چھوڑی۔ میں نے نور محمد سے کہا۔ "آ گیا ہے میرا کالا دیو۔ نکالو

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

اپنی لال پری ہے۔ نوردین بولا۔ "لال پری نہیں۔ لال دیو۔" اُس کی پتنگ کا رنگ لال تھا۔ بس ہو گیا مقابلہ۔ پانچ منٹ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ لال دیو کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ نوردین نے لاکھ سنبھالنے کا جتن کیا پر کاٹ دیا میں نے۔ "وہ مارا!" میرے شاگردوں نے نعرہ مارا۔ سارے شہر لاہور میں دھوم مچ گئی۔ وہ دن اور آج کا دن نور محمد پنڈی سے لاہور آتا ہے تو پہلے یہاں آکر سلام کرتا ہے۔" یہ موضوع ختم ہو جاتا تو اُستاد خاموش ہو جاتا کیونکہ جب وہ دوسرا موضوع چھیڑ تو اُس کی حالت بدل جاتی۔ وہ سارا جوش و خروش ختم ہو جاتا۔ اُس کی آواز میں گہری افسردگی دَر آتی۔

"میری اِس دھی نے مجھے مار ڈالا ہے۔ اِس کے بیاہ پر سارا جمع جتھا خرچ کر دیا پر اُلٹا لمبی آہ بھرتا۔" اللہ کو یہی منظور تھا۔" برکتے پاس بیٹھی ہوتی تو منہ دوسری طرف پھیر لیتی۔ "اِس کا غم کھائے جا رہا ہے اندر ہی اندر۔ دُعا کرتا ہوں مولا میرے! بھیج کوئی کرماں والا جو اِس کا ہاتھ پکڑ کر مجھے بے فکر کر دے۔ سال پر سال گزر رہے ہیں اب اِس کی عمر سات اُوپر بیس برس ہو گئی ہے۔" برکتے باپ کے یہ لفظ سُنتی تو سبزی بناتے بناتے اُس کے ہاتھ رُک جاتے۔ ترکاری والی پرات اُٹھا کر چلی جاتی۔ اُستاد کو اُس کی حرکت کا علم نہ ہوتا۔ دیکھ اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہتا۔ برکتے کا رویہ آہستہ آہستہ بدل رہا تھا۔ وہ دوسرے تیسرے دن دِلبر سے کہتی:

"ہائے اللہ کتنے گندے کپڑے ہیں۔ اُتار دو۔"

"کیوں اُتار دوں؟"

"اُونچا سنتے ہو۔ کہتی ہوں گندے ہو گئے ہیں۔" برکتے گندے کے لفظ پر خاص زور دیتی۔

دِلبر کو روٹی دیتے وقت وہ روٹی کے اُوپر مولی کاٹ کر اُس کے چند ٹکڑے رکھ دیتی۔ اُس کے پیالے میں ہانڈی کے اُوپر کا سالن ڈالتی۔ ایک روز کہنے لگی "دِلبر جی

"جی برکتے بیگم۔"

"برکتے بیگم [illegible]"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

پھر کیا ہو؟"

پتا نہیں کیا ہوں۔ گجریلا کھاؤ گے؟"

دلبر کے منہ میں پانی بھر آیا۔ گجریلا اُس کی کمزوری تھی۔ ماں زندہ تھی تو ہر روز گھر میں دو تین
آجاتی تھیں۔ کبھی گاجر کا حلوہ بنتا تھا اور کبھی گجریلا۔ دلبر کو ماں یاد آگئی۔ گھر یاد آگیا اور
میں کھو گیا۔ پھر یکایک اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے ہاتھ میں شیشے کی کوئی
ہو گئی ہے۔ برکتے اُسے غور سے دیکھ رہی تھی۔

گجریلا پسند نہیں دلبر علی؟"

دلبر اثبات میں سر ہلانے لگا۔

لاؤں؟"

دلبر خاموش رہا۔ برکتے اپنے لنگڑے پن کے باوجود تیزی سے باورچی خانے میں گئی
واپس آئی تو اُس کے ہاتھ میں ایک تھالی تھی گجریلے سے بھری ہوئی؟ "کھالو دلبر علی"۔
اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیاں گجریلے میں ڈبو دیں اور کچھ سوچنے لگا۔ اُس نے محسوس
برکتے بڑے غور سے اُس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ "کھاتے کیوں نہیں؟" دلبر کھانے لگا۔
برکتے نے بننا سنورنا شروع کر دیا تھا۔ باپ سے پیسے مانگ کر محلے کی ایک لڑکی کے
چنبیلی کا تیل منگواتی۔ بالوں میں لگاتی۔ شیشہ سامنے رکھ کر کنگھی کرتی۔ روز آنکھوں میں سرمہ
گالوں پر پوڈر کی تہ جماتی۔ دلبر کام میں مصروف ہوتا تو ڈیوڑھی میں آکر کہتی:

دلبر علی! بھوک نہیں لگی؟"

نہیں!"

کب کھاؤ گے؟"

کھاؤں گا۔"

اُس کے پاس میز کے اوپر بیٹھ جاتی۔ دلبر گھبرا کر کہتا: "دیکھتی نہیں ہو۔ کپڑوں پر پینٹ لگ

نہیں لگتی۔ اور لگے گی تو میرے کپڑوں کو لگے گی تجھے کیا۔ ہے نا دلبر علی! تجھے کیا؟" اور

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

وہ اپنی بانہہ کو یُوں لہراتی کہ چوڑیاں بج اُٹھتیں۔ دِلبر اپنے کام میں مصروف رہتا۔ برکتے باتیں کرتی رہتی۔ کرتی چلی جاتی اور وہ صرف ہوں ہاں کہنے پر ہی اکتفا کرتا۔ جب تنگ آجاتی تو رُوٹھنے کے سے انداز میں کہتی: "تو تو گونگا ہے۔ کون سَر کھپائے تجھ سے۔ میں جا رہی ہوں" وہ ذرا دُور جا کر رُک جاتی اور پھر چلی جاتی۔

بسنت کی آمد آمد تھی۔ دِلبر رات کو دیر تک کنکوے اور پتنگیں تیار کرتا رہتا۔ اُس شام ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اُستاد سِراف اوڑھ کر سو چکا تھا۔ دِلبر اپنی چارپائی پر میز رکھے کام کر رہا تھا۔ اُس کے پاؤں کے پاس اَنگیٹھی میں کوئلے جل رہے تھے۔ ابھی آدھی رات نہیں گزری تھی اور اُس کا سر جُھکا ہوا تھا۔ اتنے میں اُس نے دیکھا کہ ایک سایہ آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اُس نے سر اُٹھا کر دیکھا سامنے برکتے کھڑی تھی اور اُس نے ہاتھ میں شیشے کا گلاس تھام رکھا تھا۔ "تھک گئے ہو دلبر علی۔ دودھ" دلبر کی نظر گلاس پر جم کر رہ گئی تھی اور برکتے اُسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ اِس حیرت میں وہ اپنا فقرہ بھی مکمل نہیں کر پائی تھی۔

"دلبر علی!"

دلبر کی اب تک وہی کیفیت تھی۔

"دودھ پی لو۔ تھک نہیں گئے؟"

"نہیں" دلبر نے نہیں کا لفظ اتنے زور سے کہا کہ برکتے بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"برکتے! تم مجھے کیوں تنگ کرتی ہو؟"

"میں تنگ کرتی ہوں؟"

"ہاں۔ میں تنگ آگیا ہوں۔ تجھے کچھ خیال ہی نہیں آتا۔"

برکتے کی آنکھوں میں بلا کی مایوسی اُبھر آئی۔ وہ دلبر کو دیکھ رہی تھی اور دلبر نے منہ پھیر لیا تھا۔ اُس نے قینچی اُٹھائی اور سبز رنگ کے ایک لمبے چوڑے کاغذ کو درمیان میں سے کاٹنے لگا۔ برکتے ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔

"دِل۔ بر۔ علی!"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

دلبر نے اُس پر ایک نگاہِ غلط انداز بھی نہ ڈالی۔ برکتے واپس جانے لگی۔ پھر رُک گئی۔

"میں لنگڑی ہوں نا۔ بدصورت ہوں نا۔ ہیں۔ ہیں"

"تم بلا ہو۔ چڑیل ہو"

برکتے تیز قدموں سے اندر چلی گئی۔ دلبر دیوار سے ٹیک لگا کر سو گیا۔ ابھی اندھیرا ہی تھا کہ اُس کی آنکھ کھل گئی۔ اُستاد کھوں کھوں کر رہا تھا۔ برکتے شاید آگ جلا کر اُس کے حُقّے کا انتظام کر رہی تھی۔ دلبر اُٹھ بیٹھا اور آہستہ آہستہ قدم اُٹھا کر باہر نکل آیا۔ اُس نے اُوپر دیکھا کہیں کہیں ستارے کانپ رہے تھے۔ سیاہ بادلوں نے دُور افق کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اب وہ قلعہ گوجر سنگھ کی ایک گلی میں چلا جا رہا تھا۔ یک لخت بدبو کا ایک بھبکا اُس کی ناک میں گھُس آیا۔ اُس کے سامنے ایک جھنگبرا گھوڑا بندھا تھا۔ "چاچا!" اُس نے ایک دروازے کے اُوپر پڑے ہوئے میلے ٹاٹ کے سامنے کھڑے ہو کر آواز دی۔

"کون اے؟" کھانسی کے زیر و بم میں سے غصیلی آواز اُبھری۔

"میں چاچا!"

"کُنڈی کھلنے کی آواز آئی۔ ٹاٹ سرکا دیا گیا اور نبی بخش دائیں ہاتھ سے آنکھیں ملتا ہُوا باہر ہُوا۔

"تم لوگ رات کو بھی نہیں سونے دیتے۔ نو بجے نکلوں گا۔"

"چاچا! میں کوئی سواری نہیں"

"اوئے دلبرا جانی"

"چاچا"

نبی بخش نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اندر لے گیا۔ "سُنا یارا۔ کیا حال چال ہے"

"چاچا! مجھے نوکر رکھ لے"

"نوکر! او بدماشا! تیری عقل کا سیکل پنچر ہو گیا ہے۔ او پاگلا! یہ تیرا گھر ہے میرا بیوی بچہ نہیں۔ میرا پُتر بن کے رہ"

"چاچا! تیری مہربانی"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"مہربانی وانی کوئی نہیں۔ ناشتہ کیا کرے گا۔ میں تو چار پانچ گرم گرم کلچے چکڑ چھولوں کے ساتھ کھاتا ہوں۔ اُوپر سے چائے کا پیالہ۔ دو بجے تک پیٹ بھرا رہتا ہے۔ تو سنا۔"

"میں ایک آدھ کلچہ۔ بس۔"

نبی بخش گھر سے نکل گیا۔ دلبر نے کمرے کا جائزہ لیا۔ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جس میں اتنا سامان پڑا تھا کہ چلنے پھرنے کے لیے راستہ بنانا مشکل تھا۔ درمیان میں ایک چارپائی بچھی تھی اور چارپائی کے اُوپر میلے کپڑوں کا ایک انبار پڑا تھا۔ برتن بھی اُسی چارپائی کے اُوپر پڑے تھے۔ "یہ سوتا کہاں ہوگا؟" دلبر نے خود سے سوال کیا۔ وہ بیٹھ گیا۔ اِس انداز میں کہ گھٹنے چھاتی سے آلگے تھے۔ اُس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ اچانک اُس کے کان سے کوئی گرم شے لگی۔ گھبرا کر اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ پیکیٹ پر دس بارہ کلچے پڑے تھے اور نبی بخش ایک پیالے کا دودھ ایک دیگچی میں ڈال رہا تھا۔

دلبر، نبی بخش کے ہاں رہنے لگا۔ رات کو وہ چارپائی پر اور نبی بخش چارپائی کے نیچے گدیلا بچھا کر لیٹ جاتا۔ بازار سے سودا سلف لانا۔ ہانڈی پکانا۔ تنور سے روٹیاں خرید کر لانا۔ اور گھوڑے کی خدمت کرنا جسے نبی بخش ٹہل سیوا کہتا تھا۔ یہ سارے کام دلبر کے ذمے تھے اور وہ یہ ذمے داریاں بخوبی پوری کر رہا تھا۔ نبی بخش اُس کے آنے پر بہت خوش تھا اُس کا کافی بوجھ دلبر نے اُٹھا لیا تھا۔ ہوتے ہوتے دلبر کوچوانی بھی کرنے لگا۔ شروع شروع میں وہ یہ کام کرتے ہوئے ڈرتا تھا مگر نبی بخش نے اُس کی ہمت بندھائی تو اُس کا خوف بہت حد تک دُور ہوگیا۔ اب ایک دن نبی بخش تانگہ لے جاتا تھا اور ایک دن وہ۔ یا صبح سے لے کر دو بجے تک نبی بخش کوچوانی کرتا تھا اور رات کے گیارہ بارہ بجے تک یہ فرض دلبر ادا کرتا تھا۔ ایک روز اُس کی ڈیوٹی دن کے دو تین بجے تک تھی۔ صبح سے اُس نے صرف تین پھیرے لگائے تھے اور وہ بھی دو تین میل کے اندر اندر۔ گیارہ بجے کے قریب وہ لوہاری دروازے کے باہر لاریوں کے اڈے پر چلا گیا۔ یہاں سے سواریاں آسانی سے مل جاتی تھیں۔ ایک لاری نہ جانے کہاں سے آئی تھی۔ اُس میں سے لوگ اُتر رہے تھے۔ "چلو ٹیشن" وہ پکارنے لگا۔

"دلبر علی؟" اُس نے بائیں طرف مڑ کر دیکھا۔ برگد کے کھڑی تھی۔ اُس کے سر کے بال گرد آلود

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

تھے۔ آنکھوں کے نیچے گڑھے سے پڑ گئے تھے۔ گالوں کا رنگ بالکل پیلا ہو چکا تھا۔ کپڑے اس قدر میلے تھے کہ لگتا تھا کم از کم پندرہ دن سے انہیں دھویا نہیں گیا۔

"مجھے بھول گئے دلبر علی۔"

دلبر نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"پوچھو تو مجھ پر کیا بیتی دلبر علی!" دلبر نے کوئی سوال نہ کیا۔ برکتے خود ہی کہنے لگی۔

"ابا مر گیا۔ تمہارے جانے کے دس روز بعد اس کا دم اُٹھ گیا۔ مر گیا۔ پر دلبر علی۔ تو چلا کیوں گیا تھا۔ تجھے کس نے ستایا تھا۔ دلبر علی! ابا تو تیرا بڑا خیال رکھتا تھا۔ میں۔ میں تجھے اچھی نہیں لگتی تھی تو کیا ہوا۔ تو چلا ہی گیا۔ کیوں دلبر علی!"

دلبر اُسے دیکھ رہا تھا۔ برکتے نے دیکھا کہ اُس کے منہ سے ایک لفظ تک نہیں نکلا تو وہ کہنے لگی۔

"ابا کے مرنے کے بعد میں کیا کرتی۔ ایک عورت اکیلی کیونکر جیون بتا سکتی ہے۔ نہ کوئی سہارا نہ کوئی آسرا۔" اس کی آواز رُندھ گئی۔

"میرا خالو مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ کبھی کبھی لاہور آ جاتی ہوں۔ میری ایک سہیلی ہے۔ زینو کو تو جانتا ہے نا۔ جن کے گھر سے روز ہمارے ہاں لسی کا بھرا ہوا ڈول آتا تھا۔ میں اس سے ملنے کے لیے آتی ہوں۔ مل کر واپس جا رہی ہوں۔ پتا ہے میں کہاں رہتی ہوں۔"

دلبر کا نفی میں سر ہلا۔

"شیخوپورہ کے گاؤں سبحان پورہ میں۔ وہاں نہر ہے۔"

"اے میاں کوچوان! چلو گے نہیں۔"

سٹیشن کی سواریاں اُس کے تانگے میں بیٹھ چکی تھیں۔ اور اُسے اس طرح باتیں کرتے دیکھ کر بے قرار ہو رہی تھیں۔ ایک تنتلیق قسم کا بزرگ کچھ زیادہ ہی بے قرار نظر آتا تھا۔

"آتا ہوں۔" دلبر نے اُس بزرگ کو مخاطب کر کے کہا۔

"میں وہاں ہوتی ہوں دلبر علی!"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"اچھا۔"

"دلبر علی" دلبر نے دیکھا اُس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ وہ آنکھیں بار بار جھپک رہی تھی۔ شاید وہ آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ تانگے کی طرف جانے لگا۔ برکتے کھڑی رہی۔ دلبر نے غیر ارادی طور پر اُسے دیکھا۔ اُس کی آنکھوں کے نیچے گڑھے اور گہرے ہو گئے تھے۔ پلکیں جیسے کسی بوجھ سے دبی جا رہی تھیں۔ گال اُس کاغذ کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ جو پانی میں بھیگ گیا ہو۔

سواریاں اُسے جلدی چلنے کے لیے کہہ رہی تھیں۔ وہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ گھوڑا چلنے لگا۔

"اے میاں کوچوان!" بزرگ بولا "وہ عورت تیری کیا لگتی ہے۔ وہیں کھڑی ہے۔ اِدھر ہی دیکھ رہی ہے۔ بیوی ہے شاید۔ اِس سے روٹھ گیا ہے۔"

تانگے میں بیٹھی ہوئی ایک موٹی عورت زور سے ہنس پڑی۔

اُس نے گھوڑے کو چابک دکھائی اور تانگہ تیزی سے آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہ خاموش بیٹھا تھا۔ سواریاں آپس میں نہ جانے کیا باتیں کر رہی تھیں۔ موٹی عورت بار بار کیوں ہنس رہی تھی۔ وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ سواریاں اُتر گئیں۔ اُس نے ایک مشینی انداز میں ہر ایک سے کرایہ وصول کیا اور سارے پیسے کُرتے کی اُوپر کی جیب میں ڈال لیے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ وہ خالی تانگے کے ساتھ دوبارہ لاری اڈے پر پہنچ گیا۔

وہ تانگے سے نیچے اُتر آیا اور اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

"چلو شیخوپورہ۔"

"شیخوپورہ جانے کے لیے لاری تیار ہے۔"

پاس پاس کھڑی ہوئی دو لاریوں سے آوازیں آ رہی تھیں۔ مگر وہ تو وہاں نہیں تھی۔ برکتے کی لاری تو اب تک کئی میل دُور نکل گئی ہوگی۔

برکتے نے آخری بار کیسی نظروں سے اُسے دیکھا تھا۔ اُس کے ہونٹ کس طرح کانپ رہے تھے۔ اُس کے چہرے پر کیا شے آگئی تھی۔ یہ کیسی شے تھی۔ کیسی کیفیت تھی جسے اُس وقت اُس نے محسوس نہیں کیا تھا۔ مگر اب کر رہا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

کے دل میں شیشے کی کرچ کی طرح چُبھ رہی ہیں۔ اُس کے ہونٹ اُسے بار بار پکار رہے ہیں۔
دلبر علی۔ دلبر علی۔

ایک لاری دھواں اُگلتی ہوئی اُس کے قریب سے گزر گئی۔ اُس کی جگہ دوسری لاری
آکھڑی ہوئی۔ اُس نے گھوڑے کی لگام کھینچی۔ گھوڑا چلنے لگا۔ وہ گھر کے دروازے پر آگیا۔
تانگے سے نیچے اُترا اور اندر جانے لگا۔ کمرے میں نبی بخش ایک مصلے پر لیٹا ہوا تھا اور
ایک مالشیا اُس کی مالش کر رہا تھا۔ مالشیے کے ہاتھ بجلی کی سی تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔
دلبرا یارا ٹھنا۔ جلدی آگیا ہے۔"

دلبر سیدھا اپنی چارپائی کی طرف گیا اور اُس پر گر پڑا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ
ڈھانپ لیا۔ دائیں طرف کروٹ لی۔ پھر بائیں طرف۔ کتنی ہی دیر گزر گئی۔ وہ کروٹیں لیتا رہا۔
ب ہاتھ چہرے سے ہٹ کر اُس کے سینے پر آپڑے تھے۔" او دلبرا! کیا حال چال ہے۔
اؤ گے نہیں۔ آنے تھے کیا کرنے۔ دلبرا او دلبرا۔ یار بول ناں۔ دلبرا۔"

دلبر نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"گھوڑا کھول دوں؟"

نبی بخش کے سارے جسم پر کڑوا تیل چمک رہا تھا۔ اُس کا گندا شرخ رنگ کا جانگیہ
ں چمکتے ہوئے ماحول میں ایک بڑا سا دھبّہ لگتا تھا۔

"نہیں بولتا تو نہ بول۔" یہ کہہ کر نبی بخش باہر چلا گیا۔ دلبر لیٹا رہا۔ نبی بخش کے اصرار
ے باوجود اُس نے ایک لقمہ بھی حلق سے نیچے نہ اتارا۔ وہ دلبر کے اِس رویے پر بہت
ران تھا۔

شام ہوئی۔ رات آئی اور ابھی آسمان پر تاروں کا جال بکھرا ہوا تھا کہ وہ بستر سے
بیٹھا۔ اُس نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ باہر آگیا۔ گھوڑا ہنہنایا اور اُس کے نتھنوں
ے گرم گرم سانس نکل کر اُس کی گردن کو چھونے لگا۔ اپنی ہنہناہٹ کو بے سود پا کر گھوڑے
اگلے پاؤں کا سُم زور سے زمین پر مارا۔ مگر اُس کی یہ کوشش بھی بے سود ہی ثابت ہوئی۔
ابھی کافی اندھیرا تھا۔ جاروب کش بازاروں میں جھاڑو دے رہے تھے۔ اُس کے ہاتھ

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

ٹھٹک گئے۔ میونسپل کمیٹی کی پانی چھڑکانے والی گاڑی اُس کے قریب سے گزر گئی تھی۔ وہ کبھی آہستہ آہستہ چلنے لگتا تھا اور کبھی تیز تیز قدم اٹھانے لگتا تھا۔ جب ایک جگہ پہنچ کر اُس کے قدم بے اختیار رُک گئے تو کچھ کچھ اُجالا پھیل چکا تھا۔

"ہیں یہ تو میرا گھر ہے"۔ اُس نے دیکھا کہ وہ اپنے اُس گھر کے قریب آ گیا ہے جس میں اُس نے زندگی کا پہلا سانس لیا تھا۔ جس میں اُس کی ماں تھی۔ اُس کا باپ تھا۔ اُس کا بڑا بھائی تھا۔ اُس کے بیوی بچے تھے اور جس میں اُس کے دل میں ایک کرچ چُبھ گئی تھی۔

اُس کا بڑا بھتیجا ایک شانے کے گرد سائیکل کا ٹائر لٹکائے ہوئے دروازے پر آیا۔ شاید اُس کی ماں نے اُسے آواز دی تھی۔ وہ واپس چلا گیا۔ اُسی لمحے اُس کی گردن پر کسی کے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہونے لگی۔

اُس نے بڑی مشکل سے گردن چھڑائی۔ مُڑ کر دیکھا۔ افضل ہنس رہا تھا۔

"تُو بھاگ کہاں گیا تھا؟"

"کہیں نہیں۔"

"یار! نہ تو گھر میں تھا۔ نہ دکان پر۔ غیب کہاں ہو گیا تھا؟"

"بس۔"

"بس کیا؟"

افضل اُسے زبردستی سائیں کی بیٹھک میں لے آیا۔ سائیں نے اُسے ناشتہ کروایا اور جوا شروع ہو گیا۔ سائیں نے اُس کے ہاتھ میں چند نوٹ تھما دیے۔

"دلبر! تو پاگل ہو گیا ہے۔ دکان تیری ہے۔ وہ تیرے بھتیجے روز بارہ پندرہ روپے کما لیتے ہیں۔ تو کہاں بھاگا بھاگا پھرتا ہے۔" سائیں نے کہا اور افضل کے علاوہ بیٹھک میں بیٹھے ہوئے باقی سب لوگوں نے اُس کی تائید کی۔

پتے بانٹے گئے۔ دلبر کے آگے نوٹوں کا ایک چھوٹا سا ڈھیر لگ گیا۔ یہ سارے روپے اُس نے جیت لیے تھے۔

رات کے دو بجے تک کھیل جاری رہا۔ پھر سب وہیں سو گئے۔ سائیں نے سارے

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

نوٹ دلبر کی جیبوں میں ٹھونس دیے تھے۔ ایک اور دن گزر گیا۔ ایک اور دن۔ پھر ایک اور رات آگئی۔ دلبر کی جیبیں ہلکی ہو گئیں۔ وہ اپنے تیس پینتیس روپے بھی ہار چکا تھا اور اب اُس کی جیب میں صرف چند نوٹ باقی تھے۔ بیٹھک میں لوگ سو رہے تھے۔ سورج نکل آیا تھا۔ وہ نیچے اُترا۔ لاریوں کے اڈے پر آگیا۔

شیخوپورہ جانے والی لاری بھر چکی تھی۔ وہ چلتی ہوئی لاری میں سوار ہو گیا۔

"اب کہاں جاؤں؟" شیخوپورہ میں لاریوں کے اڈے پر پہنچ کر اُس نے خود سے پوچھا۔ کئی منٹ تک حافظے پر زور دینے کے بعد سُبحان پورہ کا نام اُسے یاد آگیا۔ وہ اس طرح جلدی جلدی قدم اُٹھا رہا تھا۔ جیسے کسی بہت ضروری کام پر جا رہا ہے اور اپنی منزل پر پہنچنے میں اُسے کافی دیر ہو گئی تھی۔

"گاؤں۔ سبحان پورہ کہاں ہے؟" اُس نے ایک شخص سے پوچھا جو بیلوں کی جوڑی لیے جا رہا تھا۔

"میاں غلط راستے پر جا رہے ہو۔ اُدھر جاؤ۔"

وہ دو تین گھنٹوں سے چل رہا تھا۔

"برکتے کا گھر؟" وہ پوچھتا۔

"کون برکتے؟"

"بدکتے۔ جو برکتے ہے۔"

یہاں ہر گھر میں ایک برکتے ہے۔

"اُستاد کریم بخش کی بیٹی۔ لنگڑی۔"

"لنگڑی؟"

"ہاں۔"

"یہاں ہر بدکتے کی دونوں ٹانگیں سلامت ہیں۔" قہقہے کے ساتھ جواب ملتا۔

شام ہونے والی تھی۔ وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں ایک چٹائی کے اوپر چند آدمی بیٹھے تھے۔ درمیان میں حُقہ تھا۔ ایک طرف اوپلے سُلگ رہے تھے۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"یہاں برکتے۔ رہتی ہے۔ اُستاد کریم بخش کی بیٹی" اُس نے سوال کیا۔

"کون ہو۔ کہاں سے آتے ہو؟ ایک شخص نے پوچھا۔

" لاہور سے۔ میں اُن کے گھر میں رہتا تھا"

خاموشی چھا گئی۔ چند لمحوں کے بعد اُس شخص نے کچھ دُور ایک کچے مکان کی طرف اشارہ کر دیا۔

دروازے پر ایک لڑکا کھڑا تھا وہ اُسے اندر لے گیا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھا رہا تھا۔ اور یکایک اُس نے اپنے سینے میں سانس رُکتی ہوئی محسوس کی۔

سامنے چارپائی پر ایک لپٹا ہوا کفن پڑا تھا۔

"مر گئی۔ بیچاری۔ نمونیے سے۔ ڈبل نمونیہ ہو گیا تھا"

نہ جانے یہ الفاظ کس نے کہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا گیا۔ مدھم روشنی میں اُس نے ایک چہرہ دیکھا۔ وہ جُھک گیا۔ اور جُھک گیا۔ اُس کے دل میں شیشے کی کرچیں چُبھنے لگیں اور پھر سفید کفن کے درمیان چہرے کے خدوخال بدلنے لگے۔ بدلتے گئے۔ بدلتے گئے۔ اُس نے دونوں ہاتھوں میں مُردہ چہرہ لے لیا۔ اور اُس کے ہونٹوں سے یہ الفاظ اِس طرح نکلے جیسے سوکھی شاخوں سے زرد پتے گر رہے ہوں۔

"اصغر۔ اصغر میرے بھائی۔ مَیں تیرے لیے دوائی لے کر آتا ہوں۔ اصغر مت جا۔ مت جاؤ اصغر!"

یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ وہ عورتیں جو مرنے والی کی چارپائی کے گرد کھڑی تھیں کچھ بھی نہ سمجھ سکیں۔ وہ ہکا بکا دِلبر کو دیکھ رہی تھیں جو "اصغر مت جاؤ۔ مت جاؤ اصغر" کہے جا رہا تھا۔

بے جان چہرے کو ابھی تک اُس نے ہاتھوں میں تھام رکھا تھا!

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

گوٹے کناری والی چُنریا

نادرہ بازار سے آدھ پاؤ گوشت اور ایک پاؤ آلو قندوری میں باندھے گھر کی طرف
رہی تھی کہ ڈھولک کی آواز اُس کے کان میں آگئی اور یک لخت اُسے یوں محسوس ہُوا کہ
س کے دل میں ایک شعلہ سا ایک اُٹھا ہے اور اس شعلے کی گرمی سے اُس کا سارا بدن گرم
وگیا ہے۔ یہ ڈھولک سراج عطار کے مکان میں اُس کی بیٹی شاداں کے بیاہ کے موقع
بج رہی تھی اور اسے خود بھی اس ہنگامۂ مسرت میں شریک ہونے کی دعوت ملی تھی
ر وہ اُدھر گئی نہیں تھی۔

ڈھولک کی آواز سُن کر اُس کی یہی کیفیت ہو جاتی تھی۔ اُس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ
سے اپنی شادی کی حسرت تھی یا وہ ڈھولک بجانے کی آرزومند تھی۔ ایسی کوئی بات نہیں
ی۔ اُس کی عمر چھبیس برس کے لگ بھگ ہو چکی تھی۔ اب تک اُس کی شادی ہو جانا چاہیئے
ی۔ لیکن ماں باپ مر گئے تھے اور وہ خود دن کا بیشتر حصہ لوگوں کے ہاں کام کاج کرنے
گزار دیتی تھی۔ اپنی بڑھتی ہوئی مصروفیت میں شادی کا خیال اُسے پریشان نہیں کرتا تھا۔

ڈھولک کی آواز سُن کر اُس کا دھیان فوراً اُس چیز کی طرف چلا جاتا تھا جو وہ کبھی حاصل
یں کر سکی تھی۔ اور جس کی کسک اُسے کبھی کبھی تڑپا دیتی تھی۔ یہ چیز کیا تھی؟

یہ بات اس زمانے کی تھی جب اُس کا باپ سبز منڈی سے پیاز، لہسن وغیرہ سے
ا بھر کر لے آتا تھا اور اُسے سر پر رکھ کر گلی گلی گھوم کر بیچتا تھا۔ اُس کی ماں ٹھیکیدار کے

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

گھر میں برتن و رتن مانجھ کر ماہانہ پانچ روپے لے آتی تھی - میاں بیوی جو کچھ کماتے تھے اُس سے گھر کا خرچ چلتا تھا۔ بچتا ایک پیسہ بھی نہیں تھا کیونکہ نادرہ کا ضعیف دادا اور ہر وقت بیمار رہنے والی دادی کا بوجھ بھی اُسی کے ماں باپ پر آ پڑا تھا۔ اور اس سے گھر کا خرچ دوگنا ہو گیا تھا۔

نادرہ روکھی سوکھی کھا کر پرورش پا رہی تھی، مگر خوش تھی اور وہ اس لیے کہ گھر میں کوئی بھی اُسے پیٹتا نہیں تھا۔ باپ غصیلا ضرور تھا تاہم اس پر ہاتھ نہیں اُٹھاتا تھا۔ بازار سے سودا سلف وہی خرید کر لاتی تھی۔ اور کم و بیش ہر موقعے پر ایک آدھ پیسہ بچا لیتی تھی۔ جمعے کے روز جب چھوٹی مسجد میں پڑھنے کے لیے نہیں جاتی تھی تو بچائے ہوئے پیسوں سے گڑ کی ریوڑیاں اور تیل کے گرم گرم لڈو لے کر اپنی قابلِ اعتماد سہیلی راحت کے گھر میں چلی جاتی تھی۔ رات بھی مونگ پھلی جیب میں محفوظ کر کے اس کا انتظار کیا کرتی تھی۔ یہ دن اس کے لیے عیش کا دن ہوتا تھا۔ اور اس دن اُس کی ہفتے بھر کی کوفت دُور ہو جاتی تھی۔

راحت اس کی ہم سبق تھی۔ اور امام دین بزاز کی بیٹی تھی۔ اس کی بڑی بہن کی شادی ہونے لگی تو راحت بھاگ کر اس کے یہاں آئی اور اُسے مہندی کی رسم میں شامل ہونے کی دعوت دے گئی۔ اس رات کا وہ بڑی بے تابی سے انتظار کر رہی تھی۔ چنانچہ وہ شام ہوتے ہی اپنی سہیلی کے یہاں پہنچ گئی۔ اُس نے دیکھا کہ راحت نے گوٹا کناری والی چُنری اوڑھ رکھی ہے اور وہ بڑی پیاری لگتی ہے نہ جانے کیا بات تھی کہ اس کے اپنے دل میں ایسی ہی چُنری اوڑھنے کی خواہش پیدا ہو گئی اور جب راحت اس کے قریب آ کر بولی:

"دیکھو میری چُنری میری ماسی نے بنا کر دی ہے۔" تو یہ خواہش تیز ہو گئی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اسی لمحے گھر چلی جائے اور ماں سے گوٹے کناری والی چُنری لانے کے لیے کہہ دے۔ جس وقت راحت کی آپا کے سسرال والی عورتیں دُلہن کے ہاتھوں میں مہندی لگانے لگیں تو وہ ٹکٹکی باندھ کر راحت کو دیکھ رہی تھی۔ اُس رات راحت اُسے وہ راحت نظر ہی نہ آئی جو اُس کے ساتھ روزانہ مسجد میں جا کر مولوی صاحب سے سبق پڑھتی تھی اور جس کے پاس بیٹھ کر وہ ریوڑیاں، تیل کے لڈو اور مونگ پھلی کھایا کرتی تھی۔ اسے اپنی چُنری

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

بہت بُری لگ رہی تھی اور وہ اُسے اُتار کر گوٹے کناری والی چُنری اوڑھنا چاہتی تھی۔
وہ زیادہ دیر تک وہاں ٹھہر نہ سکی۔ اپنے گھر میں آگئی۔ رات کا پہلا پہر تھا۔ باپ اپنی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا اور سر درد کی وجہ سے ہائے ہائے کر رہا تھا۔ جب کبھی اُس کے سر میں درد ہوتا تھا تو وہ نہ تو خود سوتا تھا اور نہ گھر والوں کو سونے دیتا تھا۔

نادرہ کے ذہن پر تو اُسی چنری کا خیال چھایا ہوا تھا۔ ماں چلم میں تمباکو بھر کر چمٹے سے اُس میں کوئلے ڈال رہی تھی کہ وہ بولی:

"بے بے، مجھے وہ چُنری لے دے۔"

"کیسی چُنری لے دوں تجھے؟" ماں نے پوچھا۔

"جیسی راحت نے اوڑھ رکھی ہے، گوٹے کناری والی۔"

"گوٹے کناری والی چُنری، اچھا تجھے بھی امیر لڑکیوں کا شوق ہو گیا ہے۔ نی نادرے! س کا باپ تو ڈیڑھ دو سو روپیہ مہینہ کماتا ہے اور تیرا باپ کیا کماتا ہے؟"

باپ کو بیوی کی یہ بات بُری لگی۔ وہ پہلے ہی زندگی سے بیزار بیٹھا تھا۔ گرج اُٹھا "میں ا کر تم لوگوں کا دوزخ نہیں بھرتا؟"

"جی ہاں، بڑا دوزخ بھرتا ہے۔" بیوی نے تنک کر کہا۔ اس کی بیمار ماں بھلا کیوں خاموش تی۔ بیٹے سے تو کچھ نہ کہہ سکی۔ کیونکہ اُس کی محتاج تھی۔ بہو کو لعنت ملامت کرنے لگی۔ نادرہ ی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ اور اس نے اپنی بھلائی اسی میں سمجھی کہ چُپ چاپ گھر ے نکل جائے۔ اور وہ کوٹھے پر چلی گئی۔ کافی دیر گزارنے کے بعد نیچے اُتری۔ اس وقت تھک کر سب سو چکے تھے۔

رات کے گیارہ بجے تک وہ کروٹ پر کروٹ لیتی رہی اور جب سوئی تو خواب ں بھی گوٹے کناری والی چُنری دیکھتی رہی۔

صبح اس کی طبیعت بڑی کسلمند تھی ماں نے بار بار مسجد میں جانے کے لیے کہا تو گھر سے تو باہر آگئی لیکن مسجد میں جانے کی بجائے راحت کے ہاں پہنچ گئی۔ راحت ے دیکھتے ہی بولی:

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"نی، تو کدھر دفع دفان ہو گئی تھی؟"

"گھر چلی گئی تھی۔" وہ بولی اور ایک طرف کرسی پر بیٹھ گئی۔ راحت کی دیسی چنزی پینگ کے اوپر نظر آ رہی تھی۔

"تیری ماسی نے دی ہے یہ؟" اس نے چنزی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے راحت سے پوچھا۔

"کہا تو ہے ماسی نے دی ہے، پسند ہے؟"

نادرہ اثبات میں سر ہلانے لگی۔

"خالہ سے کہہ کر بنوا لے ناں۔"

"کہا تھا پر وہ کہتی ہے.... وہ کہتی ہے...." نادرہ اپنا فقرہ مکمل نہ کر سکی شاید اس کی آواز حلق میں رک گئی تھی۔

"اچھا میں کہہ دوں گی خالہ سے۔"

"نہ بابا تو نہ کہہ۔ گھر میں لڑائی ہو گئی تھی، میں نے کہا تھا۔"

"کیا ہو گیا تھا؟" راحت کی ماں نے پوچھا جو اپنی ریشمی شلوار میں ازار بند ڈال رہی تھی۔

نادرہ لڑائی کی تفصیل بتانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ رو پڑے اور اس خوف سے کہ کہیں اس کی آنکھوں میں آنسو ہی نہ آ جائیں۔ اس نے جلدی سے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور راحت کی ماں اسے گھورتی رہ گئی۔

گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گزارنے کے بعد وہ واپس گھر میں آ گئی۔ ماں ٹھیکیدار کے گھر میں تھی اور باپ ابھی چارپائی پر ہی لیٹا ہوا تھا۔ اس دن منڈی جانے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

دادی حسب معمول کھوں کھوں کر رہی تھی۔

"نی گڈ.... یہ چلم.... بھر دے۔"

دادی تو اسے دیکھتے ہی چلم بھرنے کا حکم دے دیتی تھی۔ غم و غصہ کے عالم میں اس

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

نے چلم بھری اور حقے پر رکھ کر حقہ اُس کی پیڑھی کے پاس رکھ دیا۔ غصہ تو اُس کے دل میں تھا ہی۔ حقے کی نے کو اس زور سے گھمایا کہ اُس کا توازن قائم نہ رہ سکا اور چلم نیچے گر پڑی۔ بس اب کیا تھا۔ دادی کے دل میں جو کچھ تھا کہہ دیا۔ لعنت پھٹکار کرنے میں اُس کا دادا بھی شریک ہو گیا۔ باپ کس طرح خاموش رہ سکتا تھا۔ وہ بھی کہنے لگا:

"اس چڑیل کا دھیان تو گوٹے کناری والی چُنری میں ہے کام کیا کرے گی؟"

پھر وہی گوٹے کناری والی چنری۔ نادرہ کو بڑا غصہ آیا کہ چنری ہو اگر تو دیتے نہیں، طعنے دیے رہے ہیں۔ وہ یہی بات سوچ رہی تھی کہ دادی بولی:

"نی چڑیلے، کوئلے اٹھا، گھر کو آگ لگانے گی کیا؟"

"لگے آگ گھر کو" اس نے آہستہ سے کہا اور چولہے کے پاس گئی۔ وہاں سے چمٹا اٹھایا۔ کوئلے چلم میں ڈالے اور چلم حقے پر رکھ دی مگر کوئلے تو زمین پر گرنے سے بجھ گئے تھے، دادی کو مزا نہ آیا۔

"نی منہ سڑیے اب بجھے کوئلے چلم میں بھر دیے ہیں؟"

نادرہ نے حقے پر سے چلم اٹھائی۔ اس کے کوئلے چولہے میں ڈالے۔ پرانی چارپائی کے بے کار بان کے جو چند گچھے چولہے کے پیچھے پڑے تھے۔ ان میں سے ایک گچھا اٹھایا، اسے کوئلوں کے اوپر رکھا اور ماچس کی تیلی جلا کر اسے آگ لگا دی اور پھر پھونکنی سے لگی اسے پھونکیں مارنے "کیا مصیبت ہے راحت گوٹے کناری والی چنری پہن کر دم پھر رہی ہے اور میں دھوئیں میں بیٹھی منہ سیاہ کر رہی ہوں" اُس نے دل میں کہا۔ آنکھوں میں کوئلوں کا دھواں اسے کچھ زیادہ ہی زہریلا لگا۔ آنکھوں سے آنسو نکل کر گالوں پر بہنے لگے۔ "ہائے اللہ میں مر جاؤں"۔ اس کے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا اور وہ فوراً بیٹھی۔ دادی اپنے کسی خیال میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اگر وہ کچھ کہتی تو شاید اپنی پوتی سے سخت بات سن لیتی۔

نادرہ نے دیکھا کہ راکھ لگے کوئلوں میں سے ایک ننھا سا شعلہ اوپر اٹھنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔ وہ بیٹھ گئی اور پھر پھونکنی سے پھونکیں مارنے لگی۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

دادی اپنی اَدھ کھلی آنکھوں سے سامنے دیوار کو گھور رہی تھی۔ اُس نے دائیں ہاتھ کی انگلی سے حقے کی نے کو تھاما اور ہونٹوں سے لگا لیا اور حقہ گڑگڑ کرنے لگا۔ نادرہ نے مڑ کر جو دیکھا تو ہنس پڑی۔

دادی چونک پڑی: "ماں آئی؟" اُس نے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ چلم بھی نہیں آئی۔"

چلم کے لفظ پر دادی نے حقے کی طرف دیکھا اور اُسے احساس ہوا جیسے شریر پوتی اُس کا مذاق اڑا رہی ہے۔ بیٹے کی طرف پلٹ کر بولی:

"دیکھا، مخول کرتی ہے بڈھی دادی سے۔"

باپ مخول کی نوعیت تو نہ سمجھ سکا مگر اُس نے اپنی بیٹی کو گندی گالیاں دینے میں اپنا پورا پورا زور لگا دیا۔ نادرہ ایسی گالیاں بارہا سن چکی تھی۔ اُس نے کوئی پروا نہ کی۔ البتہ کوئلوں پر زور زور سے پھونکیں مارنے لگی۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ رات آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چنری تھی۔ جو اُس نے رات اوڑھ رکھی تھی اور اس کی بجائے نادرہ کے جسم پر ایک سادہ سا دوپٹہ دکھائی دے رہا تھا۔

"نادرہ!"

۔۔۔ نادرہ ہاتھ میں پھونکنی لیے کھڑی ہو گئی۔

"میں تیرے لیے لائی ہوں۔ بے بے نے کہا ہے نادرہ بھی اپنی بیٹی ہے۔ اُسے چنری اوڑھنے کا بڑا شوق ہے۔"

نادرہ کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبات میں وہ بے حرکت کھڑی ٹکٹکی اپنی سہیلی کو دیکھ رہی تھی اور سہیلی اس وقت بیک وقت چار ہستیوں کی نظروں کی جولاں گاہ بنی ہوئی تھی۔

نادرہ کے ذہن میں خوشی کی ایک لہر اُٹھی اور اُس نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیے۔ اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں اور وہ یہ بات بھول ہی گئی کہ پھونکنی ابھی تک اُس نے دائیں ہاتھ ہی میں تھام رکھی ہے۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"بس؟" راحت نے پوچھا۔

نادرہ کو کوئی لفظ نہ سوجھا اور راحت بھاگ کر گھر سے نکل گئی۔

دادا، دادی اور باپ نے خاموشی سے یہ منظر دیکھا تھا۔ کسی نے ابھی تک اس معاملے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔

نادرہ کی نگاہیں چُنری پر جم کر رہ گئی تھیں اور دادی جانتی تھی کہ اب اس کی پوتی کیا کرے گی اس لیے اس نے اپنا مطالبہ دُہرا دیا:

"میری چلم بھر دے پہلے۔"

مگر اب چولہے کے پاس بیٹھنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ گھڑے سے جا کر منہ ہاتھ دھولے اور چُنری اوڑھ کر بیاہ والے گھر میں پہنچ جائے۔ اسی اثنا میں اس کی ماں دروازے میں سے داخل ہو چکی تھی اور بیٹی کے ہاتھوں میں چُنری دیکھ کر سارا معاملہ سمجھ گئی تھی۔ اسے راحت کی ماں سے بڑی شکایت تھی کہ ایک مرتبہ بیاہ کے دوران کام کاج کرنے کے لیے اُس نے اُس کی بجائے نیتی میراسن کو بُلا لیا تھا اور یہ اُس کے حق میں سخت ناانصافی تھی۔ وہ راحت کی ماں کا احسان اُٹھانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اُس نے بیٹی کی طرف بڑے غصّے سے دیکھا اور بولی: "نی جھوٹے! خبردار جو تُو یہ چُنری پہنی۔" اور یہ کہتے ہوئے اُس نے آگے بڑھ کر چُنری کو بیٹی کے ہاتھ سے چھین لیا۔

"اسے شرم نہیں آتی بے شرم کہیں کی۔" دادی نے بہو کے غصّے کی آگ میں تیل ڈال دیا۔

"شرم کیوں آئے گی، جھوٹے پہنے گی دوسروں کا۔" ماں نے چُنری کو لپیٹتے ہوئے کہا۔

نادرہ کبھی ماں کو دیکھتی تھی اور کبھی چُنری کو جسے اس نے اس انداز سے دبوچ رکھا تھا جیسے ایک بیمار مرغی کو حلال کرانے کے لیے قصاب کے ہاں لے جا رہی ہو۔

چُنری واپس کر دی گئی اور نادرہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ رات وہ بستر پر لیٹی تو دیر تک اپنے دل سے باتیں کرتی رہی۔ یہ ساری باتیں چُنری کے بارے میں تھیں اور جب اس کا دل بھر آیا تو وہ رو پڑی اور روتے میں یہ لفظ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اس کی زبان سے نکل رہے تھے: "بے... بے... چُن ری... بے... بے میری... چُن ری۔"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

زمین اپنے مدار پر گھومتی ہوئی دن کی روشنیوں اور رات کے اندھیروں کو جنم دیتی رہی نادرہ روکھی سوکھی کھا کر بھی جوان ہوتی گئی۔ محلے میں بیاہ ہوتے رہے۔ عیدیں آتی رہیں۔ لوگ میلوں کے لیے رنگ برنگ کے کپڑے پہنتے رہے۔ نادرہ نے کئی بار لڑکیوں کو گوٹے کناری والی چنریاں اوڑھتے ہوئے دیکھا اور جب بھی دیکھا اُس کا دل تڑپ اُٹھا اور اُس کے ہونٹوں سے بے اختیار ایک آہ نکل گئی۔

دو بار اس نے ماں کے پیسے چُرا کر انہیں الگ رکھ دیا کہ جب عید، بقرعید کے موقع پر دادا دادی عیدی دیں گے تو وہ ان سارے پیسوں کو چنری تیار کرانے میں صرف کر دے گی۔ اس نے دل میں سوچ رکھا تھا کہ بازار سے دوپٹہ خریدے گی۔ حسن دین رنگریز سے اسے رنگائے گی۔ کناری بازار جا کر گوٹا کناری لے آئے گی اور ساون سُنار کی درزن بیٹی سے دوپٹے پر گوٹا کناری لگوائے گی اور یوں اس کی حسرت پوری ہو جائے گی۔ مگر بدقسمتی یہ ہوئی کہ ایک بار تو اس کی ماں نے چارپائی کے نیچے رکھا ہوا وہ مٹی کا لوٹا دیکھ لیا جس میں وہ چرائے ہوئے یا کسی طرح بچائے ہوئے پیسے ڈالتی تھی۔ ماں نے یہ سارے پیسے نکال لیے۔ نادرہ پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا تو وہ خوب چیخی چلائی مگر ماں پر کچھ بھی اثر نہ ہوا اور دوسری مرتبہ جب اچھے خاصے پیسے جمع ہو گئے تو ماں نے اُدھار مانگ لیے کیونکہ گھر میں بیماری آگئی تھی۔ اور بقول اس کے اپنے اس کے پاس افیم کھانے کے لیے بھی پیسہ نہیں تھا۔

نادرہ کی ماں نے دُرست ہی تو کہا تھا۔ گھر میں واقعی بیماری آگئی تھی۔ پہلے نادرہ کا باپ بیمار ہوا۔ اور دس روز کے بعد چل بسا۔ پھر اس کی دادی چارپائی پر لیٹ گئی۔ اور پھر نہ اُٹھی۔ اس کے بعد نادرہ کی ماں کو بلانے والے نے اپنے پاس بلا لیا۔ گھر میں صرف دادا رہ گیا۔ ضعیف اور بالکل ناکارہ۔

اب دو پیٹ اس سے کھانے کو اور دو تن اس سے لباس مانگ رہے تھے۔ ہنر اسے کچھ آتا نہیں تھا۔ کپڑے سینے جانتی ہوتی تو اسے ٹھیکیدار کے گھر میں جا کر وہ کام سنبھالنے کی ضرورت نہیں تھی۔ جو اس کی ماں کرتی تھی۔ صرف ایک گھر کے برتن مانجھنے سے اتنی رقم نہیں ملتی تھی۔ جس سے گھر کا خرچ پورا ہو۔ مصیبت یہ تھی کہ اس کے دادا کو افیم کھانے کی

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

پڑ چکی تھی۔ اس کے لیے افیم کا بندوبست کرنا بھی اس کے ذمے تھا۔ وہ محلے میں زچہ بچہ
ندمت کرنا بھی اپنا فرض سمجھتی تھی۔ کیونکہ اس سے تھوڑے بہت پیسے مل جاتے
ے۔ رات کے وقت اپنے دادا کو پاؤ بھر دودھ پلا کر جب وہ چارپائی پر لیٹتی تو تھکاوٹ
باوجود نیند جلدی اس کی آنکھوں میں نہ آتی۔ اور اس رات تو وہ دیر تک جاگتی رہتی
رات اسے گوٹا کناری لگی چنری کا خیال آجاتا۔ دل سے کہتی :

"ٹھیکیدار کی بہو کے بچہ ہونے والا ہے۔ میں ٹھیکیدارنی سے کہوں گی۔ ماسی میں
ہیں لیتی۔ وہ کہے گی۔ کیوں نہیں لیتی نی۔ میں پہلے تو کہوں گی۔ ماسی تیرا دیا تو کھاتی ہوں۔
رش ہو جائے گی، کہے گی نخرے نہ کر، بول کیا مانگتی ہے۔ میں کہوں گی ماسی، وہ ہے نا
ں گوٹے کناری والی۔ ذرا اوڑھ کر دیکھوں مجھے کیسی لگتی ہے۔ وہ ہنس پڑے گی۔
... اور"۔

اس خوش آئند خیال کے آنے سے نادرہ کے لیے لیٹے رہنا مشکل ہو جاتا۔ وہ اٹھ کر
جاتی۔ بغیر پیاس کے پانی پیتی اور خوش دلی کے ساتھ دادا سے پوچھتی:

"بابا پانی پیو گے؟"

مگر دادا کا تو یہ حال ہوتا کہ شہر میں زلزلہ بھی آجاتا تو افیم کا نشہ دور نہ ہوتا۔

ٹھیکیدار کی بہو کی گود میں چاند سا بچہ مسکرانے لگا۔ ٹھیکیدارنی نے سب کو کچھ نہ کچھ دیا،
نادرہ کو کیا ملا، تھالی میں سیر بھر چاول اور چاول کے اوپر سیر ڈیڑھ سیر گڑ۔ نہ تو ٹھیکیدارنی
س سے کچھ پوچھا اور نہ اس نے ٹھیکیدارنی سے کچھ کہا۔ یوں یہ قصہ ختم ہو گیا۔

دن گزرتے گئے، راتیں گزرتی گئیں۔ وہ معمول کے مطابق ہر روز صبح اٹھ کر دادا کو
ا سے ناشتہ دیتی، گھر کی صفائی کرتی، جی چاہتا تو خود بھی ناشتہ کر لیتی۔ ورنہ حقہ
کے، چلم بھر کر دادا کی چارپائی کے پاس رکھ دیتی اور اس کے بعد دادا کے کان کے
منہ لے جا کر زور سے کہتی :

"بابا جا رہی ہوں"۔

دادا عادت کے مطابق حقے کی نے پکڑنے کے لیے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھا

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

دیتا اور "اچھا" کہہ کر حقّے کے کش لینے لگتا۔

وہ دن کے ایک، دو بجے تک اِدھر اُدھر گھروں میں گھومتی پھرتی، کہیں کام کرتی کہیں صرف باتیں اور کہیں محض اپنی جھلک دِکھا کر ہی باہر آ جاتی۔ گھر آ کر دادا کے لیے کھانا تیار کرتی۔ خود کھاتی اور پھر چلم بھر کر حقّے پر رکھ کر روزمرّہ کی معمولات انجام دینے لگتی۔ رات کا پہلا پہر اس کے لیے کٹھن ثابت ہوتا۔ پہلے ایک حسرت نہ جانے اس کے دل کے کس گوشے سے اپنا سر اُٹھاتی اور اس کے ساتھ کئی اور حسرتیں جاگ اُٹھتیں۔ دن کو تو اسے ان حسرتوں کا خیال ہی نہیں آتا تھا۔ مگر رات کو سونے سے پیشتر اُس کے ذہن سے ناآسودہ آرزوئیں اس طرح پھوٹ پڑتیں جیسے اسفنج کو ذرا دبانے پر پانی نکل آتا ہے۔ کبھی زیادہ بے قرار ہو جاتی تو اس کا جی چاہتا کہ اس وقت کوئی اس کے پاس ہو جس سے وہ ڈھیر ساری باتیں کرے، جو اسے تسلی دے جو اُس کے آنسو پونچھے، لیکن اس کے اِرد گرد تاریک فضا کچھ اور تاریک ہو جاتی۔ وہ تکیے پر زور زور سے ہاتھ پھیرتی اور کئی لمحے پھیرتی رہتی۔ تکیہ جا بجا پھٹ چکا تھا۔ اُس میں سے روئی باہر آ گئی تھی۔ یہی روئی اس کے ہاتھ میں آ جاتی اور وہ اس سے آنکھیں پونچھ کر اسے وہیں تکیے کے نیچے رکھ دیتی۔

گھر میں سوائے دادا کے اور کوئی بھی نہیں تھا اور دادا کو اگر کوئی فکر تھی تو اپنی افیم کی۔ افیم ملنے میں ذرا دیر ہو جاتی تو وہ چلّا اُٹھتا:

"نادرہ، میں مر جاؤں گا"

اس کے دل میں آتا کہ کہہ دے، ایک بار نہیں سو بار مر جا مگر یہ لفظ اُس کے منہ سے نہ نکلتے۔

دادا اسے بارہا کہتا:

"نی جم جلے! تیرا بیڑا غرق ہو، مار ڈالا ہے بڈھے کو۔"

"بابا! بیڑا تو غرق ہو گیا ہے، مرا کیوں جاتا ہے۔ کرتی ہوں تیرا سیاپا۔"

جب تک دادا کو افیم نہ ملتی اس کی زبان تالو سے نہ لگتی اور اُس روز دونوں کا موڈ اچھا تھا۔ نادرہ کو دونوں گھروں سے تنخواہ مِل گئی تھی۔ افیم زیادہ مقدار میں لا کر وہ تین

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

اردن کے لیے دادا کے مطالبے سے بے فکر ہوگئی تھی۔ اور خوشی خوشی آلو گوشت
ید کر گھر کی طرف لوٹ رہی تھی۔ کہ ڈھولک کی آواز اس کے کان میں آگئی۔

"شاداں کا جنازہ اٹھ رہا ہے"۔ اس نے دل میں کہا اور دوسرے ہی لمحے پشیمان
گئی۔

"ہائے اللہ، میں کتنی بری ہوگئی ہوں۔ اللہ میاں معاف کردے کہا سنا معاف
رے کیوں جنازہ اٹھے اس کا" یہ الفاظ بھی اس نے دل ہی میں کہے تھے، لیکن چور
ھوں سے ادھر ادھر دیکھنے بھی لگی تھی۔ جیسے اس نے جو کچھ کہا ہے وہ کسی نے سن
ہیں لیا؟

گھر کے دروازے پر پہنچی تو ایک بلی اس کا راستہ کاٹ گئی۔

"دفع دور"۔ اس نے بدشگونی پر نفرت کا اظہار کیا مگر یک لخت اسے خیال آیا کہ
یاہ رنگ کی نہیں تھی، سفید رنگ کی تھی۔

"سفید رنگ کی تھی تو کیا ہوا، بلی تو تھی ناں"۔

وہ پھر مایوس ہوگئی اور اسی کیفیت میں گھر کے اندر چلی گئی۔ شاداں کی ماں پیڑھی
ٹھی اس کے دادا کو آوازیں دے رہی تھی۔ نادرہ دوسری پیڑھی پر بیٹھ گئی اور پوٹلی
ود میں رکھ لی۔

"ماسی تو؟"

"بڑے مجاز ہو گئے ہیں تیرے۔ بلایا آیا نہیں۔ میری شاداں تیری پرانی سہیلی
ہے؟"

"ہے، ہے کیوں نہیں؟" نادرہ نے جواب دیا۔

"پھر تو آئی کیوں نہیں؟"

نادرہ نے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ خاموش بیٹھی رہی۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی
۔ اس نے شاداں کی ماں کو وہ چھوٹی سی گٹھڑی اٹھاتے ہوئے نہیں دیکھا جو دادا
رپائی کی دائیں جانب پڑی تھی۔ اس نے گٹھڑی کو کھولا جیسے ہی گوٹے کناری والی

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

چُنری کی روشنی فضا میں لہرائی نادرہ فی الفور سامنے دیکھنے لگی۔ اُس نے دیکھا کہ شاداں کی ماں کے ہاتھ میں چُنری چمک رہی ہے۔

"اب تو آئے گی کہ نہیں؟" شاداں کی ماں نے چُنری اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"پر ماسی:"

"راحت نے تیرے بچپن کا قصہ سنایا تھا:"

نادرہ کے ہاتھ ابھی تک چُنری لینے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ وہ شاداں کی ماں کے چہرے کو گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔

"لیتی ہے کہ نہیں، کہوں تیرے دادا سے؟"

نادرہ ہنس پڑی: "ماسی دادا اسے کیا کہے گی۔ وہ تو اس وقت عرش پہ پہنچا ہوا ہے۔"

"کیوں زہر دیتی ہے اسے؟"

"ماسی ایک دن اس گھر میں رہ کر دیکھ لے۔ زہر نہ ملے اسے تو ہاتھ میں مارنے کے لیے حمام دستہ پکڑ لیتا ہے۔"

شاداں کی ماں نے چُنری نادرہ کے سر پر رکھ دی۔ نادرہ نے اسے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

"سچ بتا، آئے گی کہ نہیں؟"

نادرہ نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ چلی گئی۔

وہ اُٹھ بیٹھی، چُنری ابھی اس کے سر پر ہی تھی۔ اس نے اسے آہستہ سے اُٹھایا اور آنکھوں کے قریب لے آئی۔ اس کی نگاہیں چُنری پر اس طرح جم کر رہ گئی تھیں، جیسے وہاں سے نگاہیں ہٹانا اس کے بس میں نہیں ہے۔ وہ سب کچھ بھول چکی تھی۔ اس پوٹلی کو بھی بھول چکی تھی جو اُس کی گود سے نکل کر سیڑھی کے پاس زمین پر گر پڑی تھی۔

دو تین منٹ اسے دیکھنے کے بعد وہ چُنری کی تہیں کھولنے لگی اور پھر اسے یہ بات معلوم ہی نہ ہو سکی کہ وہ چُنری اوڑھ چکی ہے۔ اب اُس جگہ کھڑے رہنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ بھاگی بھاگی دوسرے کمرے میں گئی جہاں کھڑکی کے نیچے ایک پُرانے طرز کا

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

اُوپر پرانے وقتوں کا ایک شیشہ پڑا تھا۔ اس نے یہ شیشہ اُٹھا لیا اور اسے اپنے
ے کے قریب لے آئی۔ چُنری اُس کے سر پر سے گُزر کر بازوؤں پر پھیلتی ہوئی
ے چلی گئی تھی۔ مگر شیشے میں صرف چہرہ ہی دکھائی دے رہا تھا۔

آج اسے اپنا چہرہ بڑا پیارا لگا۔

"نی تُو نادرہ ہے"؟ اُس نے اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہا اور زور سے ہنس
ں پھر خود ہی شرما بھی گئی۔

اس وقت اسے ہر چیز اچھی لگ رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ گاتے اور پھر وہ
نے لگی سے

چھی دیا چُنیاں میں مل مل دھونی آں
ماہی گیا پردیس تے میں چھم چھم رونی آں

گاتے گاتے وہ دادا کے کمرے میں آگئی۔ زمین کے اُوپر پڑی ہوئی پوٹلی پر اس
ظر پڑی۔ اُس نے پوٹلی کو اُٹھا لیا اور دیوار کے ساتھ لگے ہوئے چوبے کے قریب
ے پر اسے رکھ دیا۔ پڑی تو اپنی غلطی کا خیال آیا۔ دوبارہ جُھک کر پوٹلی کو اُٹھایا اور اسے
پر پھینک دیا۔

پاؤں تو اس کے زمین پر ٹکتے ہی نہیں تھے۔ گاتے گاتے پھر کھڑکی والے کمرے میں
ں۔ بغیر کسی مقصد کے ٹرنک گھسیٹ کر پرے رکھ دیا۔ اور خود اس پر بیٹھ گئی۔ پانچویں یا
بار شیشہ دیکھا تو احساس ہوا کہ چہرے پر میل جمی ہے۔

"منہ دھونا چاہیئے"۔ اس نے سوچا اور جب دیسی صابن کا خیال آیا تو اس کی طبیعت
ہو گئی۔ گھر میں ہمیشہ سے دیسی صابن ہی استعمال ہوتا تھا۔ کپڑے دھونے کے کام
تھا اور نہانے منہ دھونے کے لیے بھی اسی کو برتا جاتا تھا۔ مگر اس دن وہ چاہتی
بازار سے انگریزی صابن خرید کر لائے اور اس سے منہ دھوئے۔ دیسی صابن
ں نظروں سے گر گیا تھا۔ انگریزی صابن کے ساتھ اسے اور بھی کئی چیزیں یاد
ں۔ جن کا اس کی زندگی سے دُور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ مثلاً عطر، چہرے کا پاؤڈر، نا

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ہونٹوں کی سُرخی اور آنکھوں کا کاجل۔ اُس دن وہ کافی دولت مند تھی۔ اور یہ ساری چیزیں آسانی سے خرید سکتی تھی۔ اب اُس کے لیے صبر کرنا محال تھا۔ اُس نے بے دھیانی میں وہ ٹوکری اُٹھائی جس میں کئی سال پہلے اُس کا کوئی تنُور کا رشتہ دار آم اور خربوزے لایا تھا۔ جب یہ ٹوکری ہاتھ میں لیے دروازے تک پہنچی۔ تو بیک وقت دو خیال اُس کے ذہن میں آ گئے۔ پہلا خیال تھا کہ ٹوکری ان چیزوں کے لیے مناسب نہیں ہے اور دوسرا خیال یہ کہ اس حالت میں چُنری اوڑھ کر بازار میں جانا کچھ اچھی بات نہیں ہے۔ اُس نے واپس آکر ٹوکری کو تو دادا کی چارپائی کے نیچے لٹکا دیا اور چنری کو تہ کر کے بازوؤں پر اس طرح رکھ لیا جیسے یہ اس کا بچہ ہے جو کچی نیند میں ہے اور جسے وہ سلانے کے لیے چارپائی کی طرف لے جا رہی ہے۔ وہ کھڑکی والے کمرے میں چلی گئی اور چُنری کو ٹرنک میں بڑی احتیاط کے ساتھ رکھ دیا۔

اسحاق فینسی ہاؤس سے وہ کئی بار ٹھیکیدار کی لڑکیوں کے لیے رومال وغیرہ خریدنے گئی تھی۔ اس دن بھی وہ اسی دکان پر پہنچی اور ایک ہی سانس میں ساری چیزوں کے نام گنوا دیے۔

"کون سا عطر چاہیے"؟ دکاندار نے پوچھا۔

"عطر ۔۔۔ ؟ کوئی بڑا اچھا"

"بی بی نے کیا کہا ہے"؟ دکاندار کو یقین تھا کہ یہ چیزیں ٹھیکیدار ہی کی کسی لڑکی نے منگوائی ہیں۔ "چھوٹی یا بڑی شیشی"؟ دکاندار نے مزید سوال کیا۔ وہ ان سوالوں کے لیے تیار نہیں تھی۔ ذرا گھبرا گئی۔

"لے جاؤ ۔ بی بی کو پسند نہ آئے تو واپس لے آنا"

نادرہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ باقی چیزیں بھی دکاندار نے اپنی ذمہ داری پر دے دیں۔

اپنے دوپٹے کے پلّو میں وہ پانچ کا نوٹ باندھ کر لائی تھی۔ دکاندار نے تین روپے تیرہ آنے کا مطالبہ کر دیا تھا۔ اسے پیسے دے کر ساتھ والی پنساری کی دکان سے اُس نے

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

دو پیسے کی مہندی بھی خرید لی۔ اور یہ سب کچھ جھولی میں ڈالے وہ گھر میں لوٹ آئی۔

اُس کی خواہش تھی کہ نہ تو گھر میں کوئی آئے اور نہ دادا اسے کسی طرح پریشان کرے۔ شام تک اسے کئی کام کرنے تھے۔ اُس نے ٹرنک سے نیا جوڑا نکالا۔ بس یہی ایک فالتو جوڑا تھا اس کے پاس جسے وہ شادی بیاہ کے موقع پر پہنا کرتی تھی۔ اس کی دل پسند چیزوں کے ساتھ جوڑا بہت ضروری تھا۔ جوڑا نکال کر اُس نے کمرے کے اندر ٹرنک کے اُوپر ہی رکھ دیا۔ دادا اس کے بارے میں کوئی سوال نہ کر بیٹھے۔ اگرچہ اس کی حالت یہ تھی کہ اس کے منہ پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور وہ اپنا ہاتھ بھی نہیں ہلا سکتا تھا۔

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے دودھ والے پیالے میں مہندی گھولی اور اسے ٹرنک کے پاس رکھ دیا۔ صبح لالو ماشکی دونوں گھڑے بھر گیا تھا۔ ایک گھڑا ابھی تک ویسے کا ویسا پڑا تھا۔ اس سے اُس نے دیگچہ بھرا اور اسے گھڑے پرے جا کر منہ پر چھینٹے مارنے لگی۔ چھینٹے مار چکی تو خیال آیا کہ صابن تو ملا ہی نہیں ———— چنانچہ چہرے پر صابن ملا اور دوبارہ اس پر چھینٹے مارے۔

شیشے میں چہرہ دیکھا تو وہ پہلے چند لمحوں میں حیران ہو کر رہ گئی۔ جو چہرہ شیشے میں دکھائی دے رہا تھا وہ پہچانا ہی نہیں جاتا تھا۔

ٹھیکیدار کی بڑی لڑکی طلعت کو وہ چہرے پر پاؤڈر ملتے ہونٹوں پر سُرخی لگاتے اور آنکھوں میں کاجل ڈالتے چار پانچ مرتبہ دیکھ چکی تھی اور جو کچھ وہ کیا کرتی تھی، وہی کچھ اس نے کیا تھا۔ مگر پوری طرح مطمئن نہیں تھی۔

اُسے فوراً یاد آ گیا کہ چہرے پر پاؤڈر لگا کر طلعت رومال بھی ماتھے اور گالوں پر آہستہ آہستہ پھیرا کرتی تھی۔ رومال سے ہونٹوں کی سُرخی بھی درست کرتی تھی۔ یہی کام اُس نے بھی کیا۔ مگر ہُوا یہ کہ چہرے کا پاؤڈر اور ہونٹوں کی سُرخی غائب ہو گئی۔

"پتا نہیں یہ طلعت کیا کرتی ہے"۔ وہ بڑبڑائی اور دوبارہ چہرے کی آرائش میں مصروف ہو گئی۔

"خیر اب ٹھیک ہے"۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

اور سب ٹھیک ہو گیا تھا۔ اُس نے چُنری اوڑھ لی۔ دوبارہ شیشہ دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ کپڑوں پر اس نے عطر کی آدھی شیشی خالی کر دی تھی۔ تیز خوشبو سے اُسے چھینکیں آنے لگیں اور وہ دو تین منٹ چھینکتی رہی۔

دادا بے ہوش پڑا تھا اور وہ پوری طرح آزاد تھی۔

"جاؤں، شاداں کے گھر۔"

لیکن جب وہ شاداں کے گھر جانے کے لیے گھر سے باہر آئی تو اُس کے قدم شاداں کے گھر کی مخالف سمت اُٹھنے لگے۔ نہ جانے اس کا دل کیوں دھڑک رہا تھا۔ وہ کدھر جا رہی تھی۔

وہ چند قدم ہی چلی ہو گی کہ اس نے جان پہچان والے دکانداروں اور دوسرے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ پایا۔ وہ شرما گئی۔ "یہ لوگ میری چُنری دیکھ رہے ہیں۔ دیکھ رہے ہیں تو دیکھتے رہیں۔ مَیں کیا کروں۔" چنانچہ وہ برابر چلتی گئی۔ یہاں تک کہ اس کے سامنے اسحاق فینسی ہاؤس کے مالک کا مکان آ گیا۔

اسحاق کی بیوی نے اسے گھر کا کام کاج کرنے کے لیے کئی بار بُلایا تھا۔ مگر وہ اس گھر میں کبھی نہیں گئی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اسحاق کا منجھلا بیٹا یوسف بازار میں گزرتے ہوئے جب بھی اُسے دیکھتا تھا یا تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگتا تھا یا "بادشاہو تکو گے یا نہیں" کی قسم کے فقرے چُست کر دیتا تھا۔ وہ صرف اسے ایک ہی جواب دیتی "گھر میں ماں بہن نہیں ہے۔" اس وقت جب اس کی نظر ادھ کھلے دروازے پر پڑی تو وہ چلتے چلتے رک گئی۔

لوگ آجا رہے تھے اور وہ دروازے سے چند گز کے فاصلے پر کھڑی تھی۔

"واہ! مَیں کتنی پاگل ہوں، کہاں آ گئی ہوں۔"

اس نے محسوس کیا کہ وہ مڑ کر تیز تیز قدم اُٹھانے لگی ہے اور انہی لمحوں میں یوسف کی آواز اُس کے کانوں میں آ گئی۔

"آج عید کا چن کہاں سے آ گیا ہے؟"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"ہیں! میں تو یوسف کے گھر میں آگئی ہوں۔" اُسے پسینہ آگیا۔

"آپاں کہاں ہے؟"

آپاں سے کیا کہنا ہے سوہنیو؟"

"کام ہے۔"

"یہ دوپٹہ تو بڑا ہی پیارا لگتا ہے۔ لال پری لگتی ہے۔ کلیجے پر چھری چلا رہی ہے۔"

"مخول نہ کرو۔" وہ شرما گئی۔

یوسف نے دیکھا کہ آج تو رنگ ڈھنگ نرالے ہیں تو وہ سرگوشی کے سے انداز بولا:

"بے بے گھر میں نہیں ہے۔"

وہ مڑی مگر یوسف نے جلدی سے اپنا ہاتھ اس کے دائیں کندھے پر رکھ دیا۔

"ہم سے کوئی کام نہیں۔" اس نے ہاتھ سے کندھے کو دباتے ہوئے پوچھا۔

"کوئی کام نہیں۔"

"پر ہم کو تو ہے۔ اللہ قسم تمہارا جلوہ تو آج مارے دیتا ہے۔"

"چل وے جھوٹے۔"

"جھوٹ بولوں تو اللہ مجھے دوزخ میں ڈال دے۔" اور یوسف نے اپنا دوسرا بھی اس کے دوسرے کندھے پر رکھ دیا۔

تیز خوشبو یوسف کے نتھنوں میں گھس کر اُسے وارفتہ کر رہی تھی۔ نادرہ کی رگ میں ایک ایسی حرارت سرایت کر رہی تھی۔ جس سے وہ اب تک نا آشنا دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھ رہے تھے۔

یوسف کی گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی کہ دروازے میں سے اسحاق کی بیوی سف کی ماں داخل ہوئیں۔ یہ منظر دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نہ سے نادرہ کے لیے گندی گالیوں کی بوچھاڑ نکلنے لگی۔ یوسف نے ماں کو دیکھ کر جانا مناسب سمجھا اور وہ کھسک گیا۔ بیگم اسحاق نادرہ پر پل پڑی اور اُس کے

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

نوں ہاتھ مسلسل حرکت کرنے لگے۔ شور سُن کر محلے کی کئی عورتیں وہاں آ گئیں۔
بیگم اسحاق چیخ چیخ کر نادرہ کے کرتوت کی روداد سُنانے لگی اور عورتیں طرح طرح
کے آوازے کسنے لگیں۔

اسی اثنا میں اسحاق بھی آ گیا۔ سارا قصّہ سُن کر بولا:

"میں نہیں جانتا تھا کہ میری دکان سے چیزیں لے کر بن سنور کر میرے ہی گھر
میں ڈاکہ ڈالے گی"۔ دو تین تھپڑ اس نے بھی جڑ دیے۔ وہ اور مارنے والا تھا کہ ایک
بوڑھی عورتوں نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے اور دھکے دے کر نادرہ کو دروازے
سے باہر نکال دیا۔

اس کی قمیص پھٹ گئی تھی اور چنری کی تو بُری حالت تھی۔ تار تار ہو چکی تھی اور اس
نے اسے دونوں ہاتھوں سے تھام کر سینے سے لگا رکھا تھا۔

وہ اپنے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ اتنی تیزی سے جتنی تیزی سے وہ چل سکتی تھی۔
اس کے دونوں ہاتھ سینے سے بندھے تھے اور ان ہاتھوں کے نیچے اس کی پھٹی
ہوئی قمیص تھی۔ اور اس کی چنری کی دھجیاں تھیں۔ چہرہ اسحاق اور بیگم اسحاق کے طمانچوں
اور ان کے علاوہ اپنی ذلت اور رسوائی اور بے عزتی کے احساس سے سُرخ تھا۔
بال بکھر گئے تھے اور دائیں کان کی لو سے لہو رس رہا تھا۔ لوگ اسے حیرت سے
دیکھ رہے تھے۔ ایک دو نے اسے آواز دے کر روکنے کی کوشش بھی کی مگر وہ ایک
لمحے کے لیے بھی نہ رکی۔ اسی تیزی کے ساتھ چلی گئی۔ یہاں تک کہ گھر کے اندر جا پہنچی۔ کمرے
کے اندر اندھیرا اور سناٹا تھا۔ وہ سیدھی اپنی چارپائی پر پہنچی اور اسی لمحے اس پر گر پڑی۔
تیز چلنے کی وجہ سے اس کا تنفس بگڑ گیا تھا اور وہ لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔
سانس درست ہوا تو اس کے اندر کی آگ بھڑک اٹھی۔ وہ کروٹ پر کروٹ لینے
لگی۔ اس کی آرزو تھی کہ جو آگ اس کے اندر بھڑک رہی ہے وہ اس کے سراپا کو جلا کر
راکھ کر دے۔ وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے مگر وہ زندہ تھی اور ایک ایسے شدید
عذاب میں سے گزر رہی تھی۔ جو لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا اور جس نے اس کی رگ

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ؔیں نشتر سے چبھو دیے تھے۔ وہ تڑپ رہی تھی۔ کلبلا رہی تھی۔ کئی منٹ گزر گئے۔
ؔب اُسے چُنری کا خیال آ گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ کوئی بے جان شے نہیں ہے۔
ؔ جاندار اور زندہ وجود ہے، جو اس کی طرح زخمی ہے، جو اس کی طرح بے تاب،
ؔرار ہے۔ جو اُس کے سینے سے لگا ہوا ہے۔

اُس نے کروٹ لینی بند کر دی اور اس کی باہوں کا دائرہ مضبوط ہو گیا اور اُس کے
ؔں سے ٹوٹ ٹوٹ کر الفاظ نکلنے لگے۔

"میری بچی... میری بد نصیب بچی، نہ رو... نہ رو۔"

اور وہ زور زور سے رونے لگی۔

اندھیرا گہرا ہوتا گیا.... اُس کی آواز اُبھرتی دبتی چیخیں بن گئیں۔ پھر یہ چیخیں
ؔھم ہونے لگیں... وہ سو گئی۔ چُنری کی دھجیاں بدستور اس کے سینے سے لگی تھیں۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

سوہنی کمھارن

چاروں طرف ایسا شور برپا تھا کہ کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی تھی۔ بوڑھے جوان اور
خاص طور پر بچے ایک دوسرے سے اس طرح باتیں کر رہے تھے جیسے گفتگو نہیں کر رہے
آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں اور بڑی جلدی ہی ان میں مارکٹائی کی نوبت آجانے گی۔ تھوڑے
تھوڑے وقفے پر ان کی نظریں ایک جانب دو بانسوں کے ساتھ لٹکے ہوئے اُس میلے کچیلے
پردے پر بھی جا پڑتی تھیں جن کے پیچھے گیس لیمپوں کی روشنی میں بیک وقت کئی سائے حرکت
کرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ان پردے کے سامنے بوسیدہ دریوں کے اُوپر جو لوگ
بیٹھے تھے ان کی بیشتر تعداد ایک ڈیڑھ گھنٹے سے بے تابی کے عالم میں تماشے کا انتظار کر
رہی تھی ۔ پردے کی دائیں جانب ایک لمبی سفید مونچھوں والا پٹھان ہاتھ میں ڈنڈا
لیے بار بار بچوں کو پردے کے قریب بیٹھنے سے منع کر رہا تھا اور جب کوئی شریر لڑکا پٹھان کی
موجودگی کو نظر انداز کر کے پردے کے قریب جا کر بیٹھنے کا ارادہ کرتا تھا تو پٹھان کے ہاتھ کو فوراً
جنبش ہوتی تھی اور ڈنڈا لڑکے کے سر پر آپڑتا تھا۔ شاید ڈنڈا اندر سے کھوکھلا تھا یا پٹھان
اسے بڑی احتیاط سے استعمال کرتا تھا۔ کیونکہ لڑکا ڈنڈا سر پر کھانے کے بعد صرف ہنس پڑتا
تھا اور پیچھے ہٹ جاتا تھا۔ نہ تو لڑکے آگے بڑھنے سے باز آتے تھے اور نہ پٹھان کہیں بیٹھنے
کا نام لیتا تھا۔ جب بھی کسی کے سر پر ڈنڈا لگتا تھا شور اور بڑھ جاتا تھا اور جس وقت لڑکا
بھاگتا تھا اور کسی نہ کسی کے اُوپر گر پڑتا تھا تو اُس وقت شور سے کانوں کے پردے پھٹنے

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

تے تھے اور اُس رات میں بھی ایک دری کے کنارے بیٹھا تماشے کا انتظار کر رہا تھا۔ تماشا
ز گڈی فروش کے اکلوتے بیٹے کی شادی کی خوشی میں ہو رہا تھا اور میں نے سُن لیا تھا کہ
ماشا سوہنی مہینوال ہے جو آدھی رات تک ہوتا رہے گا۔

تماشا بینوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی شور بھی بڑھتا جا
تھا۔ میں نے صدر دین موچی کی زبانی سوہنی مہینوال کا قصہ سُن لیا تھا اور اُس رات اُسے
ں آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ کونوں میں گیس لیمپ جل رہے تھے اور ان کی تیز روشنی
ری آنکھوں میں چُبھ سی رہی تھی۔ بے قراری سے میرا بُرا حال تھا۔ اسی بے قراری کی
رت میں میری انگلیاں اپنے ناخنوں سے دری کے اُوپر جمے ہوئے پلاؤ کے ان دانوں
اکھیڑنے میں مصروف تھیں جو دو چار دن پہلے وہاں گر پڑے تھے اور شادی بیاہ کے
ے برتن دینے والے حاجی اللہ دین کے آدمیوں نے بھی ان دریوں کو صاف نہیں کیا تھا۔
ے دانہ میری انگلی کے ناخن میں چلا گیا اور مجھے درد ہونے لگا۔ اس سے پیشتر کہ میں چاول
ی دانہ ناخن میں سے نکالوں پٹھان نے اپنا ڈنڈا زور سے زمین پر مارا اور کہنے لگا: او چھوکرا
و اب چُپ کر جاؤ۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔ تماشا ہونے والی ہے۔

پٹھان نے دوبارہ ڈنڈا زمین پر مارا اور ایک طرف سے لوگوں کو ہٹانے لگا۔ ایک
کے نے پیچھے ہٹنے میں تامل کیا تو وہ ڈنڈا فضا میں لہرا کر کہنے لگا:

"تو پیچھے نہیں ہٹے گی تو وہ تیری ماں کی یار سوہنی مہینوال تیرے سر پر تماشا کرے گی۔"

میں نے اُدھر سے نظریں ہٹالیں اور پردے پر جمادیں۔ پردے کے پیچھے سائے تیزی
ے حرکت کر رہے تھے۔ ایک طرف سے ایک آدمی باہر آیا اُس نے دونوں ہاتھوں میں
گھڑے اُٹھا رکھے تھے۔ یہ گھڑے اس نے پردے کے باہر رکھ دیے۔ یہ کام کرنے کے بعد
پھر اندر گیا اور جب لوٹا تو اُس نے ہاتھوں میں مٹی کے دو تین پیالے اور صراحیاں تھام
ی تھیں۔ یہ چیزیں بھی اُس نے گھڑوں کے پاس رکھ دیں۔

پردے کے پیچھے سے گھنگروؤں کی آواز آنے لگی۔ شور بہت حد تک ختم گیا۔ وہ آدمی
گھڑے وغیرہ لے کر آیا تھا ان سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا تھا۔ پردے کے پیچھے سے سُرخ

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

جوڑے میں ملبوس پاؤں میں گھنگرو باندھے ایک فربہ مائل تیکھے تیکھے خدوخال والی عورت باہر آئی اور ناچ ناچ کر گانے لگی ؂

چھوٹی بڑی سوئیاں نے جالی کا مورا کاڑھنا، جالی کا مورا کاڑھنا
اِک ہٹکہ پایا میں نے میاں کے راج میں، ہاں میاں کے راج میں
چھوٹی بڑی سوئیاں نے، جالی کا مورا کاڑھنا، جالی کا مورا کاڑھنا
چھوٹی بڑی سوئیاں نے۔

یہ تھیٹر کے کسی تماشے کا گیت تھا اور اُس زمانے میں بڑا مقبول ہوا تھا۔ کئی بار سن چکا تھا۔ گلی محلوں میں لڑکے بالے بڑے شوق سے اسے گاتے تھے اور اُس رات مہینوال کی سوہنی بھی یہی گیت گا کر تماشائیوں کو خوش کر رہی تھی۔ سوہنی ٹنک ٹنک کر، مٹک مٹک کر گاتی رہی۔ لوٹشے اور پوشے کا شور ہوتا رہا۔ ایک بار جب سوہنی ناچتی ہوئی ذرا دُور چلی گئی تو ایک بےصبرے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس پر وہ بولی: "ہائے چھنڈ دی دیو کوئی دیکھ لیگا" نہ جانے اُس بےصبرے نے کیا کہا کیونکہ شور میں اس کی آواز دب گئی تھی۔

سوہنی اُسی انداز میں گا رہی تھی، ناچ رہی تھی مگر گانے اور ناچنے سے زیادہ ہنس رہی تھی۔ اُس سے کچھ دُور مٹی کے برتنوں کے پاس جو نحیف و نزار آدمی بیٹھا تھا وہ سگریٹ کو انگلیوں میں پکڑے آہستہ آہستہ کھانس رہا تھا۔ ایک لمبا کش لیتا تھا اور ایک منٹ تک کھانستا رہتا تھا۔ چند کش لینے کے بعد اُس نے سوہنی کو مخاطب کر کے کہا: "دھیے ہن آ وی جا" معلوم ہوا یہ سوہنی کا باپ ہے جو کھانسی کی وجہ سے بےچین ہو گیا ہے۔ سوہنی نے مڑ کر باپ کو دیکھا اور اپنا ہاتھ یوں ہلایا جیسے کہہ رہی ہو: "بس آ رہی ہوں"۔ اور وہ دو تین بار کولہے مٹکا مٹکا کر گھومنے کے بعد برتنوں کی طرف جانے لگی۔ میں نے دیکھا کہ اُس نے باپ کے ہاتھ سے سگریٹ لے لیا ہے اور خود پینے لگی ہے۔ میرے دل کو دھچکا لگا۔ عورت سگریٹ پیتی ہے بھی اتنا میں ایک موٹا تازہ جوان آدمی جس کا لباس بڑا خوبصورت تھا اور سر پر کلاہ دار پگڑی بندھی تھی۔ ایک مریل سے آدمی کو ساتھ لیے نہ جانے کدھر سے آ گیا اور برتنوں کی طرف جانے لگا۔ قریب پہنچ کر جو اُس نے سوہنی کو دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ عجب

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

تھا۔ وہ شخص ٹکٹکی باندھ کر سوہنی کو دیکھ رہا تھا اور سوہنی کی نظریں اُس کے چہرے پر گئی تھیں۔ سگریٹ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ مجمعے سے ایک آواز آئی:

نی سوہنیے، سگریٹ تے چھڈ دے۔

سوہنی نے جلدی سے سگریٹ باپ کے ہاتھ میں دے دیا اور باپ نے آنے والے سے پوچھا:

خیر ہووے کدھروں آئے اوہ، کی لود گئے؟

اس پر اُس شخص نے جو مہینوال تھا۔ سوہنی کے چہرے سے اپنی نگاہیں ہٹا لیں اور چودھری سب کچھ لے دے۔

سوہنی کا باپ خوش ہو گیا۔ مریل آدمی نے دونوں گھڑے دونوں ہاتھوں میں اُٹھا لیے اور کے پیچھے چلا گیا۔ واپس آیا تو باقی برتن بھی لے گیا۔ اس دوران میں سوہنی اور مہینوال دوسرے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہے۔

سب کچھ لے لتا جے۔ سوہنی کے باپ نے مہینوال سے کہا۔

مہینوال نے سوہنی کے چہرے سے نگاہیں ہٹائے بغیر کہا "سب کچھ لے نہیں لتا سب دتا لے چودھری، سب کچھ دے دتا لے اج"

سوہنی نے شرما کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ فوراً ایک آواز آئی "ہائے او ئے صدقے"۔ اور اس کے ساتھ ہی چاروں طرف سے قہقہے برسنے لگے۔

مَیں بچپن ہی سے رات کو سو جانے کا عادی ہوں، ادھر آٹھ نو بجے اور ادھر میری آنکھیں نا شروع ہو گئیں اور لڑکپن کے اُس دَور میں مجھے نیند بھی بڑی جلدی آجاتی تھی۔ رات ت محلے میں کبھی مجرا ہوتا تھا تو مَیں ایک آدھ گھنٹے سے زیادہ نہیں بیٹھ سکتا تھا لیکن ت تو جیسے میری آنکھوں سے نیند ہی غائب ہو چکی تھی۔ میرے سامنے تماشا ہو رہا ور رات آدھی سے زیادہ بیت گئی تھی۔ گانے گائے گئے، ناچ ہوئے، سوہنی مہینوال ب خوب باتیں کیں اور وہ منظر بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جب مہینوال بڑی آہستہ چل رہا تھا اور اُس نے ہاتھ میں کوئی چیز پکڑ رکھی تھی جو کاغذ میں لپٹی ہوئی تھی۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

وہنی کے پُوچھنے پر اُس نے بتایا تھا کہ اُس نے اپنی ران کا گوشت کاٹ کر کباب بناتے
ں اور اپنی محبوبہ کے لیے لے آیا ہے۔ یہ الفاظ سُن کر سوہنی رونے لگی تھی۔

اس منظر نے مجھ پر خاصا اثر کیا تھا لیکن جو منظر میری آنکھوں میں آنسو لے آیا تھا
ہ تھا جب سوہنی نے کچا گھڑا بغل میں دابا اور گانے لگی ؎

پار چناں توں دِسّے کُلّی یار دی گھڑیا وے گھڑیا۔
اودسدی کُلّی یار دی، گھڑیا، اودسدی کُلّی یار دی وے گھڑیا۔

لوگ تھک کر اونگھنے لگے تھے اس لیے فضا میں کوئی شور، کوئی ہنگامہ برپا نہیں تھا۔
رے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ پتا نہیں مجھے اس بات کا کیوں یقین ہو گیا تھا کہ یہ سوہنی
چ مچ مہینوال سے ملنے کی خاطر دریا میں اُتر جائے گی اور یہ کچا گھڑا آدھے دریا میں پہنچ کر کُھر
ائے گا، سوہنی ڈوب مرے گی۔

تھوڑی دیر بعد کھیل ختم ہو گیا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو جانے لگے۔ میرے ذہن پر
م کے سائے اتنے گہرے ہو گئے تھے کہ اس وقت یہ خیال ہی دماغ سے نکل گیا کہ دروازہ
ھٹکھٹانے سے اباجی کی آنکھ کھل گئی تو وہ مجھے ساری رات باہر رہنے پر کتنی گالیاں دیں
ے اور گالیاں دینے پر ہی اکتفا کریں گے یا ماریں گے بھی، حُسنِ اتفاق سے امی جاگ رہی
تیں۔ انہوں نے مجھے اندر بُلا لیا۔ نہ تو میں نے کچھ کہا اور نہ انہوں نے۔ میرے اندر آتے
ی انہوں نے لالٹین کی بتی اس قدر نیچی کر دی کہ روشنی بجھ گئی۔ میں اندھیرے میں اپنے بستر
ر پڑا۔ تھوڑی دیر بعد اذان کی پہلی آواز بلند ہوئی۔ اباجی مسجد کی طرف جانے کے لیے
ارپائی سے اُٹھ بیٹھے۔ امی کو صبح سویرے قرآن مجید کی تلاوت کرنا ہوتی تھی۔ وہ بھی جاگنے
گیں۔ میں جاگ رہا تھا اور وقت گزاری کے لیے کروٹیں بدل رہا تھا۔ آوازوں کا ایک
وفان تھا جو میرے ذہن میں برپا تھا۔ سوہنی کی آواز، اُس کے گھنگروؤں کی آواز تماشائیوں
کے آوازے، قہقہے، بچوں کا بے ہنگم شور، سب کچھ اس طرح مدغم ہو گیا تھا کہ ایک آواز کو
وسری آواز سے الگ کرنا میرے لیے مشکل تھا۔

یں کروٹیں بدلتا رہا۔ یہاں تک کہ امی قرآن مجید کی تلاوت کے بعد میری چارپائی کے

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

آگئیں۔ انہوں نے معمول کے مطابق میرے چہرے پر پھونک ماری۔ بعد میں میری بہنوں
اور بائیوں کے پاس جاجا کر رکتی رہیں اور پھونکیں مارتی رہیں۔ سورج نکل آیا۔ میں جب
لے کر سکول کو جانے لگا تو دیکھا کہ جس جگہ رات کو تماشا ہو تا رہا تھا۔ وہاں خاکروب جھاڑو
دے رہا ہے ایک طرف مٹی کے ڈھیر کے اوپر پھولوں کا ہار پڑا تھا۔ مجھے یاد آ گیا رات تماشا
تے ہوتے افضل ریڑھی والے نے اپنے گلے سے یہ ہار اُتار کر سوہنی کے گلے میں ڈال
اور اس پر لوگوں نے خوب خوب تالیاں پیٹی تھیں۔ یہ ہار اب مٹی کے اُس ڈھیر پر
تماشا جو تُشا کے، خاکروب نے جھاڑو دیتے وقت ایک جانب لگا دیا تھا۔
میں نے جھک کر ہار اُٹھا لیا اور آ سے بستے کے اندر رکھ لیا۔ ذرا مُڑ کر دیکھا تو تُشا کا ہنس
ا۔ اُس نے کچھ کہا بھی تھا جو میں نہیں سُن سکا تھا۔ سکول پہنچ کر میں نے اُن لڑکوں کو اپنے
جمع کر لیا جو جماعت میں میرے اِردگرد بیٹھتے تھے اور انہیں سوہنی مہینوال کی کہانی سُنانے
سوہنی بے چاری دریا میں ڈوب گئی۔" میں نے کہا۔
ڈوب کہاں مری وہ تو ہمارے تھڑے پر بیٹھی دہی کلچہ کھا رہی تھی۔ رفیق نے کہا۔
یہ بات اچھی نہ لگی۔ یوں لگا جیسے رفیق نے سوہنی کو گالی دی ہے۔ اُس وقت مجھے اور
نہ سُوجھا بستے سے ہار نکالا: "یہ سوہنی کا ہار ہے۔"
بیک وقت کئی ہاتھ ہار کی طرف بڑھے۔ ہار کا دھاگا ٹوٹ گیا اور مرجھاتے ہوئے
زمین پر گر پڑے۔ میں نے کس کر رفیق کی پیٹھ پر مکّا مارا جس کے جواب میں وہ مجھ پر
۔ باقی دوست تماشا دیکھنے لگے۔ رفیق مجھ سے طاقتور تھا۔ میرے ایک مکّے کے
میں وہ دو تین مکّے مار دیتا تھا۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ ماسٹر معراج دین کی آواز گونجی۔
یو، یہ سکول ہے یا اکھاڑہ۔"
ہم الگ ہو گئے اور چند منٹ بعد ہم دونوں بید کھا کر اپنے اپنے ہاتھ سہلا رہے
چھٹی کے وقت میں بستہ اُٹھائے سکول سے باہر نکل رہا تھا کہ رفیق نے مجھ سے پوچھا:
مجھے مکّا کیوں مارا تھا؟"
اسے تو میں نے جواب دیا: "مارا تھا جو کرنا ہے کر لے۔" مگر جس وقت میں گھر پہنچا

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

تو میں نے اپنے آپ سے پوچھا: "میں نے رفیق کو مکہ کیوں مارا تھا؟" اس سوال کے ساتھ ہی ہار کا خیال آگیا اور ہار کا خیال آتے ہی سوہنی کا چہرہ نظروں کے سامنے پھرنے لگا۔

"سالن ختم ہوگیا ہے، دہی لے آ۔"

امی نے مجھ سے کہا اور میں کچھ گھبرا گیا۔ شاید اس بات پر گھبرا گیا تھا کہ سارے راستے میں سوہنی ہی کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ چند روز تو یہ حال رہا کہ جب بھی تنہا بیٹھتا تھا سوہنی کا خیال آجاتا تھا۔ اس کے بعد امتحان کی تیاری میں مصروف ہوگیا۔ لگتا تھا کہ اب سوہنی مہینوال کے تماشے کو بھول گیا ہوں، لیکن ایک روز یوں ہوا کہ بازار سے کوئی چیز خرید کر گھر کی طرف جا رہا تھا۔ ان لمحوں میں میری نظر ایک ایسی عورت پر پڑی جو نہ جانے کہاں رہتی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ میں مٹی کا گھڑا اٹھا رکھا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میں چلتے چلتے رک گیا تھا اور جب تک وہ ایک گلی میں جا کر نظروں سے اوجھل نہیں ہوگئی تھی، میں اسے دیکھتا رہا تھا۔ اس کے بعد پھولوں کا ہار اور خاص طور پر کہیں مٹی کا گھڑا دیکھ لیتا تھا تو مجھے سوہنی یاد آجاتی تھی اور مجھے دکھ ہوتا تھا کہ وہ بیچاری دریا میں ڈوب مری تھی۔

لڑکپن کے اس دور میں اکثر و بیشتر اپنی دادی اماں کے ہاں جاتا رہتا تھا۔ جو بھاٹی دروازے کے اندر، بھائیوں کے میدان کے پاس سکھوں کے عہد کی بنی ہوئی ایک پرانی حویلی کے متصل ایک گلی میں رہتی تھی۔ میں چھٹی کا دن عموماً وہیں بسر کرتا تھا چنانچہ مارچ کے آخری ہفتے میں امتحان کے بعد میلہ چراغاں اور اتوار کی چار چھٹیاں ہوئیں تو میں نے اپنی کتابیں اٹھائیں اور دادی اماں کے ہاں پہنچ گیا۔ وہاں جانے میں ایک خوشی یہ بھی ہوتی تھی کہ دادی اماں میرے گھومنے پھرنے پر کسی قسم کی پابندی نہیں لگاتی تھیں۔ میں جب چاہتا تھا گھر سے باہر نکل کر ادھر ادھر گھومنے لگتا تھا اور جب تک چاہتا تھا آوارہ گردی کرتا رہتا تھا۔

وہ ایک ابر آلود شام تھی۔ میں اس خوف سے کہ کہیں بارش میں کپڑے نہ بھیگ جائیں۔ بھائیوں کے میدان سے گھر کی طرف تیز تیز چل رہا تھا۔ گلی میں داخل ہونے ہی والا تھا کہ میری نظر سامنے حویلی کی سیڑھیوں کے اوپر پڑی اور یک لخت میرے قدم رک گئے۔ سیڑھیوں کے اوپر بہت سارے مٹی کے گھڑے پڑے تھے اور ان کے درمیان ایک عورت بیٹھی تھی۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ن ہے"؟ میرے ذہن میں سوال اُبھرا، اب بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ اور اندھیرا
تا جا رہا تھا۔ مگر میں گلی میں جانے کی بجائے حویلی کی طرف جا رہا تھا۔ پھر اندھیرا گہرا ہو گیا۔
کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ اُوپر سے پانی کے موٹے موٹے قطرے گرنے لگے تھے، میں
ں آ گیا۔ دادی اماں باورچی خانے میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھیں۔ "اماں، حویلی میں کون
ہے؟"

"کوئی آ گیا ہے؛ کھوتے! کپڑے گیلے کر لایا ہے۔ بدل جلدی سے، نہیں تو بیمار
نے گا۔"

اماں نے مجھے کھانا دیا اور حقہ لے کر اپنی چارپائی پر جا لیٹیں۔ اس حالت میں وہ
ہ بولنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ ایک آدھ ضروری بات کہہ کر خاموش ہو جاتی تھیں اور
نہ کسی سوچ میں ڈوب جاتی تھیں۔ دن کے وقت محلے کی بچیوں کو قرآن مجید پڑھا کر
گزار لیتی تھیں اور رات کو جب بالکل تنہا رہ جاتی تھیں۔ شاید سونے سے پہلے ماضی کی
ں تازہ کر لیتی تھیں اور اسی عالم میں سو جاتی تھیں۔ صبح ہوتے ہی حویلی کے پاس گیا۔ ابھی
بڑا دروازہ بند تھا۔ میں لوٹ آیا، پھر اُس وقت گیا جب سورج نکل چکا تھا۔ دروازہ
تھا اور سیڑھیوں کے اُوپر گھڑے پڑے تھے مگر وہ عورت موجود نہیں تھی۔ جسے میں نے
کے وقت دیکھا تھا۔ میں پہلی سیڑھی کے پاس کھڑا تھا کہ آواز آئی: "گھڑا لو گے؟"

میں نے اِدھر دیکھا، ایک بوڑھے آدمی نے مجھ سے یہ سوال کیا تھا۔ میں نے باقی سیڑھیاں
طے کر لیں اور اُوپر چلا گیا۔ بوڑھے آدمی کے پیچھے وہی عورت بیٹھی تھی۔ اس کے سر کے
ھرے ہوئے تھے اور اس کے ہاتھ میں کنگھی تھی۔ جوان عورت تھی۔ بھرا بھرا چہرہ، رنگ
ا، اُس نے مجھ پر نظر ڈالی اور بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔ اماں نے میلے کے موقع پر مجھے
روپیہ دیا تھا۔ میں نے پانچ آنے کا گھڑا خرید لیا بغیر ضرورت کے اور اسے اُٹھا کر اماں
ائے بغیر اپنے پلنگ کے نیچے رکھ دیا۔

دو تین دنوں میں اُس عورت کے بارے میں مجھے بہت سی معلومات حاصل ہو
۔ وہ کمہارن تھی۔ نام لاڈلی تھا۔ اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ کسی قریبی گاؤں سے شہر

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

آئی تھی۔ اس کے بعد میرا یہ معمول ہو گیا تھا کہ چھٹی گزارنے دادی اماں کے ہاں جاتا تھا تو دن میں تین چار بار حویلی کے قریب سے ہو کر جاتا تھا اور حویلی کی سیڑھیوں سے کچھ فاصلے پر ایک دو منٹ ضرور ٹھہر جاتا تھا لاڈلی کو دیکھتا تھا وہ یا تو کسی گاہک سے گھڑے کی قیمت پر اصرار کرتی ہوئی سنائی دیتی تھی یا جھاڑن سے گھڑے صاف کرتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ کبھی کبھی میں نے اسے ایک جوان مرد سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہوئے بھی پایا تھا۔ اور ایک صبح جب میں نے لاڈلی کو اس آدمی کے ہمراہ بھابیوں کے میدان میں چلتے ہوئے دیکھا تو وہ دھندلا سا تصور جو چند روز پیشتر میرے ذہن میں ابھرا تھا اب ایک واضح صورت اختیار کر گیا۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ کمہارن اس آدمی سے عشق کرتی ہے اور وہ آدمی اس پر جان و دل سے فدا ہے۔ اس کے بعد میں اسے لاڈلی نہیں سوہنی کہتا تھا اور اس آدمی کو مہینوال۔ اس خیال کو تقویت اس وقت ملی جب میں نے ایک دوپہر کو دیکھا کہ سوہنی بڑی اداس بیٹھی ہے اور اس کا باپ اسے گالیاں دے رہا ہے۔ اس کا باپ اسے گالیاں کیوں دے رہا ہے۔ کیونکہ اسے اپنی بیٹی کے عشق کا علم ہو گیا ہے۔ سوہنی مہینوال کے تماشے میں بھی سوہنی کا باپ بیٹی کے عشق پر ناراض ہو گیا تھا۔ انہی دنوں میں نے دیکھا تھا کہ سوہنی کہیں چلی گئی ہے اور اس کا باپ گھڑے بیچتا ہے۔ چند روز کے بعد وہ حویلی میں آگئی۔ اس نے بڑے شوخ سرخ کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اب اس کا باپ دکان پر نہیں بیٹھتا تھا۔

مجھے سچ مچ یقین ہو گیا تھا کہ سوہنی مہینوال کے تماشے میں جو کچھ ہوا تھا اب حقیقی طور پر ہو گا۔ ایک روز سوہنی مہینوال سے ملنے کے لیے کچا گھڑا لے کر جائے گی اور دریا میں ڈوب جائے گی۔ سوہنی کو میں نے بارہا دیکھا تھا اور اس سے واقف ہو چکا تھا، مگر مہینوال کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ کہاں ہوتا ہے، اس کا نام کیا ہے اور اب تک اس کے ساتھ کیا بیتی ہے۔ ان میں سے کوئی بات بھی میرے علم میں نہیں تھی اور ایک روز وہ خود دادی اماں کے گھر میں آگیا۔ اس کی بہن کی لڑکی دادی اماں کے یہاں پڑھتی تھی۔ اور وہ گھر سے روٹھ کر آئی تھی اور اس کا ماموں اس کے لیے روٹی لے کر آیا تھا۔ اس کی ایک آنکھ سرخ تھی اور اس میں سے پانی بہہ رہا تھا جسے وہ بار بار رومال سے صاف کر دیتا تھا دادی

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ں کہیں باہر تھیں۔ اور مجھے اُس سے گفتگو کرنے کا موقعہ اس وجہ سے مل گیا کہ دادی اماں
ب چوک دیوی دتا والے گھر میں رہتی تھیں تو وہ مہینے دو مہینے بعد سیاہ رنگ کا ایک لیپ سا
ر چھوٹی سی پیالی میں محفوظ کر لیتی تھیں۔ محلے میں جس کو بھی آنکھ کا درد ستاتا تھا یا کسی کی آنکھ
تی تھی تو وہ ہمارے گھر میں دارو لینے کے لیے آجاتا تھا۔ اماں یہ لیپ ایک سلائی سے
ر اس کی ایک یا دونوں آنکھوں میں ڈال دیتی تھیں۔ اس سے درد تو بہت ہوتا تھا۔
دو تین روز کے بعد آنکھیں ٹھیک ہو جاتی تھیں۔ دادی اماں اپنے اس گھر میں بھی یہ
ب تیار رکھتی تھیں تاکہ وقت پر ضرورت مندوں کے کام آسکے۔

میں نے دیکھ لیا تھا کہ مہیوال کی آنکھ لال ہے اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ آنکھ کے دارو
ں پیالی کہاں پڑی ہے۔ بچی کو روٹی دے کر اور شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کر وہ
نے لگا تو میں نے اُس سے پوچھا۔

"آپ کی آنکھ میں درد ہوتا ہے؟"

اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اماں کے پاس دارو ہے جس سے درد دُور ہو جاتا ہے۔" میری یہ بات سن کر وہ چارپائی
بیٹھ گیا۔

"اگر آپ کہیں تو لا دوں۔"

"مہربانی ہو گی۔ بڑا درد ہوتا ہے۔" اُس نے کہا۔

میں کمرے میں گیا اور الماری کھول کر اُس میں سے پیالی لے آیا۔ "یہ ہے لیپ،
ئی سے آنکھ میں ڈال کر بستر پر لیٹ جائیے۔"

"سلائی تو میرے پاس اس وقت ہے نہیں۔"

"آپ پیالی لے جائیے، یہ لے آئے گی۔" میں نے اس کی بھانجی کی طرف اشارہ کرتے
ئے کہا۔ اُس نے بڑی ممنون نظروں سے مجھے دیکھا اور پیالی لے کر چلا گیا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ میری اُس سے گفتگو ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ مجھے معلوم ہو گیا کہ اس
م علی اکبر ہے۔ اپنے گاؤں سے گھی کے کنستر لے کر آتا ہے اور لاہور میں بھائیوں

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

کے میدان کے ایک سرے پر اپنی بہن کے گھر میں رہتا ہے اور جب تک گمی بک نہیں جاتا۔ یہیں رہتا ہے۔ مجھے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ اُس کا گاؤں دریائے راوی کے پار واقع ہے۔

مجھے جب بھی بازار میں یا میدان میں ملتا تھا میں ضرور بڑے ادب سے اُسے سلام کرتا تھا جس کے جواب میں وہ ایک دو منٹ رُک کر میری خیریت، پوچھتا تھا اور چلا جاتا تھا۔ پورے دو مہینے گزر گئے اور میں دادی اماں کے گھر نہ جا سکا۔ اس مدت کے بعد ایک اتوار وہاں گیا تو میرے دل میں کوئی نئی بات سننے کی آرزو بے قرار تھی۔ سارا دن گزر گیا وہی کچھ ہوتا رہا، جو عام طور پر ہوا کرتا تھا۔ میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ آخر میں نے علی اکبر کی بھانجی سے پوچھ ہی لیا۔ "صغراں، تمہارے ماموں کو کیا ہوا ہے"۔

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا "کچھ بھی نہیں ہوا"۔

"میں نے دیکھا نہیں ہے اُسے"۔

"وہ تو مہینہ ہوا اپنے گھر میں ہے، دریا کے پار"۔

ان لمحوں میں میں نے اپنے دل سے کہا: "سوہنی روز رات کو جاتی ہے اس سے ملنے دریا پار کر کے"۔

سوہنی روزانہ گھڑوں کے درمیان بیٹھی ہوئی نظر آ جاتی تھی اور ایک دن وہ نظر نہ آئی، دوسرے دن بھی یہی ہوا۔ میں واپس اپنے گھر چلا گیا۔ چھ روز بعد آیا تو حویلی کی سیڑھیوں کے اوپر سوہنی کا بوڑھا باپ بیٹھا تھا، وہ نہیں تھی۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔

دادی اماں سے پوچھا، "اماں وہ کہاں گئی، سوہنی کمہارن"۔

"سوہنی کمہارن، کون"؟

"وہ جو گھڑے بیچتی تھی۔ حویلی کے اندر"۔

"تو وہ سوہنی کمہارن تھی"۔ دادی اماں ہنس پڑیں۔

"اماں کہاں ہے وہ"؟

"چلی گئی ہے"۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

اس سے زیادہ دادی اماں نے کچھ بھی نہ بتایا اور میرے ذہن میں ان کے الفاظ گونجنے لگے۔

"چلی گئی ہے۔"

"چلی گئی ہے۔"

تھوڑے دنوں کے بعد حویلی کی سیڑھیوں کے اُوپر نہ تو گھڑے تھے اور نہ وہ بوڑھا۔
اور میں آج بھی اپنی تنہائیوں میں جب کبھی اس عورت کا خیال کرتا ہوں جو میرے لڑکپن کے زمانے میں میری دادی اماں کے گھر کے پاس سکھوں کی پرانی حویلی میں مٹی کے گھڑے بیچا کرتی تھی تو یک بیک میری نظروں کے سامنے دریا کا پانی دُور دُور تک پھیل جاتا ہے اور پانی کی لہروں میں ایک انسانی وجود دکھائی دینے لگتا ہے جو مٹی کے گھڑے کے سہارے تی لمحے اُبھرتا، ڈوبتا رہتا ہے اور پھر ڈوب جاتا ہے۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

یوسف زلیخا

اگر کسی دھات کی گھنٹی کو کچھ مدت کے لیے ایک ایسی جگہ پر رکھ دیا جائے جہاں صبح و شام اُس پر گرد جمتی رہے اور ہوا کے جھونکے اس سے بار بار ٹکراتے رہیں تو جب اسے بجانے کی کوشش کی جائے گی، اُس میں سے ایک تیز، مترنم ٹُن کی بجائے ایک بھاری سی چیخ برآمد ہوگی اور وہ آواز بھی اس بھاری سی چیخ سے کچھ مختلف نہیں ہوتی تھی جو کبھی تو ہر روز اور کبھی دو ایک روز کے وقفے کے بعد لالہ دُنی چند عطار کی دکان سے نکل کر فضا میں گونجنے لگتی تھی۔

لالہ دُنی چند پیشے کے لحاظ سے عطار تھا جو محلے کے لوگوں کو گنتی کے دو چار شربت اور کھانسی بخار دُور کرنے کی پڑیاں دیا کرتا تھا مگر جاننے والے اُسے عطار کی حیثیت سے نہیں جانتے تھے اور اگر جانتے بھی تھے تو اس کی اہمیت بہت معمولی تھی۔ لادنی چند مولوی غلام رسول کی شہرہ آفاق تصنیف "یوسف زلیخا" بڑی دردمندی اور ہُنرمندی سے پڑھتا تھا اور اُس کی یہی خوبی اُسے اپنے محلے اور گرد و نواح کے لوگوں میں ہر دلعزیز بنانے کا ذریعہ بن گئی تھی۔ اس خصوصیت کی وجہ سے اُسے وہ عزت و تکریم حاصل ہو چکی تھی جو چوک دیوی دتا کے بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی تھی۔

لالہ دُنی چند کو میں بچپن سے دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ اس کی دکان بتے بازار کی قدیم ترین دکان تھی یا دو تین قدیم ترین دکانوں میں سے تھی۔ وہ صبح سویرے دکان کھول کر بیٹھ جاتا تھا۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

دو تین گھنٹوں میں جتنی آمدنی ہو جاتی تھی اس پر اکتفا کر لیتا تھا۔ اس کے بعد اوّل تو گاہک ہی اُس کی طرف تو یہ نہیں کرتے تھے اور اگر کوئی اُدھر آ بھی نکلتا تھا تو لالہ سودا دینے میں بڑی بیزاری کا اظہار کرتا تھا۔ چنانچہ لوگ اُس کی دکان پر آنے سے اجتناب ہی کرتے تھے۔ شربت وغیرہ بازار حکیماں کے پاس چمن دین یا گلی چھلیریاں کی نکڑ والی دکان سے خریدتے تھے۔

لالہ ایک فربہ اندام بے ڈول آدمی تھا۔ سفید چہرہ لیکن اُس چہرے اور اُس کے جسم کے باقی حصے کا پانی سے مہینوں بعد کہیں جا کر رابطہ قائم ہوتا تھا۔ اور وہ بھی میاں دین محمد کے اصرار پر اس لیے میل کی موٹی تہ اُس کے بدن کے ہر نظر آنے والے عضو پر جمی ہوئی دکھائی دیتی رہتی تھی۔ اس پر ستم ظریفی یہ کہ اس کا لباس بھی اس کے جسم سے پوری پوری مطابقت رکھتا تھا اور یہ لباس ہوتا بھی کیا تھا۔ ایک لمبا کرتہ کھدر کا اور کھدر ہی کی دھوتی۔ ان دونوں کا رنگ پہچاننا بہت مشکل تھا۔ عیسیٰ درزی نے اُسے اپنی طرف سے بطور تحفے کے پورا سوٹ سی کر دے دیا تھا۔ لیکن لالہ اُن دونوں کو الگ الگ انداز میں استعمال کرتا تھا۔ دھوتی تو اُس نے دکان سے ملحقہ تھڑے پر بچھا دی تھی کہ جو لوگ اُس سے "یوسف زلیخا" سننے کے لیے آتے ہیں وہ گرد بھی جگہ پر نہ بیٹھیں اور کرتے کو دھوپ میں پھیلا کر وہ اُس پر وہ جڑی بوٹیاں سکھایا کرتا تھا جنہیں پیس کر کھانسی یا قبض وغیرہ کے مریضوں کو دیا کرتا تھا۔

عام طور پر ایک پڑیا کے دو پیسے وصول کرتا تھا اور ایک وقت میں تین پڑیوں سے زیادہ نہیں دیتا تھا۔ مریض کے گلاس میں دو پیسے یا زیادہ سے زیادہ ایک آنے کا صندل کا شربت ڈال دیتا تھا۔ برف کا اُس زمانے میں کچھ زیادہ رواج نہیں تھا۔ ہندو مسلمان گھڑوں ہی کا پانی پیتے تھے اور یہی پانی شربت میں ڈال لیا کرتے تھے۔

ایک ہندو اور "یوسف زلیخا" کے قصے سے اتنی دلچسپی اور پھر "یوسف زلیخا" پڑھتے وقت اُس کی آواز میں اتنا سوز، اتنی دردمندی کیسے آ جاتی تھی۔ اِس سوال پر عمر رسیدہ لوگ حیران ہوا کرتے تھے جو خود لالہ کی آواز نہیں سُنتے تھے۔ صرف اپنے احباب یا عزیزوں سے اس آواز کی تعریف سُنتے تھے اور جب وہ لالہ کی دکان کے تھڑے پر بیٹھ کر یہ آواز سُن لیتے تھے تو پھر کبھی انہیں اس سوال پر غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

یہ "یوسف زلیخا" کی کتاب جسے لالہ بڑی احتیاط کے ساتھ محفوظ کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ غالباً اس کے اوّلین ایڈیشن کی کاپی تھی جو وہ کسی زمانے میں بازار سے خرید لایا تھا۔ اس کے نسخے کا ایک ایک ورق جلد سے الگ ہو چکا تھا مگر وہ تھا کہ ان بوسیدہ، پھٹے ہوئے اوراق کو کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے سے جمائے رکھتا تھا۔ کتاب پر جلد اس نے سالہا سال پہلے بندھوائی تھی اب وہ مکمل طور پر ناکارہ ہو چکی تھی اور اوراق کو اپنے اندر سمیٹ لینے کی صلاحیت سے محروم ہو گئی تھی پر لالہ کو یہ اوراق جس طرح عزیز تھے اسی طرح یہ ٹوٹی پھوٹی جلد بھی عزیز تھی۔ ایک زمانے میں جب کتاب کی حالت قدرے بہتر اور قابلِ علاج تھی میاں دین محمد نے لالہ سے کہا تھا کہ کتاب دو ایک روز کے لیے مجھے دے دو، نئی جلد بندھوا دوں گا۔ لالہ ٹال مٹول سے کام لیتا رہا۔ وہ اپنے پھٹے پرانے نسخے کو اتنی مختصر سی مدت کیلئے بھی جدا نہیں کرتا تھا۔ اور جب کتاب ورق ورق ہو کر ناقابلِ علاج ہو گئی تو کئی لوگوں نے اسے نئی کتاب خریدنے کی صلاح دی بلکہ یہ بھی کہا کہ وہ نئی کتاب خود لا کر دے دیں گے۔ مگر لالہ کو یہ دونوں باتیں منظور نہیں تھیں۔

لالہ سے جب بھی کہا جاتا کہ اس کی کتاب ناکارہ ہو چکی ہے تو وہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ اپنے دایاں ہاتھ کی انگشتِ شہادت سینے پر رکھ دیتا اور یہ انگلی ایک منٹ تک اس کے سینے پر لگی رہتی گویا وہ بزبانِ خاموشی یہ جواب دیتا کہ کتاب ضائع نہیں ہوئی اس کے سینے کے اندر محفوظ ہو گئی ہے۔

لالہ کا اپنی ورق ورق کتاب سے کچھ ایسا جذباتی تعلق استوار ہو گیا تھا کہ وہ اسے حتی الامکان نگاہوں سے دور ہونے نہیں دیتا تھا۔ اس کے صبح کے دو تین گھنٹے بڑی مصروفیت کے ہوتے تھے اور میں نے دیکھا کہ وہ اس حالت میں بھی کتاب کو زانو پر جمائے رکھتا تھا اور اس کے اوپر ایک بڑا سا رومال ڈال دیتا تھا تاکہ جب کسی گاہک کے گلاس میں بوتل میں سے شربت ڈالے تو اس کے قطرے کتاب کی جلد کو آلودہ نہ کر دیں مگر یہ رومال خود اتنا گندہ ہو چکا تھا کہ جس شے ۔ بھی چھو جاتا تھا اُسے متاثر کیے بغیر نہیں رہتا تھا۔

میں لالہ کی زندگی کے اس ... کا ناواقف تھا ... گزار کر

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ے محلّے میں آگیا تھا۔ میں نے تو جب بھی اِسے دیکھا تھا بڑی مسجد کے متصل اس چھوٹی سی
میں بیٹھ کر شربت اور کھانسی و نزلہ کی پڑیاں بیچتے ہوئے ہی پایا تھا۔

اس کا کوئی گھر نہیں تھا۔ سردی یا گرمی شب و روز کے تھوڑے سے وقت کو چھوڑ کر
ے وہ ضرورتاً باہر جاتا تھا اپنی دکان ہی میں دکھائی دیا کرتا تھا۔ سردیوں کی راتوں کو دکان
دروازہ بند کر کے ایک میلی کچیلی چٹائی پر لیٹ کر ایک برسوں پرانا لحاف اوڑھ لیتا تھا اور
طور پر آدھی رات تک اس کی دھواں بھری لالٹین کی بڑی مدھم ضعیف روشنی دروازے
نیچے سے باہر آ کر فرش کو گنڈیریوں کے چھلکوں کی طرح زردی مائل کر دیتی تھی۔ دکان کا دروازہ
گھسا کر اپنا نصف حصّہ آدھ فٹ کے قریب کھو چکا تھا اس لیے لالٹین کی روشنی کو فرش تک
نے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی تھی۔ گرمیوں میں دکان کھلی رہتی تھی۔ لالٹین دروازے کے باہر
تی تھی اور وہ یوں لیٹ جاتا تھا کہ سوائے پاؤں کے اُس کا سارا دھڑ دکان کے تھڑے پر
تھا۔ اس حالت میں کتاب اُس کی چھاتی کے اوپر یا سر کے نیچے بطور تکیے کے دکھائی دیا کرتی
۔ لالہ کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی تھی۔ جاننے والے جانتے تھے کہ لالہ "یوسف زلیخا"
نے میں بے مثل ہے۔ اس لیے لوگ دوپہر کو اُس کے ہاں "یوسف زلیخا" سننے کے لیے
تے تھے۔ لالہ خوشی سے ہر شخص کا خیر مقدم کرتا تھا۔ کسی سے اس کا نام یا کوئی اور بات
پوچھتا تھا۔ بس یہی ایک فقرہ کہتا تھا "جی آیاں نوں" اور آنے والا خوش ہو کر جہاں بھی جگہ
تی تھی بیٹھ جاتا تھا۔

لالہ "یوسف زلیخا" تسلسل سے ساتھ نہیں سُناتا تھا جو شخص پہلے آ کر کہہ دیتا تھا۔
"لالہ جی! وہ سناؤ۔ وہ جس میں عورتیں یوسف کو دیکھ کر اپنے ہاتھ کاٹ لیتی ہیں"۔
لالہ مسکراتا اور اُس کا طویل فارسی عنوان زبانی سُنا دیتا اور سُنا کر کہتا: "یہ سُننا
تے ہو؟"

کہنے والا فارسی کا ایک لفظ سمجھے بغیر اثبات میں سر ہلا دیتا اور لالہ چند لمحوں کے اندر
تاب کا مطلوبہ حصہ سامنے رکھ کر شعر سُنانے لگتا۔ اسے تہائی کتاب زبانی یاد تھی اور
شعار جو سینکڑوں بار سُنا چکا تھا اُنہیں سناتے وقت کسی قسم کی دقّت محسوس نہیں کرتا تھا۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ایک بار میں نے پوچھا:

"لالہ جی! آپ نے یوسف زلیخا کس سے پڑھی تھی؟"

کہنے لگا۔ "دلاور! اللہ بخشے میرے اُستاد حاجی ابراہیم کو انہوں نے مجھے دو کتابیں پڑھائی تھیں۔ ایک کتاب تھی مقبل کی ہیر اور دوسری یہی احسن القصص۔

"احسن القصص کون سی کتاب ہے"؟ اُس زمانے میں مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ مولوی غلام رسول عالم پوری نے "یوسف زلیخا" کے قصے کو اس نام سے منظوم کیا تھا۔

میرے لفظ سُن کر لالہ نے بڑی حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"سبحان اللہ۔ تجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ کتاب "یوسف زلیخا" احسن القصص کہلاتی ہے"۔

لالہ نے ایک دفعہ "یوسف زلیخا" سے متاثر ہونے کا واقعہ سُنایا تھا۔ وہ اپنی جوانی کے دنوں میں گوجرانوالہ میں بڑی بہن کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک رات باہر سے آئی ہوئی ایک تھیٹریکل کمپنی کا تماشا دیکھ کر گھر جا رہا تھا کہ ایک آواز نے اُس پر جادو سا کر دیا۔ یہ آواز ایک دکان کے اندر سے آ رہی تھی۔ وہ دیر تک وہاں کھڑا رہا اور یہ آواز سُنتا رہا۔ صبح وہ اُس دکان پر گیا۔ دکاندار جو ایک سبزی فروش تھا۔ اُس نے لالہ کو بتایا کہ رات حاجی ابراہیم "یوسف زلیخا" سُنا رہا تھا۔ وہ حاجی کا پتہ پوچھ کر اُس کے گھر جا پہنچا۔ پہلی ملاقات میں کچھ نہ کہا۔ چند ملاقاتوں کے بعد حاجی سے "یوسف زلیخا" پڑھانے کی درخواست کی۔ حاجی نے یہ درخواست اس بنا پر رَد کر دی کہ ایک ہندو لڑکا "یوسف زلیخا" کیا پڑھے گا۔ مگر جب اُس ہندو لڑکے نے حاجی صاحب کی منت سماجت کی اور چند روز اُن کی پورے خلوص کے ساتھ خدمت بھی کی تو حاجی صاحب نے اُس سے کہا کہ ہر شام کو سبزی فروش کی دکان پر آ جایا کرو اور وہ اُس روز سے جس روز اُسے حاجی صاحب نے حاضری کا حکم دیا تھا۔ باقاعدگی کے ساتھ دکان پر جانے لگا۔ حاجی صاحب اُس کے شوق اور دلچسپی سے بڑے متاثر ہوئے اور انہوں نے اُسے "احسن القصص" پڑھانی شروع کر دی۔ پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ حاجی صاحب دس بجے تک دکان میں بیٹھنے والے سامعین کو خود "یوسف زلیخا" سُناتے اور جب تھک جاتے اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے تو لالہ اُن کے سامنے دو زانو بیٹھ کر ایک

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ہ گھنٹہ سبق پڑھتا اور پھر حاجی صاحب کو اُن کے گھر پہنچا کر اپنی بہن کے یہاں چلا جاتا۔
لالہ کہا کرتا تھا:

"میرے مرحوم و مغفور اُستاد نے مجھے یہ کتاب اس طرح پڑھائی تھی جس طرح مولوی
کو قاعدہ پڑھاتا ہے"۔

اپنے اُستاد کا ذکر کرتے وقت لالہ سراپا عقیدت ہو جاتا تھا۔ حاجی ابراہیم کا نام اُس
ایک دو بار ہی ہونٹوں سے نکلا تھا۔ وہ عام طور پر اُستاد مرحوم و مغفور کہا کرتا تھا اور
لفاظ زبان سے نکالتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے کانوں کی لویں چھو لیتا
ور کتاب کے اُس پھٹے پرانے نسخے کو وہ اسی وجہ سے بہت عزیز سمجھتا تھا اور اس کی بجائے
نیا نسخہ بازار سے خریدنے پر بھی آمادہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ نسخہ اُس نے اپنے اُستاد سے پڑھا تھا
ستاد کی انگلیوں نے بار بار اس کی سطروں کو چھوا تھا۔

محلے میں کہیں شادی بیاہ ہوتا تھا تو عام طور پر مہندی کی رات کو لالہ محلے کے کسی بزرگ
کہنے پر بیاہ والے گھر میں چلا جاتا تھا اور دیر تک "یوسف زلیخا" سناتا رہتا تھا۔ اس محنت
وض اُسے دو سے پانچ روپے مل جاتے تھے جو وہ نذر کے آخر اپنی جیب میں ڈال لیتا
مگر اُس رات میاں دین محمد کے اصرار پر بھی وہ تے راج کی لڑکی سرفراز کی شادی پر اُس کے
نہیں گیا تھا بلکہ اپنی دکان ہی میں بیٹھا رہا تھا۔

میں چنے کی دال والی کھچڑی میں لازماً دہی ڈال کر کھاتا ہوں۔ یہ میرا من بھاتا کھاجا ہے
اُس شام میں ماجھے دودھ دہی والے سے دہی خریدنے ہی گیا تھا۔ کھچڑی گرم تھی،
تھا جب تک دہی لاؤں گا ٹھنڈی ہو چکی ہو گی۔ ماجھے کی دکان لالہ کی دکان کے بالکل
ب تھی۔ میں نے دیکھا کہ لالہ کتاب کھولے سنار رنگریز کے منجھلے بیٹے بشیرے کو قصے کا وہ
ر سنا رہا ہے جس میں زلیخا یوسف کے ہجر میں اپنے جذباتِ غم بصورت بارہ ماہ بیان
ی ہے۔ جب میں وہاں پہنچا تو لالہ سنا رہا تھا:

بارہ مہینے سر پر گزری دُھپ و چھوڑے والی
سُورج غم دے ہڈیاں مغزوں کر دکھلایاں خالی

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

شمس دوپہرے برج بینے جیوں اُرج چمکاں مارے
ایویں زخم تیرا اَرج میرے سینے دے وچ کارے

میں نے دیکھا کہ بشیرے کی آنکھیں اشک آلود ہیں۔ اس کے چہرے کی رنگت زردی مائل ہوگئی ہے اور وہ سر آگے بڑھا کر دونوں کہنیاں زمین پر ٹکاتے ہلے جُھلے بغیر لالہ کے چہرے کو تکے جا رہا ہے۔

لالہ کتاب پڑھتے وقت زیادہ تر آنکھیں بند رکھتا تھا۔ کتاب کھول ضرور لیتا تھا مگر سُناتا زبانی تھا اور اس وقت بھی اس کی یہی کیفیت تھی۔

جب وہ بچگن پر پہنچا اور پہلا شعر سُنانے لگا ؎

بچگن ماہ فراقوں روندی پئے کھیں ڈج رہے
واہ واعشق تیرے نے میں دُکھڑے سکھ کھو ہے

یہ شعر سُنتے ہی بشیرے نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چُھپا کر اُسے اتنا جھکا دیا کہ اُس کی کہنیاں لالہ کے زانو کو چھونے لگیں۔ اُس کی پیٹھ کانپ رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ میں [illegible] اُٹھ گیا تھا اور اب لالہ کی دکان کے سامنے کھڑا تھا۔

وہ دِتّے رلوج کی لڑکی سرفراز کی مہندی کی رات تھی۔ مُنڈے والے گھر سے مُنڈے کی بہنیں اور چند رشتہ دار عورتیں کُڑی کو مہندی لگانے اُس کے گھر جا رہی تھیں۔ ایک جوان لڑکی نے تھالی میں مہندی کے اُوپر کئی موم بتیاں روشن کر رکھی تھیں اور رنگ و بُو کا یہ قافلہ لالہ کی دکان کے آگے رواں دواں تھا۔ سب اُدھر دیکھنے لگے۔ عورتیں گاتی ہوئی جا رہی تھیں۔ باقی آوازیں رُک گئی تھیں۔ لالہ بھی خاموش ہوگیا تھا۔

میں اُدھر دیکھتا رہا اور جب یہ عورتیں موڑ مُڑ گئیں تو میں نے لالہ کی دکان کے اندر جھانکا۔ بشیرا نظر نہیں آ رہا تھا اور لالہ نے کتاب بند کر کے بوتلوں کے اُوپر رکھ دی تھی۔

بشیرا کہاں چلا گیا تھا؟ یہ سوال نہ تو میں نے لالہ سے پوچھا اور نہ لالہ نے خود مجھے یہ بات بتانے کی ضرورت محسوس کی۔

صبح محلے میں ہر جگہ ایک دردناک خبر موضوعِ گفتگو بنی ہوئی تھی اور خبر یہ تھی کہ رات

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ے نے زہر کھالیا تھا اور اُس کے گھر والے خطرے کی حالت میں اُسے ہسپتال لے گئے
اور یہ خبر بھی سرگوشیوں کے عالم میں سُنی جا رہی تھی کہ بشیرے کو سرفراز سے بڑا پیار تھا
رفراز گھٹی بازار کے گوشہ کنارے بیٹھنے والے امام دین سے بیاہی جا رہی تھی۔ اِس صدمے پر بشیرے
ر کھالیا تھا۔

بشیرے کی حالت لمحہ بہ لمحہ خراب ہوتی گئی اور دو دن کے بعد وہ مر گیا۔

اس المناک حادثے پر محلے کی حالت کچھ ایسی ہو گئی تھی جیسے ایک چھوٹی سی انگیٹھی میں
ے اس طرح ٹھونس دیئے جائیں کہ کڑوا کسیلا دھواں باہر نکلنے کے لیے کہیں بھی کوئی راستہ
تے اور اندر ہی اندر پھیلنے لگے۔ کوئی بھی کسی سے سنبھل کر بات نہیں کرتا تھا لوگ
چاپ بوجھل دلوں اور بھاری قدموں کے ساتھ اِدھر اُدھر حرکت کر رہے تھے۔ اور
یک دِن شعلے نے کوئلوں میں سے گزر کر انگیٹھی کے باہر اپنا سَر نکال لیا اور اس کے
پیچھے جگہ جگہ سُرخی دھڑکنے لگی۔ واقعہ صرف یہ ہوا کہ بشیرے کے خالو نے اپنے صحن میں
ے ہو کر اپنی تیز و تند آواز میں یہ اعلان کر دیا کہ بشیرے کی موت کا ذمے دار لالہ ہے
ہ اُسے ایسے شعر سناتا اور نہ بشیرا خودکشی پر تیار ہوتا۔ اَب کیا تھا کئی زبانیں حرکت
لگیں اور بزرگ اور جوان خاص طور پر عورتیں بشیرے کے خالو کی تائید کرنے لگیں۔ اس
ی مخالفت میں چند آوازیں ایسی بھی تھیں جو لالہ کو مجرم نہیں گردانتی تھیں مگر ان
ں کی طرف کوئی بھی توجہ نہیں دیتا تھا۔

کچھ بزرگوں نے طے کر لیا کہ لالہ کو اوّل تو محلے ہی سے نکل جانے پر مجبور کر دیا جائے
ر وہ کہیں نہیں جا سکتا تو آئندہ "یوسف زلیخا" بالکل نہ پڑھے۔

میاں دین محمد، اُستاد فضل، الٰہی قصّل اور دینو گویے نے ان انتہا پسندوں کو سمجھانے کی
ش کی لیکن جو آگ ایک بار بھڑک اٹھی تھی اُس کا مدھم ہونا مشکل تھا۔

لالہ نے اپنے بارے میں یہ فیصلہ سُن لیا اور جس دن دوپہر کو اُس نے فیصلہ سُنا، شام کے
اُس کی دکان حسبِ معمول کھلی پڑی تھی لیکن وہ بوتلوں کے پاس دکھائی نہیں دے رہا
ائی مُرادو کے پوتے شہاب نے بتایا کہ لالہ "یوسف زلیخا" اپنے ہاتھوں میں اٹھائے

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

تحصیل بازار کی بنگالی آبادی کے قریب سے گزر رہا تھا۔ اِس خبر کا ردِ عمل واضح طور پر دو
صورتوں میں نکلا۔ کچھ لوگوں کو خوشی ہوئی کیونکہ انہی محلہ والوں نے لالہ کی شدید مخالفت
کی تھی اور اُس کے چلے جانے کو وہ اپنی فتح پر محمول کر رہے تھے۔ بعضوں کو افسوس ہوا،
اور دل سے افسوس ہوا۔ انہیں لالہ سے ہمدردی ہو گئی تھی اور جب یہ لوگ آپس میں گفتگو
کرتے تھے تو لالہ کی حالت پر افسوس کا اظہار ضرور کرتے تھے۔ زیادہ تعداد اُن مردوں اور
عورتوں کی تھی جن کی اپنی کوئی رائے نہیں تھی۔ وہ لالہ کے مخالف گروہ سے ملتے تھے
تو مخالفت کرنے لگتے تھے اور جب انہیں دوسرے گروہ کے آدمیوں سے بات چیت
کا موقع ملتا تھا تو اُن کی ہاں میں ہاں ملانے لگتے تھے۔

لالہ کے جانے کے بعد اب یہ مسئلہ پیدا ہو گیا تھا کہ دکان اور دکان کی چیزوں کا کیا کیا
جاتے۔ چند روز کے اندر اندر اس کا حل بھی سوچ لیا گیا۔ دکان کی چیزیں پنڈت ہر رام کے
مکان کی ایک کوٹھڑی میں رکھ دی گئیں اور دکان میں افضل درزی آ بیٹھا۔

○

وقت کی گردش بدستور جاری رہی۔ محلے میں چھوٹے موٹے حادثے ہوتے رہے اور ان حادثوں
کی وجہ سے لوگ بشیرے کے ایسے کو بہت حد تک بھول گئے۔ مگر یہ ایک عجیب بات تھی
کہ لالہ کا ذکر ہر روز کسی نہ کسی صورت میں ہو ہی جاتا تھا۔ جو شخص بھی کسی کام سے اُس کی پُرانی دکان
کے قریب سے گزرتا تھا تو چلتے چلتے اُس کے قدم بے اختیار رُک جاتے تھے اور وہ دل
میں کہتا تھا، "یہاں لالہ دُنی چند بیٹھا تھا جو یوسف زلیخا سُنا کر لوگوں کو رُلا دیتا تھا۔" دوپہر کے
وقت فرصت کی گھڑیوں میں جب عیسیٰ درزی، مختار راج اور دوسرے لوگ حکیم اکبر حسین کے
مکان کی طرف جانے والی گلی کی نکڑ پر ایک پُرانی دری بچھا کر اور اُس پر بیٹھ کر تاش یا شطرنج
کھیلتے تھے تو انہیں کچھ ایسا محسوس ہوتا کہ محلے کی رونق میں ایک کمی واقع ہو گئی ہے اور وہ
اس کمی کا احساس کر کے اُداس ہو جاتے تھے۔

کہیں شادی بیاہ ہوتا تو دُولہا کا باپ یہ سوچ کر غمگین ہو جاتا کہ اب اس کے ہاں
یوسف زلیخا ...

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

لالہ کو وہاں سے گئے ہوئے پانچ ماہ گزر گئے تھے اور ایک روز تحصیل بازار والے
تے سے ایک اجنبی سیدھے بازار میں آنمودار ہوا۔ لمبا قد اور پھٹا پُرانا لباس کپڑے
پٹی ہوئی کوئی چیز اُس نے سینے سے لگا رکھی تھی۔
وہ میاں دین محمد کا پتہ پوچھ رہا تھا۔ اور جب وہ اُنہیں ملا تو کپڑے میں لپٹی ہوئی شے
طرف بڑھاتے ہوئے بولا:
"میاں صاحب! یہ دُنی چند نے دی تھی مرنے سے پہلے اور کہا تھا۔ میں نے اِسے
ن عمر اپنے دل سے لگا کر رکھا ہے اور اب اِسے اپنے محلّہ والوں کو دیتا ہوں۔ یہ
ے پیار کی نشانی ہے۔"
میاں دین محمد نے کپڑا اٹھایا تو یہ وہی یوسف زلیخا کی بوسیدہ اور ورق ورق کتاب
جسے لالہ دُنی چند نے ہمیشہ اپنی زندگی کی سب سے قیمتی متاع سمجھا تھا۔
اجنبی تھوڑی دیر بعد چلا گیا تو سوال یہ پیدا ہوا کہ اب اِس کا کیا کیا جائے۔
بعضوں کی رائے تھی کہ اِسے کسی کنوئیں میں پھینک دیا جائے۔ بعض اسے دریا بُرد
ے کے حق میں تھے اور بعضوں کی رائے یہ بھی تھی کہ اسے محلّے کے کسی بزرگ مثلاً
دین محمد ہی کے سپُرد کر دیا جائے تاکہ وہ اسے حفاظت سے اپنے پاس رکھیں مگر
خری رائے میں قباحت یہ تھی کہ دو چار اور لوگوں کو بھی محلّے کے بزرگ ہونے کا
تھا اور وہ اس دعوے سے دست بردار ہونا نہیں چاہتے تھے۔
باتیں ہوتی رہیں لیکن کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو سکا۔ آخر اس بات پر وقتی طور پر اتفاق ہو گیا
کہ کتاب کو افضل درزی کی دکان میں رکھ دیا جائے اور جب کوئی متفقہ فیصلہ ہو جائے
ے وہاں سے نکال لیا جائے۔
اس فیصلے پر عمل درآمد ہو گیا۔
میں جب بھی دکان کے سامنے سے گزرتا ہے تو کتاب استری والی چوکی کے اُوپر
پا تھا اور سمجھ لیتا تھا کہ ابھی اس کے بارے میں کوئی متفقہ فیصلہ نہیں ہو سکا۔
اور ایک دن کتاب وہاں ... نہیں تھی۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

میں نے سمجھ لیا کہ اہلِ محلہ کسی متفقہ فیصلے پر پہنچ گئے ہیں۔ مگر یہ فیصلہ کیا تھا، میں نہیں جانتا تھا۔

دوسرے یا تیسرے دن میری بڑی بہن نے کہا: "دلاور! بازار سے آرام کا اچار لادو۔" میں نے چنن دین پنساری کی دکان سے ایک آنے کا اچار خریدا اور گھر کی طرف جانے لگا۔ آتے ہوئے راہ میں اچار والے کاغذ پر نظر پڑی تو بھونچکا سا رہ گیا۔ یہ کاغذ لالہ ڈنی چند والی کتاب "یوسف زلیخا" کا ایک پھٹا ہوا ورق تھا۔ جس کے اکثر حروف اچار کے تیل نے تباہ کر دیئے تھے۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

آپا کی مُرغی

رات کے نوساڑھے نو بجے ہوں گے۔ خیرِ دالان میں اپنی چچی کی چارپائی کے پہلو میں
ولی پر سو رہی تھی۔ کئی دنوں اور راتوں کے بعد کہیں جا کر فضا کی ناقابلِ برداشت تمازت ختم
ئی تھی اور ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ اس لیے گھر کے دوسرے لوگوں کی طرح اس کی
ھیں بھی نیند سے بوجھل تھیں۔ یکایک اسے یُوں محسوس ہُوا کہ اس کے دائیں کان
ے اندر کوئی چیونٹی چلی گئی ہے اور کاٹ رہی ہے۔ اس نے چیونٹی کو مسلنے کی خاطر
یں ہاتھ کی ہتھیلی کو کان کے اُوپر زور زور سے پھیرا اور سمجھ لیا کہ وہ مر گئی ہے مگر چیونٹی
ت جان نکلی۔ بدستور اندر سُرسُر کر رہی تھی۔ اب کے اُس نے اپنی اُنگلی کان میں ڈالی اور
ں انداز سے اُسے باہر کھینچ لیا جیسے اُنگلی کے ناخن میں چیونٹی پھنس کر باہر آگئی ہے
را سے اس سے نجات مل گئی ہے۔ یہ اطمینان پا لینے کے بعد اس نے پہلو بدلا مگر اطمینان
یہ وقفہ بہت مختصر ثابت ہُوا کیونکہ اب کان کے اندر خراش ہونے لگی تھی۔

رات کو طبیعت ذرا بے چین ہو اور نیند نہ آئے تو آدمی کے ذہن میں دن بھر کے
عات کی یاد جاگ اُٹھتی ہے۔ چنانچہ اسے یاد آیا کہ سارا دن اس نے کیا کچھ کیا تھا۔ دن جمعہ
تھا، اس لیے وہ آپا کے ہاں پڑھنے نہیں گئی تھی۔ سات دنوں میں یہی ایک چھٹی کا روز
تھا۔ جب وہ صبح سے شام تک گھر ہی میں رہتی تھی۔ معاً اسے یاد آیا کہ جمعرات کے روز
آپا کے ہاں گئی تھی تو اس کے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا تھا۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

یہ آپا صرف اس کی آپا نہیں تھی سارے محلے کی آپا تھی۔ جو مدت سے محلے کے بچوں
کو قرآن مجید پڑھا کر گزر اوقات کر رہی تھی کیونکہ پندرہ سال پہلے اس کا شوہر فوت ہو گیا
تھا اور بال بچے اس کے تھے نہیں۔ بچوں کو سبق دے کر ماہانہ جو کچھ وصول ہوتا تھا اُسی
سے گھر کا خرچ چلاتی تھی۔ ہوا یُوں کہ آپا نے اس سے کہا "کوٹھڑی میں مُرغی کڑک بیٹھی ہے۔
دانہ پانی رکھ دے اس کے آگے۔"

آپا کے حکم کی تعمیل میں اس نے باورچی خانے میں جا کر مُٹھی بھر چاول تھالی میں ڈالے
مٹی کے پیالے میں پانی لیا اور چلی کوٹھڑی کی طرف۔ اندر بہت اندھیرا تھا۔ پہلے پہل تو
سے کچھ بھی دکھائی نہ دیا مگر آہستہ آہستہ ارد گرد کی چیزوں کی دُھندلی شکلیں سامنے
آنے لگیں۔ اس نے دیکھا کہ مُرغی تانبے کی مٹی کے پاس بیٹھی ہے اور اسے دیکھ کر کُڑ کُڑ
کر رہی ہے۔ اُس نے تھالی اس کے قریب رکھ دی مگر جیسے ہی پیالہ رکھنے لگی مُرغی نے
س نے زور سے اس کی پنڈلی پر چونچ ماری کہ وہ درد سے بلبلا اُٹھی۔

"نی پیارے پٹنے:" اس نے مُرغی کو مخاطب کر کے کہا اور جھٹ اپنا دوپٹہ اُتار کر
س کے اُوپر ڈال دیا اور اسے دوسرے لمحے میں اُٹھا کر مٹی کے اندر ڈال دیا۔ دوپٹہ اپنا
ر اکھینچ لیا اور ایک طرف جو پڑانا توا پڑا تھا اس سے مٹی کا منہ ڈھانک دیا۔ اسے
سوس ہو گیا کہ مُرغی اندر پھڑ پھڑا رہی ہے مگر اس نے توا نہ ہٹایا اور کوٹھڑی سے
ہر آ گئی۔

آپا سیدہ کو نیا سبق دے رہی تھی۔ اس نے نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھا کہ خیر کا چہرہ
سینے سے شرابور ہے اور اس نے اپنا دوپٹہ اوڑھنے کی بجائے بغل میں داب رکھا ہے۔
اس دن روٹیاں لگوانے کی اس کی باری تھی۔ آپا نے ہر لڑکی کے لیے ایک ایک
دن مقرر کر رکھے تھے اور انہی مقررہ دنوں میں لڑکیاں مائی بشاں کے تنور پر جا کر
آپا کی روٹیاں لگواتی تھیں۔ خیر کو اپنی ڈیوٹی کا احساس تھا اس لیے وہ آٹے کی پرات لے کر
رسے باہر نکل گئی۔ روٹیاں لگوا کر واپس آئی تو ایک بج چکا تھا۔ چھٹی ہونے والی تھی۔
کیاں دروازے سے ریکھڑی تھیں اور آپا کے حکم کا انتظار کر رہی تھیں۔ خیر نے جاری ہے

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

برات باورچی خانے کے اندر رکھی اور باہر نکل ہی رہی تھی کہ لڑکیوں کی آواز آئی۔

"آپاں توں سلام۔ ساڈی آپاں نوں سلام۔" سلام کہتے ہی لڑکیاں بھاگ گئیں اور
خیر اپنے تجربے کے متعلق کسی سے بھی کچھ نہ کہہ سکی۔ اس نے بھی سلام کیا اور گھر جانے
گئی۔

اس کا گھر اس کے ماں باپ کا گھر نہیں تھا۔ دونوں اُس وقت یکے بعد دیگرے
مر گئے تھے جب اس کی عمر سات برس کی تھی۔ ماں باپ کی اکلوتی بچی تھی اس لیے چچا چچی
سے اپنے ہاں لے آئے۔ ان کا اپنا ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی اور دونوں شادی کے
بعد لاہور سے باہر رہتے تھے۔ کبھی کبھی ملنے کے لیے آجایا کرتے تھے۔ گھر میں صرف
رہی تھی جو سارا کام کاج کرتی تھی۔ وہ آپا سے پڑھ کر واپس آتی تو چچی کھا پی کر حقہ لے کر
چارپائی پر جا بیٹھتی۔ اب اسے گھر کے کسی کام سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ سب کچھ گیارہ
سال کی لڑکی خیر ہی کرتی تھی۔ چچا سارا دن کپڑے کی دکان پر گاہکوں سے نپٹ کر واپس
آتا تھا تو اس کے پاؤں دبانا بھی اس کے فرائض میں داخل تھا۔

خیال کی رو تھمی تو اس نے انگلی دوبارہ کان میں ڈال دی اور جب ٹیس محسوس ہوئی
گھبرا کر بیٹھ گئی۔ چچا اور چچی گہری نیند سوئے ہوتے تھے وہ رو بھی پڑتی تو کیا ہوتا۔ چچا کی
آنکھ ہی نہ کھلتی اور چچی جھڑک دیتی "اب سو رہو۔ صبح دیکھا جائے گا۔" چچی کے اس قسم
کے سلوک کی وجہ سے وہ اُس سے عام طور پر خوف زدہ ہی رہتی تھی اور اس کے سامنے
اپنی کسی تکلیف کا اظہار نہیں کرتی تھی۔ چچا کو ضرور اس کی ہر تکلیف کا احساس ہوتا تھا۔
لیکن بیوی کے شور مچانے سے مجبوراً خاموش ہو جاتا تھا۔

بیٹھے بیٹھے چند منٹ گزر گئے تو اسے پھر مُرغی والا واقعہ یاد آگیا اور سارا نقشہ
اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ کس طرح اس نے ہاتھ کو اپنے دوپٹے میں لپیٹ
کر "کُڑ کُڑ" کرتی ہوئی مُرغی کی گردن کو زور سے پکڑ لیا تھا اور اسے مٹی کے اندر پھینک کر
اس کا منہ بھاری توے سے بند کر دیا تھا۔

یہ واقعہ اس نے کسی کو بھی نہ بتایا تھا۔ اس روز شام کے وقت حمیدہ اس کے

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ہاں آئی تو کہنے لگی: "خیری! پتہ ہے آپا کی مرغی گم ہو گئی ہے۔"

"اچھا گم ہو گئی ہے۔ کوئی لے گیا ہوگا۔" اس نے مسکرا کر کہا تھا۔

"کوئی چرا کر لے گیا ہے۔ اتنی موٹی مرغی تھی۔ آپاں نے سارے محلے میں ڈھونڈا پر نہیں ملی۔"

"تو۔ آپاں کیا کرے گی؟"

آپاں کو بڑا دکھ ہوا ہے۔ اتنا کچھ کھلا کر اسے پالا تھا اور وہ جو مرغا ہے ناں آپاں کا۔ بڑا ہی اداس ہے۔" حمیدہ نے زور سے قہقہہ مارا۔

"اس کی بیوی جو مر گئی ہے۔" خیری نے بھی قہقہہ مار کر کہا۔

"مری کہاں بی خیری گم ہو گئی ہے۔"

حمیدہ اطلاع دے کر چلی گئی۔ خیری کا جی چاہا کہ اسے بتا دے کہ وہ مٹی کے اندر میٹھی نیند کر رہی ہے۔ مگر یہ فقرہ اس کی زبان پر آنہ سکا۔ وہ سب کو حیران پریشان کر دینا چاہتی تھی۔ سہیلی کے جانے کے بعد وہ خود بخود مسکراتی رہی تھی۔

وہ دوبارہ لیٹ گئی کیونکہ اب درد ختم گیا تھا اور ہوا کے جھونکے نیند کا غبار بن کر آنکھوں کو چھو رہے تھے۔ وہ سو گئی اور صبح اس وقت بیدار ہوئی جب چچی نے اس کے سرہانے آکر شانہ ہلاتے ہوئے کہا،

"نی مُردارے! سارا دن سوتی رہے گی۔" چچی کی آواز سن کر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ سورج طلوع ہو چکا تھا۔ آپا کے ہاں جانے کا وقت ہو چکا تھا۔ مگر وہ جا نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ وہاں جانے سے پہلے اسے ہر روز رات کے جھوٹے برتن مانجھنا ہوتے تھے۔ دالان میں جھاڑو دینا ہوتی تھی۔ ان کے علاوہ بازار سے گلچے بھی لانا پڑتے تھے۔ اس روز بھی اسے یہ سارے کام کرنا تھے اور وہ کام کرنے لگی۔ ناشتہ کرنے کے بعد جب وہ آپا کے گھر کی طرف روانہ ہوئی تو نو بج چکے تھے۔ راستے میں عائشہ ملی جو بازار سے کچھ خرید کر جا رہی تھی۔

"خیری! اتنی دیر سے کیوں آئی ہو۔ دو بار تمہارے گھر گئی تھی تمہیں بلانے کے لیے۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

آپاں نے کہا تھا۔ خیری کو فوراً بلا کر لاؤ۔"

"مجھے تو پتہ نہیں۔"

"تیری چاچی نے تجھے بتایا نہیں تھا؟"

"نہیں۔"

"تو چل۔ آپاں تیرا انتظار کر رہی ہے۔ آج مزا آجائے گا۔" عائشہ ہنس دی اور خیری نے اس سے پوچھا بھی کہ اسے مزا کیوں آئے گا مگر عائشہ بھاگ کر چلی گئی۔

کوئی اور موقعہ ہوتا تو وہ ضرور اپنی سہیلی کے پیچھے بھاگتی۔ مگر وہ پہلے ہی دیر سے پڑھنے کے لیے جا رہی تھی اس لیے آپا کے ڈر سے بھاگ نہ سکی اور اپنے راستے پر چلتی رہی۔ آپا کا گھر کچھ دور رہی تھا کہ اس کی نظر عائشہ کی ماں پر پڑی جو کوئی چیز اٹھائے ایک طرف جا رہی تھی۔ عائشہ بھی اس کے ساتھ آپا سے پڑھتی تھی۔ چونکہ اس کا باپ ریڑھی پر سبزی لگا کر رزق روٹی کماتا تھا، اس لیے گھر میں غریبی رہتی تھی۔ عائشہ فیس ادا نہیں کرتی تھی۔ البتہ اس کی ماں ہفتے میں ایک دو بار آپا کے یہاں آکر اس کا سارا کام کاج کر دیتی تھی یوں آپا کو عائشہ کو مفت پڑھانے پر کوئی اعتراض نہ ہوتا تھا۔

'ماسی کیا لیے جا رہی ہے؟' خیری کے دل میں سوال اٹھا اور وہ اُدھر جانے لگی جدھر عائشہ کی ماں جا رہی تھی اور جیسے ہی اس نے ماسی کے ہاتھ میں مُردہ مُرغی دیکھی اس کے قدم بے اختیار رُک گئے۔ اسے بڑا افسوس ہوا، کیونکہ جب سے مُرغی نے انڈے دینے شروع کیے تھے۔ آپا نے اسی کو اُس کی خدمت پر مامور کر دیا تھا۔ وہ چھٹی کے وقت تک برابر اس کا خیال رکھتی تھی اور وہ جہاں کہیں بھی ہو، تلاش کر کے اسے دانہ کھلا دیتی تھی اور آج وہ مُردہ تھی۔ جب اس نے اسے مٹی کے اندر ڈالا تھا تو یہ زندہ تھی۔ مر کیسے گئی۔

"ماسی! مر گئی؟"

"مر گئی ہے"

"ہائے میرے اللہ۔ مر کیوں گئی؟" اس نے ماسی سے پوچھا۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ماسی ایک لمحہ خاموش رہی پھر بولی: "یہ تجھے آپاں بتائے گی کہ کس طرح مر گئی۔"

ماسی مسکرا رہی تھی۔ خیر نے اس کی مسکراہٹ کی طرف دھیان نہ دیا اور دائیں جانب مڑ گئی۔ ماسی اس جگہ جا رہی تھی جہاں محلے کے لوگ اپنی گندی مندی چیزیں پھینک دیا کرتے تھے اور جہاں سے ان گندی چیزوں کو لاہور میونسپل کی گاڑی اٹھا کر نہ جانے کہاں لے جاتی تھی۔ خیر نے جیسے ہی دروازے کے اندر قدم رکھا آپا گرجی" نی لے خیرے! دوپہر کو کیوں آئی ہے؟"

خیر نے ادب سے نظریں جھکا کر جواب دیا۔"

"آپاں جی! رات کو کان میں درد بڑا سخت تھا!"

"کان میں بڑا سخت درد تھا اور تو ہسپتال سے آئی ہے؟"

"جی نہیں۔"

"خیر آگے بڑھ کر حمیدہ کے پہلو میں چٹائی پر بیٹھنے لگی کہ آپا پورے زور سے گرجی۔ "ادھر آ۔" خیر نے جو نظر اٹھا کر دیکھا تو آپا نے ہاتھ میں بید لیا تھا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ آگے جانا اس کی طاقت سے باہر تھا۔ سنتی نہیں۔ کانوں میں روئی ٹھونس لی ہے۔"

"جی آپاں!" خیر نے مریل آواز میں کہا۔

"سامنے آ!" خیر ڈرتے ڈرتے سامنے پہنچ گئی۔

"مرغی مٹی کے اندر کیسے چلی گئی تھی؟" آپا نے سوال کیا۔

"اڑ کر چلی گئی تھی۔" یہ فقرہ کہہ کر خیر نے سامنے دیکھا۔ عائشہ اور حمیدہ دونوں مسکرا رہی تھیں۔

"اچھا مرغی اڑ کر مٹی کے اندر چلی گئی تھی۔ وہ کیسے؟"

خیر آپا کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ اپنی سہیلیوں کی طرف دیکھ رہی تھی جو برابر مسکرا رہی تھیں۔ یہ مسکراہٹ اسے شہ دے رہی تھی کہ آپا کو بیوقوف بنائے اور اس نے جھٹ کہہ دیا "آپاں جی وہ یوں اڑی جیسے دڑبے میں چلی جاتی ہے۔"

"اور اس مٹی کے اوپر بارہ سیر کا توا تیری ماں نے آگے رکھا تھا؟" خیر نے یہ بات تو سوچی

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ہی نہیں۔ کیا جواب دیتی۔ اپنی سہیلیوں کو تکے جا رہی تھی۔ آپا کی آواز گونجی "نی چڑیل! بولتی کیوں نہیں؟"

"وہ آپاں۔ گر پڑا تھا۔"

"آسمان سے۔ ہے ناں" اور یہ کہتے ہوئے آپاں نے دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے بید کو بلند کیا۔

"نکالو ہاتھ۔" خیر آپا کے بید سے بہت ڈرتی تھی اس لیے دونوں ہاتھ اپنی بغلوں میں چھپا لیے۔

"نکالو ہاتھ۔ سنتی نہیں ہو۔ بے زبان مرغی کو مٹی میں بند کر کے مار ڈالا۔ میری انڈے دینے والی مرغی۔ نکالو ہاتھ۔"

خیر نے دایاں ہاتھ آگے بڑھایا اور اس سے پیشتر کہ بید اس پر برسے ،جلدی سے پیچھے ہٹا لیا۔ عائشہ اور حمیدہ ہنس پڑیں۔ سہیلیوں کو ہنستے دیکھ کر خیر کے منہ سے بھی قہقہہ نکل گیا۔ آپا کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔ اس نے پیڑھی کو آگے کھسکایا اور بائیں ہاتھ سے خیر کا دایاں ہاتھ پکڑ لیا۔ خیر نے مٹھی بھینچ لی "کھول ہاتھ" آپا نے حکم دیا۔

"آپاں! میں مرغی لا دوں گی۔"

"کہاں سے لا دے گی؟"

"گھر سے۔"

"اچھا گھر سے مرغی لا دے گی۔ مذاق اڑاتی ہے میرا کم بخت۔ چڑیل۔ منہ کالی۔" اور آپا نے پورے زور سے بید اس کی مٹھی پر مارا۔ درد کی شدت سے خیر چیخ اٹھی۔

"ہائے میں مر گئی۔"

"تو کہاں مرتی ہے۔ مرنے والی مرگئی بے چاری۔ چڑیل۔ قصاب کی اولاد۔" خیر کو یکدم یوں محسوس ہوا جیسے آپا نے اس کے سینے کے اندر ہاتھ ڈال دیا ہے۔ وہ اپنے ماں باپ کی بڑی عزت کرتی تھی۔ ایک بار چچی نے مارا تھا تو اس نے رات کو جاگ کر

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ماں سے کہا تھا:

"اماں! تُو جہاں چلی گئی ہے مجھے بھی بُلا لے"، اور اس رات اس نے ماں کو خواب میں دیکھا تھا کہ اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر تسلی دے رہی ہے۔ اس نے باپ کو نہیں دیکھا تھا مگر ماں جب تک زندہ رہی تھی اس کے باپ کو فرشتہ بتایا کرتی تھی لیکن آپا انہیں قصاب کہہ رہی تھی۔ اسے غصہ آگیا: "آپاں میرے ماں باپ کو..." جذبات کو شدت سے اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

"اچھا تیرے ماں باپ فرشتے تھے۔ کیوں بے چڑیل" اور آپا کے غصے کا پارہ چڑھتا چلا گیا اور اس کا بید خیر کے جسم کے مختلف حصوں پہ برستا رہا۔ خیر چیختی رہی، چلاتی رہی آپا نے اس کے رونے دھونے کی بالکل پروانہ کی۔ اس کا ہاتھ مسلسل حرکت کرتا رہا۔ یہاں تک کہ خیر تیورا کر گر پڑی۔ اس کے دائیں ہاتھ کی اُنگلی سے لہُو بہہ رہا تھا۔ آپا کا ہاتھ رُک گیا "چل دفع ہو جا چڑیل"۔ خیر جلدی سے اُٹھ بیٹھی اور پیچھے ہٹ گئی۔ اس میں کھڑے رہنے کی طاقت نہیں تھی۔ مگر بیٹھ بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ آپا ابھی تک خونخوار نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

وہ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی۔ یکایک اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ اُسے یوں لگا جیسے آپا کی خوفناک آنکھیں اس کے بہت قریب آگئی ہیں۔ اس کا بید اس کی چھاتی میں دھنسا جا رہا ہے اور وہ چیخ مار کر گر پڑی۔ اس کے بعد اسے معلوم نہیں ہو سکا کہ کیا ہُوا اور کس طرح وہ اپنے گھر میں پہنچ گئی۔

وہ کمرے کے اندر چچی کی چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ ایک گھنٹے سے ہوش میں [illegible] چچی اس کے پاس کرسی پہ بیٹھی تھی اور چچا بازار سے دودھ لا کر واپس دکان [illegible] گیا تھا۔ خیر کو درد کا احساس نہیں تھا۔ کیونکہ وہ ابھی تک بُری طرح خوفزدہ تھی آ [illegible] بار بار اس کی نظروں کے سامنے آجاتی تھی اور ہر بار خوف و دہشت کی ایک [illegible] لہر اس کی رگ رگ میں سرایت کر جاتی تھی۔ وہ کانپ کانپ جاتی تھی۔ چچی [illegible] زخمی اُنگلی پہ پڑا اپنے کپڑے کا ایک ٹکڑا لپیٹ دیا تھا مگر لہو تھا کہ کپڑے [illegible] اُس کی آنکھیں

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

...لی تھیں لیکن وہ اردگرد کے ماحول سے بے خبر تھی۔ چچی کے چہرے کو دیکھتی تھی تو یہ چہرہ دیکھتے ہی دیکھتے آپا کا خوفناک چہرہ بن جاتا تھا اور وہ فوراً خوف سے آنکھیں بند کر لیتی تھی۔

حمیدہ کی ماں باورچی خانے کے اندر خیر کے لیے دودھ گرم کر چکی تھی۔ وہ گلاس میں ڈال لے آئی "دودھ پیئے گی خیری!" حمیدہ کی ماں نے اس کے پاس آ کر پوچھا۔ یہ الفاظ خیر کے کانوں میں پہنچ گئے تھے مگر وہ نہ جانے کیوں ان کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھے۔ بس ٹر ٹر حمیدہ کی ماں کو دیکھ رہی تھی۔ اب کے چچی نے یہی بات کہی لیکن خیر نے آنکھیں بند کر لیں۔ حمیدہ کی ماں گلاس ہاتھ میں لیے کھڑی تھی اور آپا کی بے رحمی کا ذکر کر رہی تھی "توبہ آپا پاگل ہو گئی تھی۔"

"پاگل کیوں نہ ہوتی۔ اس نے اس کے انڈے دینے والی مرغی مٹی میں بند کر کے مار دی تھی۔ شرارت سوجھی تھی کم بخت کو۔ کوئی لڑکی ایسی شرارت بھی کرتی ہے؟"

خیر رونے لگی۔ روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ حمیدہ کی ماں نے اسے تسلی دی، دودھ پینے پر اصرار کیا مگر نہ تو اس کے آنسو تھمے اور نہ اس نے دودھ کے گلاس کو ہاتھ لگایا۔ چچی نے سخت الفاظ بھی کہے پر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔

آہستہ آہستہ اس کی حالت ٹھیک ہونے لگی۔ اگرچہ اس کے ہاتھ اور پیٹھ میں درد ہو رہا تھا تاہم وہ چل پھر سکتی تھی۔ بازار سے سودا سلف لے آتی تھی مگر آپا کے ہاں جانے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ چچی نے سختی سے آپا کے ہاں جانے کے لیے کہا۔ چچا نے سمجھایا لیکن آپا کا نام آتے ہی وہ رونا شروع کر دیتی تھی۔ ایک روز حمیدہ بلانے کے لیے آئی تو چچی نے خیر سے مخاطب ہو کر کہا:

"پڑھنے جائے گی یا نہیں؟"

خیر ناشتہ کرنے کے لیے گھڑے پر بیٹھ کر ہاتھ منہ دھو رہی تھی اس نے منہ پر دوسرا چھپکا مارا تھا کہ اس کے ہاتھ رک گئے۔

"میں پوچھتی ہوں جائے گی کہ نہیں؟" چچی نے دوسری مرتبہ پوچھا مگر خیر تھی کہ نہ ہاں کہتی تھی اور نہ ناں گم سم بیٹھی تھی۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

حمیدہ بولی: "آپاں کہتی ہے نہیں آئے گی تو میں خود اگر لے جاؤں گی۔"

یہ الفاظ سنتے ہی خیر نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ چچی اس کی چیخ پکار برداشت نہ کر سکی اور اس نے لڑکی کو روئی کی طرح دھنک دیا۔ رو دھو کر خیر گھر سے باہر نکلی۔ چچی نے سمجھا کہ آپا کے ہاں گئی ہے اور وہ مطمئن ہو کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ شام ہو گئی تھی اور خیر واپس گھر نہیں آئی تھی۔ چچی کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ برقعہ لے کر آپا کے ہاں پہنچ گئی۔ معلوم ہوا کہ خیر ایک لمحے کے لیے بھی وہاں نہیں گئی۔ کچھ دیر بعد پتا چلا کہ وہ حمیدہ کے گھر میں ہے اور اپنے گھر آنے کے لیے تیار نہیں۔ چچا دکان سے آیا تو وہ اس وعدے پر اسے واپس لایا کہ اسے کبھی آپاں کے ہاں جانے کے لیے نہیں کہا جائے گا۔ وہ چچا کے وعدہ کرنے پر واپس اپنے گھر میں آگئی۔

دن گزرتے جا رہے تھے اور آپا کی طرف سے جو خوف خیر کے دل میں بیٹھ گیا تھا وہ کسی صورت بھی کم نہیں ہوتا تھا۔ کم بھی نہیں ہوتا تھا۔ اُدھر آپا کا ذکر ہوا اور اِدھر خیر کا چہرہ زرد پڑا۔ بازار میں کوئی چیز خریدنے جاتی تھی تو آپا کے مکان کے سامنے سے نہیں گزرتی تھی۔ اگر حمیدہ کے ہاں جانا پڑتا تھا تو وہ لمبا فاصلہ طے کر کے جاتی تھی کیونکہ حمیدہ کا گھر آپا کے مکان کے پیچھے واقع تھا۔ صبح ناشتے کے بعد اس کی چچی کا یہ معمول بن چکا تھا کہ وہ خیر کو سختی کے ساتھ آپا کے گھر جانے کے لیے کہے اور جب وہ خاموش کھڑی رہے تو طمانچے مار مار کر اس کے دونوں رخسار سرخ کر دے۔ وہ مار کھاتی تھی، جھڑکیاں سہتی تھی مگر آپا کے ہاں جانے کا نام نہیں لیتی تھی۔

ایک روز دوپہر کو حمیدہ کی ماں اس کے یہاں آگئی اور اس نے بتایا آپاں کہتی ہے مہینے کے پیسے دو۔ چچی پیسے دینے پر رضامند نہیں تھی۔ وجہ یہ تھی کہ پورے مہینے میں خیر شاید دو مرتبہ پڑھنے کے لیے گئی تھی۔ حمیدہ کی ماں چلی گئی لیکن چند منٹ کے بعد ہی واپس آگئی۔

"آپاں کہتی ہے۔ خیر کی بچی پڑھنے نہیں آئی تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں نے پڑھانے سے انکار نہیں کیا۔"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

بات معقول تھی۔ خیر کی چچی کو دوپٹے کے پلّو کی گانٹھ کھول کر چار روپے دینے
پڑے۔ مگر حمیدہ کی ماں کے جاتے ہی خیر پر پل پڑی اور اس پر سارا غصّہ نکالنے
لگی۔ وہ چپ چاپ مار کھائے جا رہی تھی مگر جیسے ہی چچی نے اس کی موئی ماں کو گالیاں
دینی شروع کیں اس کے عضو عضو میں تناؤ پیدا ہو گیا۔ "چاچی! میری ماں۔"
"چل نی گشتئے۔ جیسی تُو ویسی تیری ماں گشتی۔"
"چاچی! منہ سنبھال۔" خیر کے منہ سے نکل گیا۔ اب کیا تھا۔ چچی کے دونوں ہاتھ
بڑی تیزی سے حرکت کرنے لگے۔ اسی تیزی سے اس کی زبان بھی چل رہی تھی۔ اسی
وقت چچا آ گیا۔ کبھی کبھی اس کے سر میں شدید درد ہونے لگتا تھا۔ اس حالت میں
دکان پر بیٹھنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا تھا اور وہ آرام کرنے کے لیے گھر آ جاتا تھا۔ اس
دن بھی اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ اس کی طبیعت پہلے ہی بیزار تھی۔ گھر میں یہ منظر
دیکھ کر وہ اور بیزار ہو گیا۔
"یہ کیا بکواس ہے۔ ہر روز بک بک جھک جھک۔"
"گشتی مجھ پر ہاتھ اُٹھاتی ہے۔" چچی نے انتہائی مبالغے سے کام لیا تاکہ اس کا شوہر
بھی لڑکی کا دشمن ہو جائے۔
"خیری!" چاچا گرجا۔
"نہیں چاچا۔" خیر نے بمشکل یہ الفاظ منہ سے نکالے۔
چچا نے بیوی سے مخاطب ہو کر کہا "تُو لڑکی کو گھر میں نہیں دیکھ سکتی تو میں اسے
یتیم خانے میں داخل کرا دوں گا۔"
خیر کانپ اُٹھی۔ وہ یتیم بچوں کو گلی میں مانگتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔ مَیلے کچیلے کپڑے
ناک بہتی ہوئی، چہرے زرد، انہیں دیکھ کر ڈر آتا تھا۔
چچی کے ہاتھ اور خیر کی چیخ پکار رُک گئی۔ شام کے قریب خیر چچا کے پاس آئی جو
چارپائی پر لیٹا ہوا حقّہ پی رہا تھا۔ وہ زمین پر بیٹھ کر اس کا سر دبانے لگی۔ چچا نے اس کی
طرف دیکھا۔ خیر کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔ "کیا ہے؟" چچا نے پوچھا۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"چاچا!"

"ہوں"

"چاچاجی! مجھے۔چاچاجی!۔۔مجھے۔۔۔چاچا!" رقت کے سبب اس کے ہونٹوں سے مکمل فقرہ نہیں نکل رہا تھا۔

"ہاں ہاں"

"یتیم خانے میں ناں ناں ناں" خیر کی ہچکی بندھ گئی۔

چچا نے حقے کی نے منہ سے ہٹا دی۔ اس کے دل میں رحم آ گیا تھا۔

"یتیم خانے میں نہیں جانا چاہتی؟" خیر نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "پڑھنے کے لیے جائے گی؟" خیر اثبات میں سر ہلانے لگی۔ "اچھا میں تیری چچی سے کہہ دوں گا کہ تجھے کچھ نہ کہے کب جائے گی؟"

"تھوڑے دن بعد"

"عید کے بعد؟"

"ہاں۔عید۔کے۔بعد"

عید آئی۔ خیر کے چچا نے خیر کو دو روپے عیدی کے دیے۔ دو روپے اسے ٹھیکیدار کے گھر سے مل گئے۔ چار روپے اس کے پاس جمع ہو گئے۔ عید کے روز وہ عائشہ اور حمیدہ کے ساتھ پر وہ باغ میں جا کر نان کباب بڑے شوق سے کھایا کرتی تھی مگر اس عید کو اس کی دونوں سہیلیوں نے پورا پورا زور لگایا کہ وہ ان کے ساتھ باغ میں جائے۔ پر وہ جانے پر رضامند نہ ہوئی۔ اور سر درد کا بہانہ کر کے گھر میں بیٹھی رہی عید کے دوسرے روز وہ دوپہر کے وقت مائی تاباں کے گھر پہنچ گئی۔ مائی تاباں انڈوں اور مرغیوں کا کاروبار کرتی تھی۔ "اماں چاچی کہتی ہے۔ ایک مرغی دے دو۔ انڈوں والی"

"پیسے لائی ہو؟"

"لائی ہوں۔ چاچی کہتی ہے ایسی مرغی دینا جو ڈھیر سارے انڈے دے"

مائی تاباں بولی میں ایسی ویسی مرغیاں نہیں رکھا کرتی۔ اچھی نسل کی مرغی ہے۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

سے پیسے نکال کیا لائی ہے"۔
خیرن نے مٹھی کھول دی۔ روپے روپے کے چار نوٹ زمین پر گر پڑے۔
"کُل چار؟ میری مُرغی تو پانچ کی ہے۔ ایک روپیہ اور لا۔"
"لادوں گی۔ اماں یا۔ میری اماں پہلے ناں تو۔"
تاباں ہنس پڑی "اچھا لے جا۔" اور اس نے ایک سفید مرغی ڈربے میں سے
اور خیرن نے اسے پکڑ لیا۔ مائی تاباں کے گھر سے باہر آ کر اس کے قدم آپا کے مکان
ت اُٹھنے لگے۔ آپا لڑکیوں کو پڑھا کر فارغ ہو چکی تھی اور کھانا کھانے کی تیاری
ہی تھی۔ وہ چارپائی کے اوپر بیٹھی تھی اور عائشہ کی ماں باورچی خانے میں سالن برتن
ال رہی تھی۔ یکایک ایک بھاری شے آپا کے سینے پر آ گی۔ آپا گھبرا گئی۔ اس نے دیکھا
سفید رنگ کی مُرغی اس کی چارپائی سے نیچے چھلانگ لگا رہی ہے اور دروازے
سے خیرن باہر جا رہی ہے۔ خیرن جس تیزی سے باہر نکلی اسی تیزی سے اپنے گھر پہنچ
وہاں جا کر وہ توسا کوٹھڑی کے اندر چلی گئی اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ چچی نے
یہ کارروائی کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ کوٹھڑی کا دروازہ زور سے بند ہوا تو وہ پریشان

"یہ چڑیل کیا کر رہی ہے۔" اور وہ دروازے پر پہنچ کر زور زور سے اس پر ہاتھ
نے لگی۔
خیرن نے دیوار سے اپنی پیٹھ کو لگا رکھا تھا۔ دروازے پر شور بڑھتا جا رہا تھا مگر وہ
کی وہیں کھڑی تھی۔ چچی نے دروازہ توڑنے اور اسے جان سے مارنے کی
ھی دی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔
اچانک شور ختم ہو گیا۔ ایک آواز آئی "کھول دے دروازہ۔ خیرن بیٹی۔"
خیرن کے قدم بڑھنے لگے۔ دروازے پر آ کر رک گئے۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔
نے آپا کھڑی تھی جس نے اسے اپنے بازوؤں پر اٹھا لیا۔ "خیرن بیٹی۔" اور آپا کی آنکھیں
ہو گئیں۔ خیرن مسکرا رہی تھی اور اس کی چچی اور حمیدہ کی ماں یہ منظر دیکھ کر حیران ہو
ئیں۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

پڑھی لکھی زینب

بڑی مدت گزر رہی کہ وہ شام آئی تھی اور جب آئی تھی تو ہماری گلی میں ایک دُلہن بھی آگئی تھی۔ جو اس وقت مائی میراں دھوبن کے مکان کی بالائی منزل میں واحد کمرے سے ملحق کوٹھڑی کے اندر ایک اُونچے پلنگ کے رنگین پائے کا سہارا لیے بیٹھی تھی۔ جھلمل کرتے ہوئے سُرخ جوڑے میں ملبوس، ہاتھوں پر مہندی کے ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے کہیں موٹے اور کہیں باریک خطوط۔ کانوں میں سونے کی بالیاں۔ ناک میں نتھ اور ماتھے پر کئی رنگوں والا ٹیکہ۔ سن بیس اکیس برس سے زیادہ نہیں تھا۔ چٹا سُرخ کتابی چہرہ جسے وہ شرما کر بار بار گھونگھٹ میں چھپا لیتی تھی مگر اُسی لمحے کئی ہاتھ ایکدم حرکت میں آجاتے تھے اور گھونگھٹ ہٹا دیتے تھے۔

ایک گھر میں دلہن آئے اور بجے باجے، شادی شدہ عورتیں طوفانی رفتار سے وہاں نہ پہنچ جائیں یہ ممکن نہیں اور اس موقعے پر بھی گلی کیا محلے بھر کے بچے "ڈوٹی ڈوٹی" بکتے ہوئے مائی میراں کے مکان میں جمع ہو گئے تھے۔ ابھی دُلہن کی ڈولی مکان سے کچھ دُور ہی تھی اور جب تک ڈولی آئے درجنوں بچوں، لڑکیوں اور عورتوں نے مکان کی اُوپر کی منزل اور اُس منزل کو جانے والی سیڑھیوں پر اِس طرح قبضہ جما رکھا تھا کہ کہیں ایک انچ جگہ بھی خالی نہیں رہی تھی۔ اور ابھی آنے والوں کا تانتا بندھا ہُوا تھا۔

ڈولی آئی تو مائی میراں اور اُس کی دونوں بیٹیاں پیشوائی کے لیے گلی کی نکڑ پر چلی گئیں اور

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

کے ساتھ ساتھ واپس آنے لگیں۔ ڈولی پہنچنے کو تو سیڑھیوں کے نیچے پہنچ گئی لیکن دُلہن
پر لے جانا ایک بہت بڑا مسئلہ بن گیا۔ اگر اُن لمحوں میں سرداراں بی بی اپنی گھن گرج اور
ڈانٹ ڈپٹ سے کام نہ لیتی تو دُلہن صبح تک ڈولی ہی میں بند رہتی اور جنوری کی سردی
وجود شاید دم گھٹ کر مر جاتی۔ سرداراں کا رعب داب کام آیا اور اُس نے کسی نہ کسی طرح
کو کوٹھڑی میں پہنچا دیا جو پلنگ کے پائے سے پیٹھ لگائے شرما بھی رہی تھی اور مضطرب
تھی۔ دلہن کو جس نے بھی دیکھا اُس نے بآوازِ بلند نہیں تو دل میں ضرور کہا "ہائے اتنی پیاری
اور دھوبیوں کے گھر میں" اور سرداراں نے تو سیڑھیوں سے اُترتے ہوئے اللہ رکھی
صاف صاف کہہ دیا:

"دوڑی کیا ہے حُور ہے حُور۔ کیا لاہور میں اور کوئی گھر نہیں ملا تھا اِس کی ماں کو؟"

سچی بات یہ ہے کہ لاہور میں زینب کے لیے گھروں کی کوئی کمی نہیں تھی مگر جو گھر بھی ملتا
ابا کسی درزی ہی کا نسبتاً امیر گھر ہوتا کیونکہ زینب کے باپ کا جدی پیشہ درزی ہی کا
تھا اور پھر زینب کے معاملے میں ایک خاص مجبوری کو بھی پیشِ نظر رکھنا پڑا تھا۔ مجبوری
کہ زینب کا باپ کچھ مدت سے نشے کا عادی ہو کر گھریلو ذمے داریوں سے بہت حد تک
نیاز ہو گیا تھا۔ ایسے میں زینب کی ماں کو مشورہ دیا گیا کہ جتنی جلدی ہو لڑکی کو بلے لگا دو۔
کے لچھن اچھے نہیں۔ گھر تباہ ہو جائے گا اور ماں نے اِس مشورے پر عمل کرنے کے لیے
دھوپ شروع کر دی۔ مائی میراں کا منجھلا بیٹا چراغ دین عرف چاگا تھا تو ذات کا دھوبی
پیشے کے اعتبار سے تھا درزی اِس لیے زینب کے گھر کے لوگ اِس رشتے پر راضی
گئے اور زینب شرعی نکاح کے بعد چراغ دین کی بیوی بن گئی۔

زینب کی خوبصورتی کے چرچے پُورے محلے میں ہو رہے تھے کہ ایک روز ماسی حسناں
ہمارے گھر آ کر بتایا: "زینب پڑھی لکھی ہے۔" وہ یہ خبر میری امّی کو بتا رہی تھیں کہ میں نے
چاہ" ماسی! اُس نے کتنی جماعتیں پاس کی ہیں؟"

بولیں "بچہ! میں کیا جانوں۔ میں گھر کا سامان خریدنے لوہاری منڈی جاتی تھی تو وہ
اُٹھائے سکول سے واپس آیا کرتی تھی۔ تو خود پوچھ لے ناں جا کر۔ پر وہ تھوڑی کرے گی

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

تجھ سے۔"

مائی میراں کا گھر ہمارے گھر سے چند گز کے فاصلے پر تھا۔ مگر میں کبھی وہاں گیا نہیں تھا۔ کبھی اِس کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ میلے کپڑے، مائی میراں یا اُس کا سب سے چھوٹا بیٹا لے جاتا تھا اور دُھلے ہوئے کپڑے بھی اسی طرح ہمیں مل جاتے تھے۔ البتہ اُس شام اپنی بہن کے ساتھ دُلہن دیکھنے میں ضرور گیا تھا اور فوراً واپس آ گیا تھا۔ اب جو سُنا کہ زینب پڑھی لکھی بھی ہے، تو دل میں اُسے دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔ اتفاق یہ ہوا، کہ دوسرے روز میں کرکٹ کھیل کر اپنے محلے کے دوست لطیف کے ساتھ گھر کی طرف آ رہا تھا کہ گفتگو زینب کے بارے میں ہونے لگی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے ساتھ بہت سی کتابیں بھی لے کر آئی ہے اور یہ ساری کتابیں ایک ٹرنک میں بند ہیں۔ اُس نے یہ بھی اطلاع دی کہ وہ خود اُس کے پاس گیا تھا اور ایک کہانیوں کی کتاب بھی مانگ کر لے آیا تھا۔

میں حساب کے مضمون میں ہمیشہ کمزور رہا تھا۔ اُستاد گھر کے کام میں دو چار حساب کے سوال بھی دے دیتے۔ باقی کام تو بڑی آسانی کے ساتھ کر لیتا مگر مشکل اُس وقت پیش آتی جب کوئی سوال حل کرنے کی کوشش کرتا۔ یہ کوشش عام طور پر کبھی کامیاب نہ ہوتی اور میں یا تو کسی ہوشیار طالب علم کے ہاں جا کر اُس کی کاپی سے سوال نقل کر لیتا یا پھر دوسرے دن سوال حل نہ کرنے پر سزا پاتا۔ اب جو سُنا کہ زینب پڑھی لکھی خاتون ہے تو سوچ لیا کہ آئندہ اُس سے پوچھ کر ریاضی کی مصیبت سے نجات پا لیا کروں گا۔ یہ بات سوچ کر دل کو اطمینان سا ہو گیا اور چند روز بعد جب ریاضی کے ماسٹر جی نے حساب کے چار پانچ سوال دیے تو میں نے امی سے پوچھا "امی! کیا کروں۔ سوال بڑے مشکل ہیں؟"

"تو میں کیا کروں۔ سکول کیا کرنے جاتا ہے۔ ماسٹر سمجھاتا نہیں؟"

"امی! بہت ہی مشکل ہیں۔ لطیف کہتا ہے۔ نئی آپا بڑی پڑھی لکھی ہے۔"

"نئی آپا کون؟"

"وہ جو ہے چراغ دین کی بیوی۔"

"ہے زینب؟"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ہاں امّی! بڑی لائق ہے۔ چلا جاؤں اُس کے پاس؟"

امّی کو اس بات پر یقین ہی نہیں آتا تھا کہ دھوبیوں میں بھی کسی مرد یا عورت کو پڑھنا لکھنا
ا ہے۔ میں نے بہت اصرار کیا تو انہوں نے اتنی اجازت دی کہ اُس سے جا کر صرف یہ پوچھ
ں کہ آپ ریاضی جانتی ہیں یا نہیں۔

جیسے ہی میں نے سب سے اُوپر کی سیڑھی پر قدم رکھا ایک عجیب قسم کی تیز خوشبو سے
را دماغ پریشان ہو گیا۔ ایسی خوشبو میں نے زندگی میں کبھی نہیں سُونگھی تھی۔ گھبرا کر نیچے جانا
ہتا تھا کہ ایک نرم اور لطیف سی آواز آئی۔

"دلاور!"

"ہیں یہ تو میرا نام بھی جانتی ہے۔"

"آؤ نا۔ یہاں کوئی ڈائن چڑیل تو نہیں۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ میں نے دیکھا وہ اس
ت کھُرے کے کنارے بیٹھی اپنی ہاتھی دانت کی چوڑیاں کوئی انگریزی صابن لگا لگا کر دھو
ی تھی۔ میں اُوپر چلا گیا۔

"امّی نے پوچھا ہے۔ آپ ریاضی جانتی ہیں آپا؟"

"تمہاری امّی نے کیوں پوچھا ہے؟"

"میں... مجھے..... میں ریاضی میں کمزور ہوں" ابھی تک میری گھبراہٹ دُور نہیں
ی تھی۔

"میں نے چھٹی جماعت میں سکول چھوڑ دیا تھا۔ بہت ساری کتابیں پڑھی ہیں پر ریاضی
ٹی جماعت تک جانتی ہوں۔ وہ بھی تھوڑی سی۔"

کتابوں کا ذکر چلا تو اُس نے بتایا کہ وہ بے شمار کتابیں پڑھ چکی ہے۔ اس نے بعض
ی کتابوں کے نام بھی بتائے جو اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں سُنے تھے۔ حساب کے سوال
ں کرنے لگی تو میری طرح کوری نکلی لیکن اُس کی علمیت کا مجھ پر رعب بیٹھ چکا تھا۔

اُس دن کے بعد زینب آپا کے ہاں جانا میرا اور لطیف کا دستور العمل بن گیا۔ صبح تو جا
یں سکتے تھے کیونکہ سکول جانا پڑتا تھا۔ البتہ تین چار بجے ضرور جاتے تھے اور جب جاتے

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

تھے، تو گھنٹوں وہاں بیٹھے رہتے تھے۔ زینب آپا نے بلا کا حافظہ پایا تھا۔ الف لیلیٰ کی قریباً ساری کہانیاں اُسے یاد تھیں۔ اور پھر اُسے کہانی سُنانے کا ڈھنگ بھی خوب آتا تھا۔ اُس کے ٹرنک میں درجنوں کتابیں بند تھیں۔ اُن میں سے کچھ تو وہ تھیں جو وہ سکول میں پڑھ چکی تھی۔ پہلی جماعت کے قاعدہ سے لے کر چھٹی جماعت تک۔ تمام کتابیں اُس کے پاس محفوظ تھیں۔ ہر کتاب کے اُوپر اُس نے بڑے سلیقے سے موٹا کاغذ چڑھا رکھا تھا۔ باقی کتابیں کہانیوں کی تھیں۔ اُن میں "الف لیلیٰ" بھی تھی" توبۃ النصوح" اور "صبحِ ملال" "شامِ غم" بھی۔ اُس نے بتایا کہ وہ ایک کتاب کو دو دو تین تین بار پڑھ چکی ہے۔ اور اپنے میکے میں اُس کا سارا وقت کتابیں پڑھنے ہی میں گزرتا تھا۔

میرے اور لطیف کے ہاں جتنی کتابیں جمع تھیں وہ سب کی سب اُس نے ایک ایک کر کے منگوائیں اور انہیں پڑھ کر واپس کر دیا۔

زینب آپا کے ساتھ جو بھی اور جب بھی گفتگو ہوتی تھی کتابوں ہی کے بارے میں ہوتی تھی۔ ایک روز اُس نے مجھ سے پوچھا "تم پنجاب لائبریری کے ممبر ہو؟"

مَیں نے کہا: "ممبر تو نہیں ہوں البتہ وہاں جا کر کتابیں ضرور پڑھا کرتا ہوں"۔

"تو ممبر بن جاؤ۔ میرے لیے کتابیں لایا کرو۔ چندہ مَیں ادا کر دوں گی"۔

اور دوسرے روز ہی اُس نے اٹھارہ روپے دے دیے۔ مَیں باقاعدہ ممبر بن گیا اور لائبریری سے کتابیں آنے لگیں۔

یہ نہیں کہ زینب آپا صرف کتابیں ہی پڑھتی رہتی تھی اور کوئی کام نہیں کرتی تھی۔ وہ گھر کی تمام ذمے داریاں پوری کرتی تھی۔ اپنے کمرے اور کوٹھڑی کو اُس نے آئینے کی طرح صاف شفاف بنا دیا تھا۔ اپنے اور شوہر کے کپڑے خود سیتی تھی۔ وقت پر کھانا بھی تیار کر لیتی تھی۔ ہاں ایک بات ضرور ہے کہ وہ خاص فرائض جو ایک "دھوبی کنبے" پر عائد ہوتے ہیں۔ اُن میں وہ قطعاً حصہ نہیں لیتی تھی۔ اُس کے دیور جب بھٹی میں کپڑے ڈالتے تھے تو زہریلا دھواں کھڑکیوں اور سیڑھیوں کے راستے اُوپر آجاتا تھا۔ زینب آپا دروازہ بند کر کے کوٹھے پر چلی جاتی تھی۔ ساس دُھلے ہوئے کپڑوں کی گٹھڑیاں لے کر انہیں استری کرنے کے لیے ہمارے

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ڈیوڑھی میں آ بیٹھتی تھی اور یہ توقع رکھتی تھی کہ اُس کی بہو بھی اس کام میں اُس کی مدد کرے
نہ بہو بار بار بلانے پر بھی نیچے نہیں جاتی تھی۔ سچ یہ ہے کہ سسرال کے کنبے کے کاروبار
اسے ذرہ برابر دلچسپی نہیں تھی۔

ایک بات اور ہے وہ رات دن اپنے گھر ہی میں رہتی تھی۔ محلے کے کسی گھر میں بھی
جاتی تھی۔ یہاں تک کہ بیاہ شادی میں بھی شریک نہیں ہوتی تھی۔ ساس اصرار کرتی تو سردرد
بہانہ کر کے جان بچا لیتی اور کوئی نہ کوئی کتاب پڑھتی رہتی یا گھر کے کسی کام میں مصروف
اتی۔

شروع شروع میں تو جس نے زینب آپا کی کتاب "دوستی" کی خبر سُنی اُس نے بڑی حیرت
اظہار کیا کہ جدی پشتی دھوبیوں کے گھر میں ایک پڑھی لکھی بہو آگئی ہے۔ عورتیں دُور دُور کے
ں سے آ کر اُسے دیکھتی تھیں اور جب اَن پڑھ عورتیں اُس سے مل کر واپس اپنے گھروں کو
تیں تو زینب آپا کی ساس کو یہ لفظ ضرور کہہ کر جاتی تھیں "ماسی تیری بہو تو ایم اے۔ بی اے
۔ گھر میں سکول کیوں نہیں کھول لیتی؟"

مائی میراں کی چھاتی فخر سے پھول جاتی مگر وہ شکایتاً کہتی:

"پر ہم کپڑے نہ دھوئیں تو کھائیں کیا۔ گھر کا گزارہ کیسے چلے؟"

"ماسی تُو بڑی ناشکری ہے۔ میرے جیسی بہو کی قدر نہیں کرتی۔" کوئی عورت بے تکلفی سے
دیتی تو مائی میراں کو غصہ آ جاتا۔

"نی میں نہیں قدر کرتی۔ کبھی دیکھا ہے جو اُس نے استری کو ہاتھ میں لگایا ہو؟"

کہنے والی لاجواب ہو کر اپنا سا منہ لے کر رہ جاتی۔

یہ ٹھیک ہے کہ زینب آپا نے کبھی بھول کر بھی استری کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ وہ کسی گاہک
ے ہاں کپڑے لینے نہیں گئی تھی اور جب میلے کپڑوں کو بھٹی میں ڈالا جاتا تھا تو اُس نے کسی
ن بھی موٹے ڈنڈے سے اُتھل پتھل نہیں کیا تھا۔ اِس کام میں اُس کی ساس اور دیوروں کے
نہ جھلس جاتے تھے مگر اُسے تو کبھی یہ توفیق بھی نہیں ہوئی تھی کہ نیچے اُتر کر بھٹی کے قریب ہی
چند منٹ کے لیے کھڑی ہو جائے۔ ساس اوپر آتی تھی تو اس سے مخاطب ہو کر نیم مشفقانہ

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

اور نیم تمسخرانہ انداز میں اس سے کہتی تھی: "زینب و ہیے! تو بھی کبھی نیچے آجایا کر۔" یہ بات سن کر زینب آپا ہنس پڑتی تھی اور اچھا کہہ کر اپنے کسی گھریلو کام میں مشغول ہو جاتی تھی۔ ساس اس کے سوا اور کچھ نہیں کہتی تھی۔ لیکن کب تک! اس کی دونوں بیٹیاں جو کہیں موچی دروازے کے اندر رہتی تھیں۔ جب بھی آتی تھیں ماں کو بھابی کے خلاف کچھ نہ کچھ سکھا پڑھا جاتی تھیں۔ ہوتے ہوتے ساس اپنی "ایم اے بی اے" بہو کا ذکر کرتی تھی تو اُسے زینب کی بجائے زینبو کہتی تھی۔ اور اس کی نندوں نے تو اُس کا نام ہی "سفید بکری" رکھ چھوڑا تھا یہ سفید بکری ہی تو تھی جسے اُن کی ماں نے کھلا چھوڑ رکھا تھا کہ جو جی میں آئے کرتی پھرے۔

مائی میراں میں بلا کی ہمت تھی۔ کام کرتی تھی تو تھکنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ بوڑھی ہو چکی تھی تاہم اُس میں ہمت جوانوں جیسی تھی۔ گاہکوں کو کبھی اُس سے شکایت کا موقع نہیں ملا تھا۔ کپڑے دینے والے جب اُس کے سپرد کپڑے کرتے تھے تو انہیں یقین ہوتا تھا کہ فلاں دن میں آئے گا اور دُھلے دُھلائے کپڑے اُن کے گھروں میں پہنچ جائیں گے۔ لیکن بدقسمتی سے ایک روز گرم استری مائی میراں کے دائیں ہاتھ کو لگ گئی اور ہاتھ جل گیا۔ جلے ہوئے ہاتھ سے چونکہ استری پکڑ سکتی تھی۔ اُس نے چاہا کہ اپنی کسی رشتہ دار عورت کو گھر پر بلا لے اور یہ کام اُس سے کروا لے۔ اس کی بڑی بیٹی کو اس کا علم ہُوا تو وہ اُسی دن ماں کے پاس آکر کہنے لگی:

"بے بے! کسی کو کیوں بلاتی ہے۔ یہ سفید بکری کیا کرتی رہتی ہے؟"

مائی میراں بولی: "میں کیا کروں۔ وہ استری کو ہاتھ لگانا جانتی ہی نہیں۔"

"جانتی کس طرح نہیں۔ ایسے ہی مجاج تھے تو کسی نواب کے گھر میں جاتی۔ دھوبیوں کے گھر کیوں آئی ہے؟"

زینب آپا کے کانوں میں اپنی جوشیلی نند کی آواز پہنچ رہی تھی۔ وہ اُسی لمحے نیچے آگئی اور اس سے کہنے لگی:

"اماں! میں نے پہلے دن ہی کہہ دیا تھا کہ ایسا کوئی کام نہیں کروں گی۔"

"تو جا اپنی ماں کی گود میں بیٹھ جا کر۔"

اس فقرے پر ایک بہت بڑا ہنگامہ برپا ہو سکتا تھا مگر میری امّی نے معاملہ رفع دفع

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

را دیا۔ نند جانے کو تو چلی گئی لیکن اپنے پیچھے ساس بہو کے تعلقات میں ایسی چنگاریاں چھوڑ گئی جو کسی وقت بھی شعلوں میں منتقل ہو سکتی تھیں۔ مزید ستم ظریفی یہ ہوئی کہ کام کرنے کے لیے جو عورت آئی اُس نے زینب آپا کے خلاف مائی میراں کے کان بھر دیے اور اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ایک شام زینب آپا نیچے آئی تو ساس نے کہہ دیا:

"بی بی! اُوپر ہی رہا کر۔ نیچے آنے کی ضرورت نہیں"۔

زینب آپا چُپ چاپ اُوپر چلی گئی۔

اب ہم زینب آپا کے پاس جاتے تھے اور کتابوں کی باتیں کرتے تھے تو وہ کھوئی کھوئی نظر آتی تھی۔ میں نے لائبریری سے نئی کتابیں لاکر دیں تو اُس نے انہیں دیکھے بغیر پلنگ کے اوپر رکھ دیا۔ ایسا واقعہ پہلی مرتبہ ہُوا تھا ورنہ نئی کتابیں دیکھ کر تو خوشی سے اُس کے چہرے کا رنگ سُرخ ہو جاتا تھا۔

پھر چنگاریاں شعلوں کی صورت اختیار کرنے لگیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس حادثے کی ذمہ داری زینب آپا سے زیادہ اُس کے شوہر پر عائد ہونی چاہیے اور وہ اس بنا پر کہ چراغ دین کا رویہ اس معاملے میں بڑا عجیب تھا۔ سیڑھیوں کے نیچے اُس کی ماں اور بھائی رہتے تھے۔ اور سیڑھیوں کے اُوپر اس کی بیوی اور دو بچیاں۔ یہ دو مختلف منطقے تھے۔ نچلا منطقہ سخت گرم تھا۔ جب وہ اس منطقے میں رہتا تھا، اس کی فضا اس کے دل و دماغ میں ایک ایسی آگ بھڑکا دیتی تھی کہ لگتا تھا وہ بیوی کو ایک دن بھی گھر میں نہیں رہنے دے گا مگر جب اُوپر چلا جاتا تھا تو محسوس ہوتا تھا کہ اس منطقے میں برف جمی ہوئی ہے اور سرد ہوائیں چل رہی ہیں۔ اس ماحول میں اُس کی آگ بالکل بُجھ جاتی تھی۔ ماں کو شکایت تھی کہ وہ بیوی پر سختی کیوں نہیں کرتا اور بیوی کو گلہ تھا کہ وہ اپنی ماں اور بہنوں کو سمجھا کیوں نہیں دیتا کہ زینب دھوبن نہیں ہے اور بن بھی نہیں سکتی۔

اسی کش مکش کے عالم میں شب و روز گزر رہے تھے کہ یکایک ایک طوفان برپا ہو گیا۔ چراغ دین کی بڑی بہن آئی اور اُس نے اپنے بھائی کو بیوی کا غلام کہہ دیا۔ زینب آپا کوئی شے لینے کے لیے نیچے آرہی تھی۔ اُس نے جب دیکھا کہ اُس کے ..... الفاظ سُن کر

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

بالکل خاموشی اختیار کر لی ہے تو فوراً نیچے آگئی اور شوہر سے مخاطب ہو کر بولی :
"جواب کیوں نہیں دیتا۔ منہ میں گھنگنیاں ڈالے کیوں بیٹھا ہے۔ میں نے تجھ سے کونسی غلامی کرائی ہے"۔
چراغ دین شاید کچھ کہتا کہ بہن کڑکی: "تُو نے ہمارے بھائی کو گھڑے کی مچھلی بنالیا ہے"۔
"میں کوئی جادوگرنی ہوں ؟" زینب آپا نے پوچھا۔
"ہاں تُو جادوگرنی ہے۔ تعویذ ڈال دیے ہیں تُو نے"۔
بات بہت بڑھ گئی۔ تُو تُو میں میں ہونے لگی۔ زینب آپا کی ساس بھی جھگڑے میں شامل ہو گئی۔ چراغ دین نے چلے جانے ہی میں بہتری سمجھی اور وہ چلا گیا۔ اُس شام کو چراغ دین کی بڑی بہن نے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا :
"تو اس گھر میں رہی تو ہمارا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہوگا"۔ یہ ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔ مائی میراں کے لیے بھی اور اُس کی بہو کے لیے بھی۔
آخر وہ دن آ پہنچا جس کا زینب آپا کی ساس اور اُس کی دونوں نندیں دیر سے انتظار کر رہی تھیں۔ چراغ دین نے گو اب تک اپنی بیوی کا پورا پورا ساتھ نہیں دیا تھا تاہم وہ ماں بہنوں کے بہتھے چڑھ کر اُس پر سختی بھی نہیں کرتا تھا۔ لیکن اب زینب آپا نے دیکھا کہ اُس کا رفیق حیات اُس کی رفاقت سے منکر ہو گیا ہے اور اس نے ستم بالائے ستم یہ کیا کہ بیوی کا مکمل طور پر بائیکاٹ ہی کر دیا۔ وہ اُوپر آتا ہی نہیں تھا۔ دکان سے گھر واپس آتا تھا تو اُوپر نہیں جاتا تھا، نیچے ہی رہتا تھا، نیچے ہی کھانا کھاتا تھا اور نیچے ہی سو جاتا تھا۔ زینب آپا تنہا اپنی بچیوں کو پال پوس رہی تھی۔ میں نے اور لطیف نے محسوس کیا تھا کہ اُس کی زندہ دلی اور شگفتگی خاطر ختم ہو گئی ہے۔ اب بھی کتابوں کے بارے میں بات کرتی تھی مگر یہ بات بڑی جلدی ختم ہو جاتی تھی۔ میں یا لطیف اُس کی موجودہ حالت کو موضوع گفتگو بنانے کی کوشش کرتے تو وہ فوراً کوئی اور ذکر شروع کر دیتی جیسے وہ نہیں چاہتی کہ اُس کے گھریلو معاملات میں کوئی دخل دے۔
پندرہ بیس روز گزر گئے تھے۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

میں نے گھر میں کسی کو کہتے سُنا کہ زینب آپا کی ماں نے تہیہ کر لیا ہے کہ وہ اپنی بیٹی کو گھر لے جائے گی اور پھر کبھی اُسے اِدھر آنے کی اجازت نہیں دے گی۔

اتوار کی شام کو زینب کی بڑی نند آئی اور اُس نے زینب آپا سے صاف صاف کہہ دیا کہ اب اُس کا اِس گھر میں کوئی کام نہیں۔ اپنی ماں کے گھر چلی جائے اور اس سے اگلے روز ہماری گلی میں دوپہر کے بعد ایک ڈولی داخل ہوئی۔

مَیں اور لطیف اُس وقت گلی کی نکڑ پر گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔ ڈولی دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ڈولی جب بھی کبھی آئی تھی کسی دلہن کو لے کر ہی آئی تھی اور دلہن بیاہ کے بعد آئی تھی۔ بغیر بیاہ کے یہ ڈولی کیسے اور کہاں سے آگئی ہے۔ یہ سوال ہمارے دلوں میں کھٹکنے لگا تھا۔ کھیل تو ہمیں بھول گیا اور ڈولی کے ساتھ ساتھ چلنے لگے اور بھی کئی عورتیں اور بچے ڈولی کے اِردگرد قدم اُٹھا رہے تھے۔

ڈولی مائی میراں کے گھر کے آگے رُک گئی۔ کہار ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ ڈولی میں سے زینب آپا کی ماں نکلی۔ سخت کمزور اور بیمار۔ چہرے کا رنگ زرد، ہاتھ کانپتے ہوئے، سر ہلتا ہوا۔ مگر جب اُس نے پکارا:

"زینبو! آ میرے ساتھ چل"۔ تو اُس کی آواز میں کڑک تھی۔ گھن گرج تھی۔ آس پاس بیٹھے ہوئے کسی کو بھی اُس نے آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔

زینب نے کھڑکی کی چق اُٹھا کر ماں کو دیکھا اور بولی:

"آتی ہوں بے بے"۔

اور دو تین منٹ کے بعد وہ دونوں ہاتھوں میں کتابوں کا بنڈل اُٹھائے نیچے آئی۔ ایک لمحہ توقف کیے بغیر اُس نے اس بنڈل کو ڈولی میں رکھ دیا۔

"لے جا بے بے! مجھے لے جا"۔

اور یہ کہہ کر وہ اُوپر چلی گئی۔ زور سے دروازہ بند کرنے کی آواز آئی اور پھر وہ نیچے نہ آئی۔ شام تک نیچے نہ آئی اور نہ اُس نے دروازہ کھولا۔ ماں نے بار بار آوازیں دیں گالیاں دیں طعنے دیے یہاں تک کہ بددعائیں بھی دیں۔ مگر زینب آپا نے دروازہ نہ کھولا۔ ماں رو پیٹ کر چلی

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

گئی ڈولی میں بیٹھ کر۔

محلّے کے سارے مرد، ساری عورتیں زینب آپا کی اس حرکت پر حیران رہ گئے اور زیادہ حیران اُس وقت ہوئے جب زینب آپا نے دوسرے روز اپنی ساس کے جاگنے سے پیشتر دُھلے ہوئے کپڑوں کی گٹھڑیاں پاس رکھ کر استری اپنے ہاتھ میں پکڑ لی۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

نہیں جی

آج پھر نیند نہیں آ رہی۔ کتنی بے خواب راتیں بیت گئی ہیں اور اب ایک رات اور
سارا بوجھ میرے اعصاب پر ڈال رہی ہے۔ نیند نہ آئے تو بلا روک ٹوک طرح طرح کے خیال
ن میں آجاتے ہیں پھر آہستہ آہستہ ان میں ماضی کی یادیں شامل ہو جاتی ہیں۔ یہ یادیں
ب آتی ہیں تو جانے کا نام ہی نہیں لیتیں۔ یہاں تک کہ نیند پلکوں کے دوار اس طرح
ر دیتی ہے کہ پھر سارے منظر دھندلا جاتے ہیں۔ اندھیرے میں ڈوب جاتے ہیں۔
ے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا رہتا ہے مگر نہ جانے کیوں کئی راتوں سے بے چین ہوں۔
ر بھی دیکھتا ہوں بس دیکھے ہی چلا جاتا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ ایسے میں کوئی آ جائے۔
ن آئے گا؟ آدھی رات گزر گئی ہے۔ اس ماحول میں کس کو پڑی ہے کہ اپنا آرام تج کر
ے دروازے پر دستک دے۔ یہاں کوئی نہیں آسکتا۔ یہاں کوئی نہیں آسکتا۔ لیکن یوں
ں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی آنے والا ہے جیسے کوئی دھیرے دھیرے چلا آ رہا ہے۔

گرمی تیزی سے جا رہی ہے۔ جاڑے کی رُت آ رہی ہے۔ موسم سہانا ہے نہ
ہ گرمی اور نہ زیادہ سردی۔ ہمارے ہاں یہ بہترین موسم سمجھا جاتا ہے مگر مجھے سردی
رہی ہے۔ شاید اس کی وجہ بے خوابی ہے یا وہ تناؤ ہے جس سے میرے اعضا
ں طرح متاثر ہو رہے ہیں۔

آج رات میرا سنسان کمرہ کچھ زیادہ ہی سنسان لگتا ہے۔ شاید تنہا ہوں لیکن

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

تنہا تو پہلے بھی رہ چکا ہوں۔ پہلے تو کبھی ایسی کیفیت نہیں ہوئی۔ آج کیوں ایسا ہو رہا ہے۔ اس وقت کسی کے آنے کی بھی توقع نہیں ہے۔ مگر یہ کیا ہے۔ کوئی سایہ، ہاں سایہ ہی تو ہے۔ کہیں میری آنکھیں دھوکا تو نہیں کھا رہیں، نہیں۔۔۔ کوئی جنوبی دیوار کے قریب سے گزر کر غائب ہو گیا ہے۔ غائب کہاں ہو گیا ہے۔ آ رہا ہے میری طرف آہستہ آہستہ چلا آ رہا ہے۔ قریب ہوتا جا رہا ہے۔

یہ کوئی چور ہے۔۔۔ چور۔۔۔ مگر اسے یہاں سے گا کیا؟ نہیں چور نہیں۔ چور ایسی حرکت نہیں کرتا جیسی یہ شخص کر رہا ہے۔

"کون ہو تم"؟ میں اپنی طرف سے اسے دھمکانے کی کوشش کرتا ہوں وہ میرے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ چپ چاپ کھڑا ہے اور مجھے گھورے جا رہا ہے۔ کیا کہنا چاہتا ہے۔ میں اپنا سوال دہراتا ہوں، مگر وہ ہے کہ جواب ہی نہیں دیتا۔

"میں پوچھتا ہوں کون ہو تم"؟

چلا آ رہا ہے، بغیر ایک لفظ منہ سے نکالے۔ آخر اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوتی ہے۔

"میں ہوں منشی"

"کون"؟

"میں پہچانا نہیں"؟

غور سے اس کے چہرے کو دیکھتا ہوں۔ اس شکل کو میں نے کبھی کبھی ضرور دیکھا ہے پہچان نہیں سکتا۔ ماتھے پر کسی گہرے زخم کا نشان ہے۔ طوطے جیسی ناک، میلے کچیلے کپڑے اور پھر اس نے مجھے منشی کہہ کر پکارا ہے۔ کون مجھے منشی کہا کرتا تھا؟

"نہیں پہچانا، منشی! میری بے بے تم سے خط لکھوایا کرتی تھی"

اس کی ماں مجھ سے خط لکھوایا کرتی تھی اس لیے میں منشی ہوں۔ ظاہر ہے اس کی ماں مجھے منشی کہتی ہو گی۔ لیکن محلے میں تو کتنی عورتیں مجھ سے خط لکھوایا کرتی تھیں، وہ سب مجھے منشی ہی کہتی ہوں گی۔ میں دوبارہ اسے غور سے دیکھتا ہوں۔ اس کے ماتھے کا

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ان میری آنکھوں کے سامنے خاصا نمایاں ہو جاتا ہے۔ اوہ یہ تو علیا ہے۔ افضل دبدی
چھوٹا بھائی۔ جائداد کے جھگڑے میں بڑے بھائی سے لڑ پڑا تھا اور ہاتھا پائی میں اس
بھائی نے اسے زخمی کر دیا تھا۔ یہ ماتھے کا نشان ایک زخم کی وجہ سے ہے۔

"تم علیا ہو؟" میں اُس کی طرف دیکھ کر کہتا ہوں۔

"نہیں جی، میں علیا نہیں ہوں.... میں ہوں... پر تم بتاؤ۔"

"جھوٹ بولتے ہو۔ تم علیا ہو۔"

"نہیں جی، میں جھوٹھ نہیں بول رہا۔ علیے کی اپنے بڑے بھائی سے لڑائی ہوئی تھی۔
میری کسی سے بھی لڑائی نہیں ہوئی کبھی۔ میرے ماتھے کا داغ دیکھ رہے ہو، منشی! یہ
لڑائی کا زخم نہیں ہے۔ میں بتاتا ہوں۔ جب میں سات آٹھ سال کا بچہ تھا تو بخار
ہو گیا تھا، بڑا سخت! بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ پر میں بچ گیا۔ ڈاکٹر نے کہا صبح سویرے
اندھیرے سیر کیا کرو۔ میرے ساتھ بے بے جایا کرتی تھی۔ ایک بار میں اکیلا نکل پڑا۔
سویر ہو گئی ہے پر ابھی آدھی رات باقی تھی۔ پتہ ہے کیا ہوا منشی۔ تحصیل بازار میں
بڑا پرانا درخت تھا لوگ کہتے تھے کہ اس کے نیچے رات کو کوئی چڑیل رہتی ہے۔
میں جو اُدھر گیا تو مجھے چڑیل نظر آگئی...."

"چڑیل؟"

"ہاں منشی، یہ کالے کالے لمبے بال، لمبے دانت۔ وہ مجھے دیکھ کر زور زور سے سر
ہلانے لگی۔ جیسے مجھے اپنی طرف بلا رہی ہے۔ میں بھاگا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ نہ جانے
کون گھر لے گیا۔ میرا سارا بدن جھلی ہو گیا تھا۔ یہ ماتھا اُس وقت جھلی ہوا تھا۔ منشی
تم نے پہچان لیا ہے نا؟"

"تم اکبر ہو؟"

"ہاں، میں اکبر ہوں۔"

میں اسے بڑے غور سے دیکھتا ہوں۔ وہ ہنس رہا ہے اور ہنستے ہوئے اپنے
ماتھے کے داغ کی وجہ سے بھیانک دکھائی دیتا ہے۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"اکبر!"

"جی منشی۔ میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ اللہ معافی دے۔ بڑا گناہ گار بندہ ہوں۔"

"اکبر تم نے ٹھیک کہا ہے۔ تمہیں اللہ معاف نہیں کرے گا۔"

"کیوں جی؟"

"تم نے ایک معصوم لڑکی کا دل توڑ دیا تھا۔"

اکبر عجیب انداز سے میری طرف دیکھتا ہے۔

"منشی! تُو بھی ایسی بات کہتا ہے۔ تُو بھی کہتا ہے کہ میں نے گناہ کیا تھا۔ پر میں نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔" وہ لمحہ بھر خاموش رہنے کے بعد کہتا ہے۔ "میں نے... منشی! میں نے کچھ نہیں کیا تھا۔" اس کے چہرے پر تاسف کے اثرات گہرے ہوتے جاتے ہیں اور وہ سر جھکائے خاموش کھڑا ہے۔

"اکبر! آج تم کم از کم سنتیس سال بعد ملے ہو۔ میں نے جب کبھی تمہارا خیال کیا ہے میرے ذہن میں ایک کانٹا سا چبھ گیا ہے۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ جب تمہیں صغراں سے اتنی محبت تھی کہ تم اس کے لیے پاگل ہو گئے تھے پھر تم نے اس کے ساتھ شادی کرنے سے کیوں انکار کر دیا تھا؟ کیا تمہیں صغراں سے اتنا پیار نہیں تھا جتنا تم ظاہر کرتے تھے؟"

"اس سے زیادہ پیار تھا۔ میں اسے دیکھ کر جیتا تھا۔ وہ تو میری ہیر تھی منشی!"

"پھر کیا معاملہ ہوا؟"

"تو پوچھے گا تو بتا دوں گا۔"

"میں پوچھ رہا ہوں۔"

"سُنو منشی! مجھے صغراں سے اس وقت پیار ہوا تھا جب وہ میرے ساتھ چھوٹی مسجد میں پڑھتی تھی۔ وہ صبح مولوی جی کے پاس جاتی تھی اور میں دوپہر کو۔ پر جب وہ مجھے اچھی لگنے لگی تو میں صبح سویرے جب نمازی لوگ نماز پڑھنے مسجد میں جاتے تھے، مسجد کے پاس جا کر کھڑا ہوتا۔ وہ بھی سویرے آجاتی۔ یوں ہمیں ایک دوسرے سے

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ہو گیا۔"

"اکبر! مَیں نے یہ نہیں پوچھا کہ تمہیں ایک دوسرے سے کیسے پیار ہو گیا۔ مَیں جانتا
ں تم اس کے لیے دیوانے ہو گئے تھے۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔ صغراں کے ماں
تمہیں بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ کیا مَیں درست کہہ رہا ہوں؟"

"وہ ہمیں نائی کہتے تھے۔ پر منشی ہم نائی نہیں تھے۔ میرا باپ دادا لوگوں کی حجامتیں
کرتا تھا۔ ہمارا گھر دیگیں پکانے میں سارے لاہور میں مشہور تھا۔"

"بہر حال آخر میں لوگوں کے سمجھانے بجھانے پر اور اپنی لڑکی کی ضد پر وہ مان
تھے۔"

"مان گئے تھے۔"

"اور تم نے انکار کر دیا تھا۔"

"منشی! سچی بات بتاؤں۔ صغراں سے بیاہ کر کے میری اور میرے گھر کی بڑی
ی ہوتی۔"

"بدنامی ہوتی، وہ کیسے؟ اس کا باپ تو چوک جھنڈے میں گندم کا بیوپاری تھا۔ ان
ا گھر تھا۔ روپیہ پیسہ عام تھا۔ مگر لوگ تمہاری ذات میں کیڑے نکالتے تھے۔"

"منشی تُو غلط نہیں کہتا۔ پر یہ بات نہیں تھی۔ مجھے اشرف عطار کے بیٹے نے
تھا کہ گڈی فروش امجد نے اپنے بازو سے لہو نکال کر صغراں کو خط لکھے تھے۔ منشی
معمولی بات تھی؟ میرے تن بدن میں اگ لگ گئی۔ مَیں نے صغراں کو بہانے
اپنے گھر میں بُلایا اور اسے صاف صاف کہہ دیا کہ تُو پیار مجھ سے کرتی ہے اور
سے لہو بھرے خط بھی لیتی ہے۔ جا دفع دُور ہو جا۔"

"اس کے جواب میں اس نے کیا کہا؟" مَیں اُس سے پوچھتا ہوں۔

"پہلے تو چُپ چاپ میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔ ہاں مجھے امجد نے دو تین
خط لکھے تھے۔ پر یہ بات دو سال پہلے کی ہے۔ مَیں نے کبھی اس سے ملنے کی کوشش
کی تھی۔ اس نے خود ہی خط لکھ دیے تھے۔"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

"اب معاملہ سمجھ میں آیا۔ اس وجہ سے تُو نے صغراں سے بیاہ نہیں کیا تھا۔" مَیں اس سے کہتا ہوں۔ وہ نفی میں سَر ہلاتا ہے۔

"کیا کہتا ہے تو؟"

"منشی مجھے بڑا طیش آیا تھا۔ پَر جب اس نے کہا" وے اکبرا، کیا تُو نے شمشاد ماسٹرنی کی چھوٹی بہن ارشاد کو ریشمی پراندہ نہیں دیا تھا۔ مَیں نے کبھی تم سے اس کا جھگڑ کیا تھا۔ تُو نے کئی اور لڑکیوں سے بھی یارانہ لگا رکھا تھا مجھے رتّی رتّی علم ہے۔ اکبرا، پَر مَیں جانتی ہوں تیرا سچا پیار مجھ سے ہے۔ اس طرح تُو بھی سمجھ لے کہ مَیں سچا پیار تم سے کرتی ہوں، اور کسی سے نہیں کرتی۔"

"تُو مان گیا؟"

"ہاں منشی میں مان گیا۔ اُس دن وہ دیر تک روتی رہی۔ روتے روتے اُس کی آنکھیں سوجھ گئیں۔ مجھے بڑا افسوس ہُوا، کہ اس سے ایسی بات کہی کیوں تھی؟"

"تو اکبرا، صغراں سے بیاہ کرنے کی یہ وجہ نہیں تھی؟"

"منشی کہہ تو رہا ہوں یہ وجہ نہیں تھی۔"

"تو اور کوئی وجہ تھی؟" وہ اثبات میں سَر ہلاتا ہے۔

"مَیں پوچھتا ہوں وہ وجہ کیا تھی؟"

وہ دو تین لمحے خاموش رہتا ہے۔

"منشی تُو پوچھتا ہے تو بتا دیتا ہوں۔ صغراں کا باپ خود کو نہ جانے کیا سمجھتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے میرے باپ کی بڑی بے عزتی کر دی۔ للو ماشکی نے مجھ سے کہا۔ او اکبرا! تُو بڑا ہی بےغیرت ہے، وہ تیرے باپ کی بے عزتی کرتا ہے اور تو اُس کی بیٹی سے بیاہ جانے کی فکر میں ہے۔ منشی تو جانتا ہے مَیں نائی ضرور ہوں پَر بے غیرت نہیں ہوں۔ مَیں نے سوچ لیا کہ صغراں کے باپ کی بے عزتی ضرور کروں گا۔ لوگوں کے سامنے جو ہو سو ہو۔ صغراں تک بات پہنچ گئی۔ بھاگی بھاگی آئی۔ کہنے لگی۔ سرم کر اکبرا۔ بزرگوں کے معاملے میں تو کیوں بولتا ہے۔ مَیں گرم ہو گیا۔ اسے کہہ دیا جا گھر بیٹھ جا کہ، میرا تیرا کوئی

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

طرح نہیں آج سے۔ میں تیرے باپ کی بے عزتی کر کے چھوڑوں گا۔ وہ روتی ہوئی چلی
ی۔"
"گویا صغراں کو رد کر کے تُو نے اپنے باپ کی بے عزتی کا انتقام لیا تھا؟"
"جی ہاں۔"
"اکبر! مجھے اس کی خبر نہیں تھی۔ آج معلوم ہوا کہ اصل حقیقت کیا تھی۔ کیوں تُو نے
راں سے بیاہ نہیں کیا تھا؟" وہ مسکرانے لگتا ہے۔
"کیوں، مسکرا کیوں رہا ہے؟"
"منشی! یہ بات نہیں تھی۔"
"کیا یہ وجہ نہیں تھی؟"
"کچھ جو دیا، نہیں تھی۔"
میں سمجھتا ہوں وہ مذاقاً یہ لفظ کہہ رہا ہے مگر وہ پوری طرح سنجیدہ ہے۔ میرے دل
ایک کشمکش سی برپا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آج وہ بِل گیا ہے تو اس سے وہ بات
والوں جس کا مجھے علم نہیں ہے اور جو اصل وجہ ہے اس کی صغراں سے شادی نہ کرنے
۔ چنانچہ میں اس سے سوال کرتا ہوں۔
"دیکھو اکبر، اب کوئی مذاق نہیں ہوگا۔ سمجھ گئے؟" وہ اثبات میں سر ہلاتا ہے،
یا اس امر کا وعدہ کرتا ہے کہ غلط بات نہیں کہے گا۔
"تم نے صغراں سے کیوں بیاہ نہیں کیا تھا؟"
"منشی، صغراں کی ساری عادتیں اچھی تھیں۔ پر کہنے والے کہتے تھے کہ اس پر
سوار ہے جس سے وہ کبھی کبھی پاگل سی ہو جاتی ہے۔"
"تم نے کبھی اس میں پاگل پن پایا تھا؟"
"نہیں جی، بالکل نہیں۔ پر منشی... پر یہ کوئی ایسا معاملہ تو ہے نہیں۔"
"کون سا معاملہ؟"
"وہ.... اب کیا کہوں.... وہ جی، وہ تو پیار کی بات تھی جی۔ ہوتا یوں تھا کہ جب

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ہم لوگوں کے سامنے نہیں ہوتے تھے تو وہ مجھ سے لپٹ جاتی تھی۔ اپنے ناخن میری باہوں میں گاڑ دیتی تھی۔ اور جب لہو نکل آتا تھا تو اُسے بڑا سُکھ ہوتا تھا۔ کہتی تھی۔ ہائے میں مر جاواں اور وہ لہو چوس لیتی تھی پر یہ کوئی پاگل پن ہے۔ نہیں جی۔ یہ تو پیار کی نشانی ہے۔ پر محلے کی بزرگ عورتوں نے اس کی ماں کو بڑا سمجھایا۔ تیری لڑکی کے سر پر جن کا سایہ ہے اور ایک دن اُس کے گھر سے عورتوں کے گانے کی آواز آنے لگی۔ مجھے پتہ چل گیا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ منشی! میں نے جو چھپ کر دیکھا تو ....''

''کیا دیکھا تم نے؟''

''کیا بتاؤں، منشی؟''

''بتاؤ نا۔''

''عورتیں گا رہی تھیں۔ اور وہ صغراں جور جور سے اپنا سر ہلا رہی تھی۔ توبہ میری منشی! اس کے کالے بال بڑے ڈراؤنے لگتے تھے۔ اس کی صورت بڑی ڈراؤنی ہو گئی تھی۔ میں اسے دیکھ کر ڈر گیا اور اس طرح بھاگا جس طرح اس دن بھاگا تھا جب میں نے ڈائن دیکھی تھی۔''

''پاگل ہو۔''

''میں سچ مچ پاگل ہو گیا تھا۔ پھر جب وہ ملی تو وہ بالکل ویسی تھی جیسی وہ تجر آیا کرتی تھی۔ اس نے ریشمی کپڑے پہن رکھے تھے جو چھم چھم کرتے تھے۔''

''تم نے اس سے کچھ کہا ہوگا۔''

''میں نے کیا کہا تھا۔ ہاں میں نے کہا تھا۔ صغراں جب تجھے حال آ رہا تھا تو تُو ڈائن لگتی تھی۔ ہنس کر کہنے لگی۔ میں ڈائن لگی تھی نا۔ میں نے کہا ہاں۔ میں تجھے دیکھ کر ڈر گیا تھا۔ بھاگ گیا تھا۔ جور سے ہنسی۔ پر پھر اس کا رنگ بدل گیا۔ اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آ گئے۔ وہ جار و قطار رونے لگی۔ میں نے پوچھا۔ تجھے ہوا کیا ہے؟ بولی، میں ایسی بری ہوں کہ تُو دیکھ کر مجھے ڈر گیا۔ انہوں نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ میرا کیا قصور۔ بھلا میرے سر پر جن کا سایہ کہاں سے [illegible]

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

جن سوار ہے۔ منشی مجھے اس پر ترس آ گیا۔ اور میں نے اسے گلے سے لگا لیا۔
مجھ سے لگ کر اتنا روئی، اتنا روئی کیا کہوں۔ بولی سچ بتا مجھے کیا سمجھتا ہے۔ میں نے
تو تو میری حُور پری ہے۔"
"کیا کہا حُور پری ..... پر تُو دل میں مجھے ڈائن کہتا ہو گا۔" میں نے کہا۔" بالکل نہیں۔"
خاموش ہو جاتا ہے۔ اس کی شکل مجھے سہمی ہوئی نظر آتی ہے۔
"منشی وہ سچی ہی حُور پری۔ پر رات میں لیٹا تو میری باہوں میں درد ہونے لگا۔ لالٹین
کر دیکھا کئی جگہوں سے لہو نکل رہا تھا۔ میں نے کہا یہ تو بڑی عجیب لڑکی ہے اور مجھے
سے ڈر آنے لگا اور کبھی کبھی میں اسے دیکھ کر ڈر جاتا تھا۔ میں اس کے بالوں کو ہاتھ
لگاتا تھا۔ بے بے کہتی تھی تو رات سوتے میں چیختا ہے۔ کیا ہو گیا ہے تجھے؟"
"اکبر! یہ تو کوئی وجہ نہیں ہے۔"
"ہاں منشی یہ کوئی وجہ نہیں ہے۔"
اب مجھے اس پر غصہ آنے لگا ہے۔ یہ کمبخت کر کیا رہا ہے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں سُنا رہا
ہے۔ اصل واقعہ بتاتا ہی نہیں۔ میں اس کے چہرے پر نظر ڈالتا ہوں۔ لگتا ہے کچھ کہنا نہیں
چاہتا۔ میں اس کا بازو پکڑ لیتا ہوں اور زور سے اسے دباتا ہوں اور اپنی طرف سے پورے
غیظ و غضب کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہوں۔
"اکبر، مذاق ہو چکا۔ اگر تم وجہ نہیں بتانا چاہتے تو فوراً چلے جاؤ۔ میرے پاس تمہاری
بکواس سُننے کے لیے بالکل وقت نہیں۔" وہ سر اُٹھاتا ہے۔
"منشی!"
"کہو کوئی اور بات سُوجھی؟"
"سچ سچ بتا دوں؟"
"تو پوچھ کیا رہا ہوں؟" وہ ذرا سوچتا ہے اور کہنے لگتا ہے۔
"صغراں کی ماں نے ہمارے چولہے میں تعویت چھپا دیے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا
جو بھی اس چولہے کی روٹی یا سالن کھائے اس کے اندر آگ لگ جائے۔ بے بے نے

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

جو چولہے میں سے راکھ نکالی تو تویت نکل آئے۔ پھر کیا تھا۔ صغراں کی ماں سے بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ بے بے نے کہا، اکبر، ہو تو بتر ہے میرا، مت صغراں گشتی کے گھر جانا۔ میاں نے بھی کہہ دیا کہ صغراں کے ماں باپ سے تیرا کوئی واسطہ نہیں رہا۔"

"لیکن اکبر، میں تعویذوں کا قائل نہیں ہوں۔ قائل ہوں بھی تو اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ وہ تعویذ صغراں کی ماں نے ہی چولہے میں ڈالے تھے؟"

"منشی، صغراں نے قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ اس نے تویت نئیں ڈالے تھے۔"

"تم نے اعتبار کر لیا تھا؟"

"ہاں منشی، دوسرے دن صغراں ہمارے گھر آگئی اور بولی:

"اکبر، بس یہ ہے تیرا پیار، وے جا لما۔ میری ماں کو کیا پڑی تھی کہ تویت ڈالتی۔ پر منشی کیا ہو سکتا تھا۔"

"حالات بالکل بگڑ گئے تھے۔" میں پوچھتا ہوں۔

"جی بگڑ گئے تھے، بڑے خراب ہو گئے تھے۔"

وہ خاموش ہو جاتا ہے۔ نیم روشنی میں اس کی آنکھیں چمک رہی ہیں یکایک میرے دل میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ یہ ابھی کچھ چھپاتے ہوئے ہے۔ مجھے کچھ بتانا نہیں چاہتا۔

"اکبر!"

"جی منشی!"

"تم مجبور ہو گئے تھے؟" وہ خاموش ہے۔

"اکبر! میں پوچھ رہا ہوں، اب تو اور کوئی وجہ نہیں بتاؤ گے۔"

"نئیں جی۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ بات پہلے ہی بتا دیتے تو کیا حرج تھا؟"

وہ خاموشی سے میری طرف دیکھ رہا ہے۔

"منشی، پتہ چل گیا تھا؟"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"کس معاملے کا۔"

"تربیت میری سوتیلی پھوپھی نے ڈالے تھے۔"

میرا جی چاہتا ہے کہ اس کا گریبان پکڑلوں اور اسے دھکے دے کر باہر نکال دوں۔ مگر جب اس کی طرف دیکھتا ہوں تو میرا ارادہ کمزور ہوتے ہوتے ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک ناقابلِ بیان افسردگی پھیلی ہوئی ہے۔ بڑی گہری گھمبیر قسم کی مایوسی جو صرف محسوس کی جا سکتی ہے۔ اس کا رنگ سفید پڑ گیا ہے جیسے ابھی ابھی ڈر گیا ہو۔ کئی منٹ تک ہم خاموش رہتے ہیں۔ آخر میں کہتا ہوں۔

"اکبر، ظاہر ہے تم نے صغراں سے بیاہ نہیں کیا تھا اور بیاہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔"

"وہ اثبات میں سر ہلاتا ہے۔"

"کیوں؟" میں پوچھتا ہوں۔

"کیوں؟" وہ میرے ہی لہجے میں کہتا ہے۔

"اکبر، تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ اصل وجہ کیا تھی؟" وہ گھور کر مجھے دیکھنے لگتا ہے۔ کئی لمحے اسی طرح دیکھتا رہتا ہے۔ پھر سر جھکا لیتا ہے۔

"منشی! میں نہیں جانتا۔"

"کیا کہا، تم نہیں جانتے۔"

"نہیں جی۔"

"تم نے صغراں سے بیاہ کیوں نہیں کیا تھا۔ تم نے انکار کیوں کر دیا تھا۔ بتاؤ، بتاؤ اکبر!" چپ کھڑا ہے۔ "اکبر!" میں گرج کر کہتا ہوں۔

اس کا چہرہ اور سفید... اور خوفزدہ ہو گیا ہے۔ اور وہ نیم تاریکی میں تحلیل ہوتا جا رہا ہے... میں اس کا ہاتھ پکڑنا چاہتا ہوں، مگر وہ نظر نہیں آ رہا۔ میں اسے پکار رہا ہوں۔

"اکبر! اکبر!!"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

لالو ماشکی

یہ میرا آبائی مکان ہے۔ اس کے ایک کمرے میں میں نے پہلی مرتبہ آنکھ کھولی تھی۔ اس وقت تک یہ کتنے موسموں کی سختی اور نرمی کا تجربہ کر چکا تھا، میں نہیں جانتا اور آج کہ میری عمر نصف صدی سے بھی کم و بیش بارہ سال اُوپر ہو چکی ہے۔ اس کی دیواریں اپنی زمین سے پُوری طرح اور مضبوطی کے ساتھ پیوست ہیں۔ یہ عمارت اپنا سر اُٹھائے یوں لگتی ہے گویا گردشِ لیل و نہار کا اس پر مطلقاً اثر نہیں پڑا۔ یہ بات بظاہر غلط معلوم نہیں ہوتی مگر جب میرے پرانے محلّے کے کسی معمر شخص کو اس کے اندر جا کر کمروں کے جائزے کا موقعہ ملتا ہے تو وہ اپنی یادداشت اور میرے مکان کی اندرونی حالت میں بہت کم مطابقت پاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مکان کے اندر بڑے نمایاں قسم کے تغیرات آ چکے ہیں اور وہ نقشہ برقرار نہیں رہا جو آج سے تیس چالیس برس پہلے نظر آتا تھا۔

یہ ذکر اُس زمانے کا ہے جب یہ مکان ویسا ہی تھا جیسا کہ مدت سے چلا آ رہا تھا۔ چوک دلوی دتا سے گلی مُغلاں میں داخل ہوں تو اس مقام پر جہاں پر گلی ایک زاویہ بنا کر دائیں طرف مُڑ جاتی ہے۔ دو سیڑھیاں دکھائی دیتی ہیں جو اُس زمانے میں بھی قائم تھیں جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔ اِن سیڑھیوں کے اُوپر ایک ڈیوڑھی تھی جس کی چھت بڑی بھیانک تھی۔ ڈیوڑھی سے آگے ایک تنگ و تاریک راستہ تھا جس کے اُوپر ایک چھوٹی سی چھت دیواروں کے اندر دھنسی ہوئی نظر آتی تھی۔ یہ چھت بس اتنی اُونچی تھی کہ ایک لمبے قد کا

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

دمی اپنا سَر خم کیے بغیر یہاں سے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ اس کے آگے ایک دالان تھا
ر دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ تنگ و تاریک راستے سے جو حصّہ ملحق تھا وہ چھوٹا دالان
ہلاتا تھا اور جہاں دو بڑے بڑے ستون کھڑے تھے، ان کے آگے بڑے دالان
ی حد شروع ہو جاتی تھی۔ چھوٹے دالان کے ایک سرے پر اسی راستے سے دائیں جس
ایں ذکر چکا ہوں وہ سیڑھیاں تھیں جو اُوپر کی منزل کو جاتی تھیں اور یہ سیڑھیاں آج
بھی ہیں۔ اس منزل میں ہمارا کُنبہ رہتا تھا اور چھوٹے دالان کی دائیں جانب ایک
دروازہ تھا جس کے پیچھے دو کوٹھڑیاں واقع تھیں۔ پہلی کوٹھڑی ایک عام کمرے کے
رابر تھی۔ یہاں روشنی ایک تو اُس روشن دان میں سے آتی تھی جو دروازے کے اُوپر رکھا
یا تھا اور روشنی کا دوسرا راستہ وہ خلا تھا جو ایک دیوار میں بد نما داغ کی طرح نظر آتا تھا۔
دوپہر کے وقت تو اچھی خاصی روشنی اپنے وجود کا احساس دلا دیتی تھی۔ شام کے وقت یہ روشنی
سمٹ سمٹا کر سامنے دیوار کے سینے پر دو تین مدھم مدھم لکیروں میں منتقل ہو جاتی تھی۔ یہ حال
پہلی کوٹھڑی کا تھا۔ اس کے ساتھ جو کوٹھڑی خود کو کوٹھڑی کہلانے پر مصر تھی۔ ایک ایسے غار
کی حیثیت اختیار کر چکی تھی جس کے اندر عام انسان قدم رکھتے ہوئے خوف زدہ ہو جاتا تھا۔
مین پر منوں مٹی بچھی ہوئی تھی جس میں پاؤں دھنس جاتے تھے۔ ارد گرد بے کار، فالتو،
ٹا پھوٹا فرنیچر جس کی طرف کبھی کسی نے آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس چھوٹی کوٹھڑی
میں میری امّی نے مٹی کے تیل کا کنستر رکھ چھوڑا تھا۔ جب کبھی چولہے اور مٹی کے دیے
کے لیے تیل کی ضرورت پڑتی تھی تو وہی ہاتھ میں بوتل اور ماچس لے کر اس کا دروازہ
کھولتی تھیں اور بوتل بھر کر واپس آ جاتی تھیں، ہم یعنی میں اور میری بہنیں محض
ہم جولی کے جذبے کو تسکین دینے کی خاطر ان کے ساتھ جاتے تھے اور بالعموم کوٹھڑی
کے دروازے کے باہر ہی کھڑے رہتے تھے۔ کیونکہ ہمیں بتایا گیا تھا کہ یہاں ایک
سانپ رہتا ہے جسے آج تک کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ مگر اس کی موجودگی کا احساس
ان لمبی لکیروں سے ہو جاتا تھا جو مٹی کے اُوپر ماچس کی روشنی میں نظر آ جاتی تھیں۔
امّی کہتی تھیں کہ کوٹھڑی میں کوئی سانپ نہیں ہے۔ بابا محمد دین جو چند روز پہلے

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

کوٹھڑی میں گزار چکے تھے۔ امّی ہی کی تائید کرتے تھے۔ مگر ہمارے ذہنوں سے سانپ کا دہشت خیز خیال دُور نہیں ہوتا تھا۔ ایک دن میں سکول سے گھر واپس آیا تو دیکھا کہ جمعدارنی حسّاں بڑی کوٹھڑی کی صفائی کر رہی ہے اور چھوٹے دالان میں دو تین ٹرنک، کچھ مٹی کے برتن اور ایک چارپائی پڑی ہے۔ جمعدارنی نے میرے استفسار پر بتایا کہ لالو ماشکی نے کوٹھڑی کرائے پر لے لی ہے اور وہ شام کو یہاں آجائیگا۔ لالو ماشکی یکا یک میرے سامنے ایک سیاہ رنگ کا پتلا دُبلا آدمی آگیا۔ یہ لالو ماشکی ہی تھا جو کبھی دائیں پسلی اور کبھی بائیں پسلی کے ساتھ پانی سے بھری ہوئی یا خالی مشک لگائے گلی میں آیا جایا کرتا تھا۔ گلی میں جتنے گھر مسلمانوں کے تھے وہاں صبح شام مشک کے ذریعے پانی پہنچانا لالو ہی کا کام تھا اور لالو ایک مدّت سے یہ کام کر رہا تھا۔ اپنی ہیئت کے اعتبار سے لالو بڑے سے بڑے مجمع میں بھی بڑی آسانی کے ساتھ پہچانا جاسکتا تھا۔ اس کا چہرہ لمبوترا تھا جس پر گوشت کی ایک ہلکی سی تہہ جمی ہوئی تھی اور یہ تہہ نوکیلی ہڈیوں پر کہیں کہیں بڑی باریک ہوگئی تھی۔ آنکھیں دو گڑھوں کے اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ ناک ذرا ابھری ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھوں اور پاؤں پر کچھ ایسے سُرخی مائل دھبے پڑ گئے تھے، جیسے ایک مُدّت تک پانی میں رہنے کے بعد برتن زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ سردیوں اور گرمیوں میں اس کا ایک ہی لباس ہوتا تھا۔ نیچے نیلے رنگ کا تہبند، اُوپر واسکٹ نما کُرتا جو عموماً پھٹا رہتا تھا۔ یہ کرتا اس کے جسم کے ساتھ چپک جاتا تھا اور وہ کسی وقت بھی اسے گلے سے نہیں اُتارتا تھا۔ پانی بھرتے وقت پاؤں اس کے ہمیشہ ننگے رہتے تھے۔ شدید سے شدید سردی میں بھی اس نے کبھی جوتے استعمال نہیں کیے تھے۔ لالو کے شانے پر ایک موٹا رومال دو تین تہوں میں سمٹا ہوا پڑا رہتا تھا جس کا سفر مشک کے ساتھ ایک شانے سے دوسرے شانے تک جاری رہتا تھا۔ گویا جس شانے پر بھی مشک اپنا بوجھ ڈالے گی یہ رومال بھی اسی شانے کا ساتھ دے گا۔

محلے میں تین ایسے مرکز تھے جہاں سے لالو اپنی مشک بھر کر لوگوں کے گھروں میں پانی پہنچاتا تھا۔ ایک مرکز تو وہ کنواں تھا جو گلی مائی نادراں کے اندر اس مقام پر

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

قع ہے جہاں گلی سے دو ڈھائی فٹ اُونچا اور کئی گز لمبا اور چوڑا چبوترہ واقع ہے۔ دوسرا
رز بھی ایک کنواں تھا جو گوندی دہڑے میں دہڑے کے پھاٹک سے کچھ دُور نظر آ جاتا
ہے۔ تیسرا مرکز کوئی کنواں نہیں بلکہ ایک نلکہ تھا جسے لاہور میونسپل کمیٹی نے اہلِ محلہ کی
سہولت کے لیے بیری مائی مزادوں کے نیچے لگوا دیا تھا۔ لالو سردیوں کے موسم میں اس
نلکے سے پانی بھرا کرتا تھا۔ وہ تاروں کی چھاؤں میں نلکے پر پہنچ جاتا اور اس سے پیشتر کہ
لوگ برتن لے کر وہاں پہنچ جائیں، جتنی مشکیں بھرنی ہوتی تھیں بھر لیتا تھا۔ میونسپل کمیٹی
کے نلکے پر اسے وہی حق تھا جو حق محلہ ستھاں کے ہر شخص کو حاصل تھا۔ اس میں وہ اور
بقی سب لوگ برابر تھے۔ مگر ہر کنوئیں کا بوکا اور لیج اس کی اپنی ملکیت تھے۔ اب یہ
الگ بات ہے کہ وہ اپنی ان دو چیزوں کو اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتا تھا۔ دوسروں
کو بھی اس سے فائدہ اُٹھانے کا موقع دیتا رہتا تھا۔ اس کی مشک جب کنوئیں یا نلکے کے
پانی سے بھر جاتی تھی تو وہ چمڑے کے ایک تسمے سے اس کا منہ بند کر دیتا تھا۔ یہ تسمہ
مشک کے بھرنے تک اس کے دانتوں تلے دبا رہتا تھا۔ اور مشک کے بھرتے ہی اسے
منہ سے نکال لیتا تھا اور اس سے مشک کا منہ بند کر کے مشک کو یوں اُٹھا لیتا تھا جیسے
ایک ماں اپنے بچے کو جو گھر کے آنگن میں کھیلتے کھیلتے فرش پر ہی سو گیا ہو۔ بڑے پیار
کے ساتھ اپنے سینے سے لگائے تاکہ اسے پنگوڑے کے اندر یا چارپائی کے اُوپر لٹا دے۔
جس وقت وہ بھری ہوئی مشک اُٹھا کر لمبے ڈگ بھرتا ہوا کسی گھر کی طرف جاتا تھا
تو اس کی کمر جھکی ہوئی ہوتی تھی۔ ٹانگوں کی رگیں اُبھر کر زیادہ نمایاں ہو جاتی تھیں اور مشک
میں سے جھم جھم کرتی ہوئی آواز آتی تھی جیسے بچھڑا ہوا پانی مولانا رومی کی نے کی مانند اپنی
اصل سے جُدا ہونے پر شکایت کر رہا ہو۔ وہ صبح و شام ہر گھر کا دروازہ کھول سکتا تھا۔
ہر گھر کی سیڑھیوں پر چڑھ سکتا تھا۔ اُسے کوئی روک تھام نہیں تھی۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ
جب وہ دروازہ کھولنے لگتا تھا یا گھر کی آخری سیڑھی پر پہنچ جاتا تھا تو ذرا بلند آواز سے
لالو ماشکی ضرور کہتا تھا۔ لالو ماشکی کے لفظ واضح طور پر نہیں سُنے جا سکتے تھے۔ لیکن جاننے
والے جانتے تھے کہ وہ اپنی آمد کا اپنا نام لے کر ہی اظہار کیا کرتا ہے۔ گھر کے اندر آ کر

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

کیا مجال جو ادھر اُدھر دیکھے۔ سیدھا اِن برتنوں کی طرف جاتا تھا۔ جنہیں پانی سے بھرنا اُس کا فرض تھا۔ وہ ایک گھڑے میں پانی ڈالتا تھا اور جس گھڑے میں پانی ڈالتا تھا اس کا ڈھکنا دوسرے گھڑے کے اُوپر ٹکا دیتا تھا تاکہ جب دوبارہ مشک لے کر آئے تو ڈھکنا اُٹھانے کی ضرورت نہ ہو۔ گھر کی عورتیں اس کے آنے پر کسی قسم کا تکلف نہیں کرتی تھیں۔ البتہ بوڑھی عورتیں شاید عادتاً دوپٹہ اپنے سروں اور شانوں پر پھیلا لیتی تھیں۔

لالو جب کسی گھر کے برتن پانی سے بھر دیتا تھا اور مشک میں پانی کی کچھ مقدار باقی رہتی تھی تو وہ اس پانی کو واپس نہیں لے جاتا تھا۔ بقیہ پانی آخری گھڑے کے اُوپر بہا دیتا۔ گھر والے اُسے اس وقت ٹوکتے تھے۔ کیونکہ اس سے گھڑے کے باہر کیچڑ ہو جاتا تھا۔ لیکن لالو اپنے اس اصول کو نہیں توڑتا تھا۔ وہ مشک بالکل خالی کر کے ہی گھر سے باہر قدم رکھتا تھا۔ لالو ماشکی کو میں نے بارہا دیکھا تھا۔ اپنی گلی میں آتے ہوئے، گلی سے باہر جاتے ہوتے۔ نلکے یا کنوئیں پر مشک بھرتے ہوئے اور بازار سے سودا سلف خریدتے ہوتے۔ اس کے علاوہ مائی لبساں کے تنور پر روٹی کھاتے ہوتے بھی، مگر اس کے بارے میں میں صرف یہ بات جانتا تھا کہ وہ ایک ماشکی ہے اور اس کا نام لالو ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ رہتا کہاں ہے اور کب اپنے گھر میں جاتا ہے۔ میری دادی اماں نے اس کے متعلق صرف یہ معلومات بہم پہنچائی تھیں کہ وہ مزاج کا بڑا اسٹریل ہے۔ محلے میں سوائے چاگاں کے کسی سے اُس کی بنتی نہیں ہے۔ یہ چاگاں جسے میں پھوپھی کہتا تھا۔ گوندی دہڑے میں رہتی تھی اور پیشے کے لحاظ سے دھوبن تھی۔ ہاں دادی اماں نے یہ بھی بتایا تھا کہ یہ ایک گاؤں سے روزی کمانے کے لیے آیا ہوا ہے۔ اور اس کے گاؤں کا نام باہومان ہے جو ضلع شیخوپورہ میں ہے۔ تو یہ لالو ہمارے گھر کے نیچے بڑی کوٹھڑی میں آبسا تھا اور اس کے آتے ہی میرے اور میری چھوٹی بہن زبیدہ کے لیے ایک پریشان کن سوال پیدا ہو گیا تھا۔ اگر کسی دن دوسری کوٹھڑی کا دروازہ کھلا رہ گیا اور سانپ لالو کی کوٹھڑی میں آ گیا تو.... ہماری یہ پریشانی، ہماری لالو سے دلی ہمدردی کا نتیجہ تھی۔ لیکن جب ہم دونوں لالو کے پاس گئے اور اسے سانپ کے خطرے سے آگاہ کیا تو وہ

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"جاؤ تنگ نہ کرو۔" زبیدہ بولی ——— "ذبح کرو بھائی جان! سانپ کاٹ کھائے
مر جائے گا، ہماری جوتی پروا کرتی ہے۔" مگر چند لمحوں کے بعد ہی اس کی ہمدردی لوٹ
اور ہم دونوں سوچنے لگے کہ ایسے موقعے پر کرنا کیا چاہیے۔ امّی سے ذکر کیا تو انہوں
سانپ کے وجود ہی سے انکار کر دیا۔ امّی کی رائے سے ہم متفق نہیں تھے۔ لیکن
ہفتے میں دو تین بار لازماً کوٹھڑی میں تیل لینے جایا کرتی تھیں۔ وہ کیسے غلط بات
کتی تھیں۔ لیکن ہم مطمئن نہیں تھے چنانچہ ہم دونوں نے غور کیا اور طے یہ ہوا کہ
ب سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ کوٹھڑی میں سانپ ہے بھی یا نہیں۔ اس کے لیے ہم
دو طریقے سوچے تھے۔ پہلا طریقہ یہ تھا کہ کوٹھڑی کے اندر جا کر سانپ کی کینچلی تلاش
ب۔ کیونکہ ہم نے سُن رکھا تھا کہ سانپ سال میں کم از کم ایک مرتبہ اپنی کینچلی ضرور اُتار دیتا
اور یہ کینچلی وہیں پڑی رہتی ہے جہاں وہ رہتا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ سوچا گیا تھا کہ پاؤ بھر
ھ ایک پیالے میں ڈال کر اور اس پیالے کو کوٹھڑی میں رکھ دیا جائے۔ سانپ
ھ بھی پی لیتا ہے۔ اگر دوسرے تیسرے دن پیالہ خالی پایا گیا تو معلوم ہو جائے گا کہ
ٹھڑی میں سانپ رہتا ہے۔

دونوں طریقے آسانی سے سوچ لیے گئے۔ میں بازار سے پیالہ بھی خرید لایا، دودھ
ی انتظام ہو گیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ کینچلی کس طرح ڈھونڈی جائے اور پیالہ کیسے اندر
جائے۔ اتفاق سے اُسی روز امّی تیل لینے کوٹھڑی میں گئیں تو ہم بھی ان کے ساتھ وہاں
گئے۔ میرے ہاتھ میں دودھ کا پیالہ تھا جس کے اُوپر میں نے اخبار کے کاغذ کو اس طرح
دیا تھا کہ پیالہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ زبیدہ کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ امّی تیل کے کنستر میں
۔ بوتل بھرنے لگیں۔ موقع بہت اچھا تھا۔ میں نے ایک کونے میں دودھ والا پیالہ رکھ
پھر ہم دونوں لالٹین کی روشنی میں کینچلی تلاش کرنے لگے۔ نہ جانے کہاں ذرا سی آہٹ
ں۔ میں اور میری بہن دونوں بھاگے باہر کی طرف اور امّی کہتی رہ گئیں: "پاگل ہو گئے
ھیرا کر دیا، بوتل کیسے بھروں۔"

ہم بڑے دالان میں چلے گئے۔ امّی باہر آ گئیں: "کیا ہو گیا تھا تمہیں؟"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"سانپ۔" دونوں نے بیک وقت کہا۔

"تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ سانپ کہاں ہے؟" کینچلی کو ڈھونڈنے کا سوال تو ختم ہوگیا تھا مگر پیالے کو دیکھنا باقی تھا۔ چند روز بعد تو تل کا تیل ختم ہوگیا، تو امی کوٹھڑی میں جانے لگیں، ہم ان کے ساتھ تھے۔

"پیالے کو تم دیکھو گے یا میں؟" زبیدہ نے کہا۔

"دونوں دیکھیں گے۔" اور ہم دونوں نے دیکھا کہ پیالہ خالی تھا۔

"پیالہ خالی۔" میری بہن نے سرگوشی سے کہا اور عین اس لمحے قریب سے میاؤں کی آواز آگئی اور ہم خوفزدہ ہونے کے باوجود ہنس پڑے۔

لالو ماشکی کو ہماری کوٹھڑی میں رہتے ہوئے قریباً تین ماہ گزر گئے تھے اور اس دوران میں کوئی خلافِ معمول واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ وہ صبح سویرے مشک لے کر نکل جاتا تھا۔ بارہ بجے کے بعد ماسی بتاں کے تنور پر ہوتا تھا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر اپنی کوٹھڑی میں آجاتا تھا اور دروازے کو اندر سے بند کر دیتا تھا۔ چار پانچ بجے پھر مشک بھرنے اور مشک خالی کرنے کا سلسلہ شروع ہوجاتا تھا جو شام تک جاری رہتا تھا۔ رات کو وہ کیا کھاتا ہے اور کہاں کھاتا ہے۔ یہ بات مجھے معلوم نہ ہو سکی۔ شاید وہ ماسی بتاں ہی کے تنور پر جاتا تھا۔ اگرچہ کوشش کے باوجود میں نے شام کے وقت اسے تنور پر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھوپھی جیاگاں کے پاس وہ روپیہ پیسہ جمع کرا دیا کرتا تھا اور ضرورت کے وقت اس سے لے لیا کرتا تھا۔ میں نے دل میں خیال کیا کہ پھوپھی کو اس کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوں گی جو ہم لوگ کبھی نہیں جان سکے۔ چنانچہ یہ خیال ذہن میں لے کر میں ان کے پاس گیا۔ پھوپھی تو مجھے یہ بھی نہ بتا سکیں کہ لالو کی شادی ہو چکی ہے یا نہیں۔ میرے استفسار پر انہوں نے فقط اتنا کہا کہ چالیس سے اوپر اس کی عمر ہو چکی ہے۔ ضرور بیاہ ہوا ہوگا۔ اور بچے بھی ہوں گے۔ پھوپھی نے مجھے یہ اطلاع بھی دی کہ دو روز پہلے اُس نے جتنی رقم جمع کرائی تھی وہ ساری کی ساری لے لی تھی اور کہا تھا کہ بڑی ضرورت ہے۔ کیا ضرورت ہے؟ یہ بات اس نے نہیں بتائی تھی۔ میرے ذہن میں خواہ مخواہ ایک جذبۂ تجسس پیدا ہوگیا۔ یہ روپیہ لالو نے

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

کہاں خرچ کیا ہے اور کیوں خرچ کیا ہے۔ یہ سوال مجھے پریشان کر گیا اور میں نے ارادہ کر لیا کہ اس معمے کو حل کر کے رہوں گا۔ اتفاق سے ایک روز میں نے دیکھ لیا کہ جب لالو باہر جاتا ہے تو گھر کے دروازے پر تالا لگا دیتا ہے۔ لیکن چابی ساتھ نہیں لے جاتا بلکہ دروازے کے اُوپر جو روشندان بنایا گیا ہے اس کے ایک کونے میں رکھ دیتا ہے اور واپسی پر وہیں سے چابی لے کر دروازہ کھول لیتا ہے پھر کنجی لگا تالا اندر لے جاتا ہے۔

میں نے سوچ لیا کہ کسی روز جب وہ باہر ہوگا۔ میں چابی لے کر دروازہ کھول کر اندر چلا جاؤں گا اور دیکھوں گا کہ اس نے کون سے نئے برتن یا فرنیچر خریدا ہے۔ مہینے کی دوسری یا تیسری تاریخ تھی۔ لالو ٹرنک خالی کر کے سیڑھیوں کے پاس کھڑا تھا۔ وہ جب بھی اس انداز سے کھڑا ہوتا تھا تو امی سمجھ لیتی تھیں کہ تنخواہ مانگ رہا ہے۔ وہ کرائے کے دو روپے کاٹ کر باقی پیسے اس کے حوالے کر دیتی تھیں۔ اس میں نہ تو لالو کو کچھ کہنے کی ضرورت ہوتی تھی اور نہ امی کو۔ یہ گویا معمول بن گیا تھا اور اس روز لالو نے امی سے پیسے لیے تو ٹرنک اندر رکھ کر دروازے کو تالا لگا کر اور چابی روشندان کے ایک کونے میں محفوظ کر کے چلا گیا۔ میں نے سمجھ لیا بارہ بج گئے ہیں۔ روٹی کھانے کے لیے ماسی بتاں کے تنور پر جا رہا ہے۔ موقعہ مل گیا تھا۔ اِدھر اُدھر کوئی تھا بھی نہیں۔ میں نے بڑے دالان میں جو چارپائی پڑی تھی وہ گھسیٹ کر دروازے کے ساتھ لگا دی۔ اُوپر چڑھ کر چابی ڈھونڈی، جو بڑی آسانی سے مل گئی۔ چارپائی سے نیچے اُتر کر میں نے تالا کھولا اور اُلٹا چارپائی کو پرے کھسکا دیا کہ کسی کو شک بھی نہ پڑے اور بعد میں دوبارہ اس سے فائدہ اُٹھا لوں۔ اندر داخل ہوا تو کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ چاروں طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ میری آنکھیں ماحول سے مانوس ہو گئیں۔ سامان بہت کم تھا اور نہ جانے کیسی بو تھی جس سے میری سانس رُک رہی تھی۔ سب سے پہلے تو میں نے یہ دیکھا کہ دوسری کوٹھڑی کا دروازہ بند ہے یا نہیں۔ وہ بند تھا اور کنڈی لگی تھی۔ اس سے مجھے یک گونہ اطمینان حاصل ہو گیا۔

کوٹھڑی خالی خالی نظر آ رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے اندر بہت کم چیزیں رکھی

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ہوئی تھیں۔ دیوار سے دو پرانے پھٹے ہوئے بوکے لٹک رہے تھے۔ ایک زیچ بھی تھی۔ ان کے علاوہ وہ خشک تھی جسے لالو ہر روز استعمال کرتا تھا۔ ان کے نیچے چارپائی دیوار کے ساتھ بچھی تھی اور اس کی پائنتی تہہ کیا ہوا بستر پڑا تھا۔ میری مہم بے کار ثابت ہوئی تھی۔ وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ میں مایوس ہو کر باہر جانے والا تھا کہ اچانک چارپائی پر تہہ کیے بستر کے اندر کوئی چیز چمکتی ہوئی دکھائی دی۔ یہ کیا ہے؟ اور میں اُسی لمحے چارپائی کے پاس پہنچ گیا۔ غور سے دیکھا یہ گوٹا تھا۔ میں نے بستر میں سے گوٹے والے کپڑے کو کھینچا۔ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ وہاں صرف ایک وہی دوپٹہ نہیں تھا، جس کے کناروں پر گوٹا لگا تھا اور بھی چار پانچ کپڑے تھے۔ یہ سب کے سب ریشمی تھے اور ان پر گوٹے کے علاوہ کناری بھی لگی ہوئی تھی۔ میں نے دوپٹے کو جلدی سے تہہ کیا اور اسے وہیں ریشمی کپڑوں کے اُوپر رکھ دیا۔ بستر کی تہہ بھی ٹھیک کر دی۔ اب اور کچھ دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی، باہر آ گیا۔ کارروائی مکمل کی اور بھاگا پھوپھی جاگاں کی طرف۔ انہیں یہ سنسنی خیز خبر سنائی تو وہ ہنس کر بولیں: "چل دے جھوٹیا۔"

پھوپھی نے ایک فقرہ کہہ کر سارا معاملہ ہی ختم کر دیا تھا۔ دوسرے روز صدر دین نے مجھے گزرتے ہوئے دیکھا تو آواز دے کر بلا لیا: "کیوں دلاور، تو لالو کی کوٹھڑی میں گیا تھا؟" اس وقت صدر دین ایک لمبی سوئی کو جوتے کے ایک طرف آر پار کر رہا تھا۔ اُس نے بغیر میری طرف دیکھے یہ سوال کیا تھا۔ میں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اتنے میں بابا محمد دین بھی آ گئے۔ انہوں نے غیر کے گھر میں چوروں کی طرح گھسنے پر بڑی سرزنش کی۔ لالو اِدھر سے گزر رہا تھا۔ وہ ذرا رُکا اور یہ کہہ کر آگے چلا گیا: "یہ آج کل کے باؤ کا حال ہے ہونہہ۔" گویا پھوپھی نے میری بات پر تو اعتبار نہ کیا مگر اسے پھیلا ہر طرف دیا۔

آج سوچتا ہوں کہ اگر دوسرے دن لالو اپنا پھٹا ہوا بوکا صدر دین کو مرمت کیلئے نہ دیتا اور صدر دین بوکا ٹھیک کرنے کے بعد اسے یہ شرط نہ سُنا دیتا کہ جب تک یہ نہیں بتاؤ گے کہ گوٹے کناری والے کپڑے کس کے لیے خریدے ہیں، بوکا واپس نہیں دوں گا۔ اور لالو اتنا مجبور نہ ہو جاتا کہ اصل بات بتانے پر رضامند ہو جاتے تو مجھے اور

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ی محلہ پر ہرگز یہ راز منکشف نہ ہوتا کہ لالو کے بیاہ کے تیرہ برس بعد اس کے گھر لڑکا
ہے اور یہ گوٹا کناری والے کپڑے اس نے اپنی بیوی کے لیے بنوائے ہیں۔

صبح ابر آلود تھی، کالے کالے بادل ہواؤں میں اس طرح اُڑ رہے تھے، جیسے پانی
بھری ہوئی لاتعداد مشکیں ایک بہت بڑے تالاب میں تیر رہی ہوں۔ ان کے منہ ابھی
ہیں۔ قدرت جب تسمے کھول دے گی تو ہر طرف پانی ہی پانی ہو جائے گا۔ جس وقت
رت نے پہلی مشک کا منہ کھولا اور بوندا باندی شروع ہوئی میں نے دیکھا کہ لالو بازار
اں میں ایک تانگے کے اندر بیٹھ رہا ہے اور اس نے ہاتھ میں ایک گٹھڑی پکڑ رکھی
۔ تو لالو اپنی بیوی کے لیے کپڑے لے کر جا رہا ہے۔ اس کی بیوی یہ کپڑے دیکھ کر
ی خوش ہو گی اور جب لالو اپنے بچے کو گود میں اُٹھائے گا تو اس کا چہرہ کس طرح شگفتہ
ائے گا۔ میں یہ سوچ رہا تھا اور میرے سامنے تانگہ چلا جا رہا تھا۔ لالو زیادہ سے زیادہ
ر دن کے بعد واپس آجاتا تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں رمضان ماشکی اس کے گھروں میں
پہنچایا کرتا تھا۔ اس کے اپنے گھر بھی تھے جہاں صبح شام گھڑے بھرنا اس کا منصبی
ض تھا۔ رمضان، لالو کا کام بڑی بے دلی اور بیزاری سے کرتا تھا۔ اس پر لوگوں کو شکایات
تی تھی اور لالو اس شکایت کو یوں دُور کر دیتا تھا کہ جس گھر کو بھی شکایت ہوتی تھی،
ں دو تین فالتو مشکیں لے جاتا تھا۔ اور ان کے پیسے وصول نہیں کرتا تھا۔ اس کو
دن کے بعد واپس آجانا چاہیے تھا، لیکن وہ نہ آیا۔ دو دن اور گزر گئے۔ رمضان کو بڑی
ں سے منایا گیا کہ وہ لالو کے حصے کا کام بدستور کرتا رہے۔ اُسے معقول معاوضہ دیا جائیگا۔
اس نے غالباً اس بنا پر یہ بات مان لی کہ اگر لالو چند روز اور نہ آیا تو اس کے گھر بھی اسے
ائیں گے کسی اور ماشکی کو نہیں ملیں گے۔

پانچویں روز لالو آگیا۔ میں نے اس میں ایک خاص تبدیلی دیکھی اور وہ تبدیلی یہ تھی کہ وہ
ی طرح گرم مزاج نہیں رہا تھا۔ کم از کم ہر موقعہ پر غصیلا پن کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ کوئی بیوی
کے متعلق سوال کرتا تو کہتا: "اللہ نے مہربانی کی ہے۔"

"بچہ کیسا ہے؟"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"اللہ کی بڑی مہربانی ہے۔" ہر سوال کے جواب میں اللہ کی بڑی مہربانی ہے، ضرور
کہتا تھا۔ اس کا چہرہ وجود یوار کے ساتھ لگی ہوئی ایک پرانی از کار رفتہ مشک کی طرح کھردرا،
خشک اور کرخت رہتا تھا۔ اب تر و تازہ ہو گیا تھا جیسے اس مشک کو مرمت کر کے اس
میں پانی ڈال دیا ہو۔ اور یہ پانی جھم جھم کر رہا ہو۔ وہ تیسرے چوتھے روز بیوی کے نام خط
ضرور لکھواتا تھا اور یہ خط عام طور پر میں ہی لکھتا تھا۔ اس خط میں وہ بیوی کو بچے کی دیکھ بھال
کے لیے بڑی تاکید کرتا تھا۔ مثلاً بچے کو دودھ ڈھیر سارا پلانا تاکہ موٹا ہو جائے۔ "ٹانگوں پر
مالش کرنا، بالوں میں کنگھی کرنا۔ آخری ہدایت سن کر میں ہنس پڑتا۔ "چاچا، وہ تو ابھی چھوٹا سا
بچہ ہے۔ بال کہاں ہیں اس کے سر پر کہ کنگھی کی جائے۔" لالو بھی ہنس پڑتا اور بچے کے
بالوں میں کنگھی کرنے کی بجائے اس کی آنکھوں میں سرمہ ڈالنے کی تاکید کرتا اور میں یہ ہدایت
ایک دو سطروں میں لکھ دیتا اور لالو خط لے کر خود تحصیل بازار جاتا اور وہاں پوسٹ آفس
کے لیٹر بکس میں ڈال کر واپس آتا۔ ہر بار خط لکھوانے کے بعد مجھ سے یہ سوال ضرور کرتا۔
باؤ خط کتنے دنوں میں رکھی کو مل جائے گا۔ اور میں اسے تسلی دینے کی خاطر کہہ دیتا دو تین
روز میں، حالانکہ شیخوپورہ خاص سے کسی گاؤں میں ڈاک لے جانے کے لیے کئی روز صرف
ہو جاتے تھے۔ اس روز اس نے خط لکھوایا تو کہنے لگا: "باؤ ایک بات لکھنی تو بھول ہی گئے ہو۔"

"کیا بات؟" میں نے پوچھا۔

"رکھی نے بتایا تھا کہ اسے داتا دربار کے گلے میں پانچ روپے ڈالنا ہیں۔ اسے لکھ
دینا چاہیے تھا کہ خود آکر پانچ روپے ڈالے۔ باؤ اس معاملے میں کسی دوسرے کا ہاتھ کیوں
لگے۔"

"اس نے منت مانی تھی؟" میں نے استفسار کیا۔

"ہاں باؤ، اس نے منت مانی تھی کہ اگر اللہ نے لڑکا دیا تو وہ دربار داتا صاحب جا کر
پورے پانچ روپے گلے میں ڈالے گی۔"

"فکر نہ کرو چاچا، اسے منت کی بات یاد ہو گی، لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

لالو کا خط ابھی [illegible] ہوگا کہ رکھی کا خط آگیا جس میں اس نے لکھا

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

تھا کہ وہ جمعرات کو لاہور آرہی ہے۔ یہ خبر لالو کے لیے زندگی کی غالباً سب سے اہم
تھی۔ وہ اُسی وقت ڈبی بازار گیا۔ دنداسہ، ایک خوبصورت چمکتی دمکتی سُرمہ دانی، پاؤڈر کا ڈبہ،
رنگ برنگی چوڑیاں، ریشمی رومال اور کنگھیاں خرید لایا۔ اور رمضان کی منت سماجت کر کے اُسی
روز اپنے گاؤں روانہ ہو گیا۔ جمعرات کا دوسرا پہر شروع ہو چکا تھا۔ کہ میں نے گھر کی کھڑکی
سے چوک میں لڑکوں کا ایک غول دیکھا جو ہماری گلی میں داخل ہو رہا تھا۔ محلے کے لڑکے
ریچھ یا بندر کا تماشا دکھانے والے مداریوں کے ارد گرد اس انداز سے جمع ہوا کرتے ہیں
میں نے سمجھ لیا کہ کوئی مداری گلی میں داخل ہو رہا ہے مگر ڈگڈگی کی آواز کیوں نہیں آرہی
ہے۔ اوہ یہ تو لالو ماشکی ہے جو اپنی بیوی کو اپنے گھر لا رہا ہے۔ میں فوراً نیچے اُترا اور مجمعے
کی طرف جانے لگا۔ عجیب منظر تھا۔ لالو نے صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے آج
اُس کے پاؤں میں لال کھل کا جوتا بھی تھا اور وہ اپنی بیوی کے پہلو میں یوں چل رہا تھا جیسے
مرغا جو مرغی کو دڑبے میں سے نکال لے آئے اور پھر سینہ پھلا کر، اکڑ اکڑ کر اس کے ساتھ
قدم اٹھائے۔

اُس کی بیوی پست قامت کی ایک دُبلی پتلی عورت تھی۔ ناک میں نتھ تھی۔ رنگ سیاہ
تھا اور اپنے چہرے پر اُس نے پاؤڈر کا وہ سارا ڈبہ خالی کر دیا تھا۔ جو دو روز پیشتر اس کا
شوہر اُس کے لیے ڈبی بازار سے خرید کر لایا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے نیچے گالوں پر پاؤڈر
سے ملے ہوئے پسینے کے قطرے ایک مضحکہ خیز منظر پیش کر رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ
کسی پھوہڑ عورت نے دیگچی میں سے چاولوں کی پیچ نکالتے وقت چاولوں کے کئی دانے
اسی کھرے میں بکھیر دیے ہوں۔ لباس اُس کا ریشمی تھا۔ گوٹا کناری لگا ہوا۔ پاؤں میں اونچی
ایڑی کی گرگابی تھی جس کی وجہ سے وہ چلنے میں دقت محسوس کر رہی تھی۔ بانہوں میں چوڑیاں
تھیں اور گود میں ایک کالا بھجنگ بچہ تھا اور لالو جس کی کمر کا خم آج محسوس ہی نہیں ہوتا
تھا، پنکھے سے بچے کے منہ پر سے مکھیاں اُڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت میاں
بیوی کے ارد گرد جتنے لوگ بھی چل رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں شرارت بھری مسکراہٹ
اُمڈ آئی تھی۔ اور بچوں کا تو یہ حال تھا کہ بار بار دلھن کے آگے آجاتے تھے اور بچے کو دیکھ دیکھ

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

کر قہقہے پر قہقہہ لگاتے تھے۔ گلی کا مختصر سا فاصلہ میاں بیوی نے کم از کم بیس منٹ میں طے کیا۔ وہ تو شکر ہے کہ بھر پور گرمی کے دن نہیں تھے ورنہ ان کا بُرا حال ہو جاتا۔ امّی اور میری بہنیں ڈیوڑھی میں سے نکل کر گلی میں آ چکی تھیں اور بھی عورتیں آ گئی تھیں جن میں پھوپھی جاگاں نمایاں تھیں۔ امّی نے جھٹ باہنیں پھیلا کر بچّے کو گود میں لے لیا۔ "سبحان اللہ چاند سا چہرہ ہے۔"

"پھوپھی جاگاں کب پیچھے رہنے والی تھیں۔ بلائیں لے کر بولی: "اللہ نظرِ بد سے بچائے۔"

لالو کا چہرہ خوشی سے لال ہو رہا تھا اور اس کی بیوی جو چالیس سال سے کچھ اُوپر ہی تھی۔ کنواری لڑکیوں کی طرح شرمائے جا رہی تھی۔ امّی دونوں کو اُوپر لے آئیں۔ رکھی کو پیڑھی پر بٹھایا اور لالو سے کہا کہ وہ چوکی پر بیٹھ جائے۔ پھوپھی جاگاں نے جلدی سے چولہے کے اُوپر سے وہ ڈبّہ اٹھایا جس میں سُرخ مرچیں محفوظ کر دی جاتی تھیں اور ضرورت کے وقت انہیں سِل کے اُوپر پیس کر ہانڈی میں ڈالا جاتا تھا۔ پھوپھی نے ڈبّے میں سے گِن کر مرچیں نکالیں۔ انہیں بچّے پر وارا اور چولہے کے جلتے ہوئے کوئلوں میں ڈال دیا۔ گویا اب بچّہ بُری نظر سے محفوظ ہو گیا تھا۔ میاں بیوی کے لیے سوڈا واٹر کی بوتلیں منگوائی گئیں۔ اور شام تک رکھی سے ایسے ایسے سوال کئے گئے کہ وہ بے چاری دل میں پچھتا رہی ہوگی کہ گاؤں سے کیوں لاہور میں آئی ہے۔ آخر یہ سوال پوچھنے کی کیا تُک تھی کہ تیرے گھر تیرہ سال تک بچّہ کیوں نہیں ہُوا۔ جس وقت یہ سوال پوچھا گیا تھا۔ لالو نیچے جا کر رمضان سے بات چیت کر رہا تھا۔ آخر اس کے ساتھی نے اس کی عدم موجودگی میں اس کے گھروں میں شکیں ڈالی تھیں۔ اور وہ مقررہ معاوضے کا حق دار تھا۔ شام کو دونوں پھوپھی جاگاں کے ساتھ داتا دربار گئے اور رات کو واپس آئے۔

رکھی تین روز لاہور میں رہی اور اس نے اپنے قیام کے دوران چڑیا گھر، عجائب گھر، شاہی مسجد، قلعہ اور شالامار باغ کی سیر کر لی۔ وہ جب واپس جانے لگی تو بہت خوش تھی۔ لالو اسے چھوڑنے ساتھ گیا۔ اب لالو خوش دلی سے کام کرتا تھا۔ کوئی سوال کرتا تو خوش

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ہو کر جواب دیتا اور دس بارہ روز کے بعد جب اپنے گاؤں جاتا تو ہوری بچے کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ لے کر جاتا۔ ایک بار تو وہ کھلونے لے آیا۔ امّی نے ہنس کر کہا:

"لالو بے صبرا نہ بن، ابھی بچہ بہت چھوٹا ہے۔ کھلونوں سے نہیں کھیل سکتا۔"

لالو ہنس کر بولا: "بڑا ہو ہی جائے گا۔ ایک دن۔"

"اللہ کرے سو سال کا ہو۔" امّی نے دعا دی اور اس دعا کا یہ اثر ہوا کہ چار پانچ روز بعد لالو کو جو خط ملا اس میں درج تھا کہ رکھی کا دودھ سوکھ گیا ہے اور بچہ بیمار ہو گیا ہے۔ وہ فوراً مائی مراد دائی کے پاس پہنچا۔ اس سے بیوی کے لیے پڑیاں لیں۔ چھوٹی مسجد کے مولوی صاحب سے تعویذ لیا اور گاؤں چلا گیا۔ تین روز بعد واپس آیا تو قدرے پریشان تھا۔ میں نے پوچھا: "کیا ہوا چچا؟"

"دودھ نہیں اترا، گائے کا بندوبست کر آیا ہوں۔" لالو نے منہ بسور کر کہا۔

"فکر کیوں کرتے ہو چچا، گائے کا دودھ پی کر خوب تگڑا جوان بن جائے گا۔ گائے کا دودھ بہت اچھا ہوتا ہے۔"

"اچھا، باؤ جی۔"

"کیوں نہیں؟"

جمعرات کو معلوم ہوا کہ لالو کے گاؤں سے کوئی آدمی آیا تھا اور اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ وہ کچھ دن گزار کر واپس آیا تو جب گلی میں داخل ہوا تو یوں لگتا تھا جیسے اس نے دونوں پسلیوں سے بھری ہوئی مشکیں لگا رکھی ہیں اور بڑی مشکل سے قدم اٹھا رہا ہے۔ کسی نے بھی اس سے بچے کے بارے میں کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ کسی نے جو یہ کہا ہے کہ مصیبت تنہا نہیں آتی تو کچھ غلط نہیں کہا ہے۔ لالو کے بچے کو مرے ہوئے ڈیڑھ دو ماہ ہی گزرے ہوں گے کہ بچے کی ماں بھی لالو کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی گئی اور اب لالو کا دنیا میں صرف ایک بھائی رہ گیا جو عمر میں اس سے بڑا تھا اور جس نے نوجوانی میں کمہاروں کے خاندان میں ایک لڑکی سے شادی کی تھی۔ مگر چھ ماہ بعد ہی اسے طلاق دے دی تھی۔ کمہار اس کی اس زیادتی کو بھولے نہیں تھے اور جب بھی موقع ملتا تھا وہ

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

لالو کے بھائی کو کسی نہ کسی مسئلے میں اُلجھا کر پریشان کر دیتے تھے۔ اس کی تھوڑی سی ارضی تھی جس کی آمدنی پہ وہ زندہ تھا۔

یہ ساری باتیں مجھے پھوپھی چاگاں نے بتا دی تھیں مگر وہ یہ بات نہ بتا سکی کہ لالو نے گرمیوں میں رات کو بھی کوٹھڑی کے اندر کیوں سونا شروع کر دیا تھا۔ پہلے کی طرح بڑے دالان میں اپنی چارپائی کیوں نہیں بچھاتا۔ لالو کی طبعی خشونت لوٹ آئی تھی بلکہ وہ پہلے سے بھی زیادہ غصہ ور ہو گیا تھا۔ کسی سے بھی گفتگو کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ کوئی سوال کرتا تو ایک آدھ جملے میں جواب دے کر چلا جاتا۔ ہر وقت کھویا کھویا رہتا تھا۔ ایک روز امّی نے کہا:

"بارہ دن اُوپر ہو گئے ہیں۔ لالو نے پیسے نہیں مانگے"۔ امّی کے اس فقرے پر مجھے بھی یاد آ گیا کہ ایک روز میں نے دوپہر کے وقت کوٹھڑی کے اندر جھانک کر دیکھا تھا تو وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ ہاتھ میں پنکھا تھا۔ مگر وہ جھلنے کی بجائے پنکھے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ مگر یہ عجیب بات تھی کہ اپنی وارفتگی کے باوجود اس نے اپنے فرض میں کبھی کوئی کوتاہی نہیں کی تھی۔ صبح و شام ہر گھر میں باقاعدگی کے ساتھ پانی لے جاتا تھا۔ کوئی فالتو مشک مانگتا تو انکار کر دیتا اور جب کوئی بیوی بچے کے بارے میں کوئی سوال کرتا مثلاً: "لالو تجھے اپنی بیوی تو یاد آتی ہو گی، اس کے گہنے کپڑے کہاں گئے؟" تو اس کی بھنویں تن جاتی تھیں۔ بڑے غصے سے کہتا: "مجھے پتا نہیں"۔

اگر کوئی عورت پوچھتی: "لالو اگر تو راضی ہے تو تیرے لیے بر...."

"مائی، زبان سنبھال کر بات کر"۔

"ہائے اللہ، میں تو تیری بہتری...."

"مجھے بہتری دہتری نہیں چاہیے"۔

کچھ مدت بعد میں نے دیکھا کہ لالو کی حالت میں ایک نمایاں تبدیلی آ گئی ہے۔ اس کا غصہ جو ناک پہ دھرا رہتا تھا۔ ایک ایسے انکسار میں تبدیل ہو گیا تھا۔ جس کی اس سے توقع نہیں تھی۔ ایسی حالت میں وہ ایک ایسا بچہ نظر آتا تھا جو اپنی ضد میں ناکام رہنے کے بعد

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

دیر تک ریں ریں کرکے اب اپنا سر دیوار کے ساتھ لگا کر خاموش ہو گیا ہو۔ مسکراہٹ
بھی اس کی آنکھوں اور ہونٹوں پر نہ آ سکی۔ لیکن یہ ضرور ہوا کہ وہ ہر اُس بات کا جواب
سے دیتا تھا جو اُس سے پوچھی جاتی تھی۔ بالعموم خاموش رہتا تھا۔ خود کسی سے کچھ
یں کہتا تھا۔

گرمیوں کے دن تھے، شام ہونے والی تھی۔ میں اپنے کوٹھے پر چارپائی کے اُوپر
تھا اور میری نظر فضا میں بھٹک رہی تھی۔ اتنے میں دیکھا کہ ایک طرف سے سیاہ بادل کا
ٹکڑا دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا ہے۔ بادل کے اس ٹکڑے کو دیکھ کر مجھے لالو کی شکل
خیال آگیا اور اس کے ساتھ ہی لالو کا چہرہ سامنے آگیا۔ "اس وقت اتنی گرمی میں اپنی کوٹھڑی
کے اندر بیٹھا کیا کر رہا ہوگا۔" میں نے اپنے آپ سے سوال کیا اور اس کا جواب معلوم
کرنے کے لیے نیچے اُتر آیا۔ اس کی کوٹھڑی کا دروازہ بند تھا، تالا نہیں لگا تھا۔ میں نے
دروازے پر دستک دیتے ہوئے آواز دی "چاچا" کوئی جواب نہ ملا۔ میں دروازہ کھول
اندر گیا، دوبارہ کہا "چاچا" مگر لالو اندر نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ جب میری آنکھیں
چیزوں میں امتیاز کرنے لگیں تو میں نے دیکھا کہ دوسری کوٹھڑی کا دروازہ کھلا ہے۔
وہ تو اُسے کبھی کھول کر باہر نہیں جاتی تھیں۔ کنستریوں سے تیل نکال کر سب سے پہلا کام
کرتی تھیں کہ دروازے کو بند کر کے کنڈی لگا دیتی تھیں۔ اس معمول میں انہوں نے کبھی توقف
نہیں کیا تھا۔ پھر آج یہ دروازہ کیوں کھلا ہے۔ یکایک مجھے احساس ہوا کہ کوٹھڑی میں کوئی
اندر بھی ہے۔ کون... کون... یا الٰہی... یہ کون ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا اور
میں دہشت زدہ ہو کر باہر نکل آیا۔ ڈیوڑھی میں چلا گیا۔ سانس پھولی ہوئی تھی۔ معلوم نہیں لالو
کب میرے قریب سے گزرا اور کب میرے پاس آگیا۔ مجھے اس وقت اس کی موجودگی کا علم
ہوا۔ جب اُس نے کہا:

"بابو، اب کوئی ریشمی کپڑا نہیں ہے میرے گھر میں، اندر رہ جایا کرنا پچھتائے گا۔ گھنٹے
ڈیڑھ گھنٹے بعد جب میں چارپائی پر سونے کی کوشش کر رہا تھا تو یہ احساس مجھے بے چین
کر رہا تھا کہ کوٹھڑی میں کون تھا۔ کیا یہ میری بیٹی تھی جس نے یہ احساس دلا دیا تھا کہ

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

کوٹھڑی میں کوئی اور بھی ہے۔

دوسرے دن شام کے وقت مَیں نے دیکھا کہ لالو ایک گلاس میں دودھ لیے ڈیوڑھی میں قدم رکھ رہا ہے۔ اُس نے میری طرف دیکھا۔ ہونٹوں سے ایک لفظ بھی نہ نکالا مگر مَیں نے محسوس کیا کہ وہ کہہ رہا ہے "باؤ، اب کوئی ریشمی کپڑا نہیں ہے، میرے گھر میں اندر نہ جایا کر پچھتائے گا۔"

کئی بار مَیں نے دیکھا کہ وہ دودھ کا گلاس لے کر اپنی کوٹھڑی میں داخل ہو رہا ہے۔ یہ واقعہ بالکل معمولی تھا۔ ظاہر ہے وہ رات کو روٹی نہیں کھاتا تھا۔ دودھ پی کر سو جاتا تھا۔ مگر پھوپھی جاگاں نے بتایا کہ وہ شام کو مائی بتاں کے تنور پر روٹی کھانے کے بعد فضل الٰہی شیر فروش کی دکان پر جا کر گلاس میں دودھ ڈلواتا ہے اور یہ گلاس کوٹھڑی میں لے جاتا ہے۔ اس میں بھی کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی وہ سوتے وقت دودھ پی لیتا ہوگا۔

O

لالو کے نام گاؤں سے خط آیا کہ کمہاروں نے پانی کے جھگڑے پر اس کے بھائی کو لہولہان کر دیا ہے۔ مجھے اُمید تھی کہ وہ خط پڑھتے ہی چلا جائے گا، لیکن وہ نہ گیا۔ یا اللہ، اس شخص کا دل کتنا کٹھور ہو گیا ہے۔ بھائی زخمی ہو گیا ہے اور اس پر کچھ اثر ہی نہیں ہُوا۔ پھوپھی جاگاں نے مجبور کر کے اسے بھیج دیا اور وہ تیسرے دن ہی واپس آ گیا۔ "بھائی ٹھیک ہے؟" امّی نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے، اللہ کے گھر میں۔"

اسے ایک اور خط ملا جس میں درج تھا کہ گاؤں کے پٹواری نے اُسے بُلایا ہے۔ اس کے بھائی کی اراضی کا مسئلہ طے کرنے کے لیے۔ وہ چلا گیا۔ وہ دو روز تک گاؤں میں رہا اور ان دنوں ایک واقعہ ہو گیا۔ ہُوا یہ کہ امّی نے کوٹھڑی میں سے تیل لانے کے بعد گھر والوں کو بتایا کہ انہوں نے لالو کی کوٹھڑی میں سانپ دیکھا ہے۔ تو کیا میری چھٹی حِس نے اسی کی موجودگی کا احساس کیا تھا؟ طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں۔ سانپ نے لالو کو کیوں نہیں کاٹا۔ وہ لالو کی کوٹھڑی میں کیسے آ گیا۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ محلے کے کچھ نوجوان

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ہاتھوں میں لالٹینیں اور لاٹھیاں لے کر کوٹھڑی میں گھس گئے اور تھوڑی دیر بعد گلی کی نالی میں ایک بھورے رنگ کا کم از کم دو فٹ لمبا پیلا پیلا سا سانپ بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اور اس کے ارد گرد گلی کے قریباً سارے بچے حیرت زدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ آدھ پون گھنٹے کے بعد گلی کا جمعدار سانپ کی لاش اپنی کڑھائی میں ڈال کر لے گیا۔

لالو آیا اور جیسے ہی اُس نے گلی میں قدم رکھا ایک لڑکے نے اسے بتایا:

"چاچا، شکر کہ ہم نے سانپ مار دیا ہے۔"

مَیں قریب ہی کھڑا تھا۔ مَیں نے دیکھا کہ لالو اس انداز سے لڑکے کو دیکھ رہا ہے جیسے اُس کے لفظ اُس کی سمجھ میں نہیں آتے۔ "چاچا!"

لالو اب بھی اُسی انداز سے لڑکے کو دیکھ رہا تھا۔ اور اس شام مَیں نے دیکھا کہ لالو اپنے دائیں کندھے پر مشک اور بائیں ہاتھ میں وہ گندا پیالہ لیے کوٹھڑی میں سے نکل رہا ہے جو مَیں نے کئی ماہ پیشتر تیل والی کوٹھڑی کے ایک کونے میں رکھا تھا۔ یہ بات دیکھنے کے لیے کہ کوٹھڑی میں سانپ ہے یا نہیں۔ اس نے میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ سر جھکائے چلتا گیا، چلتا گیا اور گلی میں سے نکل گیا۔ اس روز کے بعد مَیں کبھی لالو کو نہ دیکھ سکا۔ چند روز گزر گئے اس کے گاؤں کا ایک شخص آیا اور اُس کا سارا سامان لے گیا۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

صدر دین عرف صدرا

اگر آج کوئی شخص چوک دیوی دتا میں کسی نوجوان سے پوچھے کہ کیا تم نے موچی صدر دین کا نام کبھی سنا ہے جو اُس کونے والے مکان میں رہتا تھا؟ تو وہ ایک لمحہ تامل کیے بغیر کہہ دے گا:

"نہیں صاحب! میں نے یہ نام کبھی نہیں سنا۔"

کسی بوڑھے سے یہ سوال پوچھیں گے تو وہ ذرا سوچ کر کہے گا:

"مدت ہوئی میں نے اسے دیکھا تھا!"

"آپ اس کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟"

"یہ جانتا ہوں کہ ایک موچی تھا۔"

"آپ اس کی کہانی بتا سکتے ہیں؟"

"کہانی ــــ کہانی کیا ہوگی بے چارے کی؟"

یہ ٹھیک ہی تو ہے۔ ایک گمنام موچی کی بھلا کیا کہانی ہوگی؟ مگر میرے سینے میں اُس کی کہانی محفوظ ہے۔ چولہے کی راکھ کی طرح گرم اور گیلی لکڑی کے مانند سُلگتی ہوئی۔ اور آج میں یہی کہانی سنانے لگا ہوں۔

صدر دین کی دکان چوک دیوی دتا کا دھڑکتا ہوا دل بن گئی تھی۔ سردی ہو یا گرمی، صبح ہو یا شام اس کی رونق میں کمی بیشی تو ضرور آ جاتی تھی لیکن یہ رونق کبھی ختم نہیں ہوتی

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

تھی۔ چھوٹی سی دکان تھی۔ اِس کے ساتھ اس لکڑی کے تختے کو بھی شامل کر لیا جائے جو دکان کے آگے لگا رہتا تھا، تو اس کی لمبائی زیادہ سے زیادہ تین گز اور چوڑائی دو سوا دو گز سے آگے نہیں بڑھتی تھی۔ مگر اِس چھوٹی سی دنیا میں ہر وقت محفل جمی رہتی تھی۔

دکان کے اندر مستقل طور پر دو آدمی بیٹھتے تھے، صدر دین اور اُس کا چھوٹا بھائی شیرا۔ دکان کے اندرونی دروازے کے آس پاس دو تین آدمیوں کے بیٹھنے کی بھی گنجائش نکل آتی تھی۔ اور لکڑی کے تختے پر بھی ایک دو آدمی بیٹھ جاتے تھے۔

صدر دین کی بیوی نے دکان سے ملحقہ کمرے کو مٹی سے بڑی اچھی طرح لیپ رکھا تھا۔ اس لیے جو لوگ زمین پر بیٹھ جاتے تھے، انہیں اپنے کپڑوں کے خراب ہونے کا اندیشہ نہیں رہتا تھا۔

مَیں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ دکان کے اندر صرف دو آدمی بیٹھتے تھے مگر دینو کو اندر آنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ دینو، سارے محلّے کا مغنّی تھا جو دکان کے اندر اِن دو بھائیوں کے درمیان اپنی خاص نشست پر بیٹھ کر حقّے کے دو تین لمبے لمبے کش لے کر، اپنی بے نُور آنکھوں میں مسکراہٹ کے مدّھم سے سائے بھر کر چند لمحے خاموش رہتا تھا۔ گھڑے کو جسے وہ یا تو اپنے ساتھ لے کر آتا تھا یا شیرا گھر کے کسی کمرے سے اُٹھا کر لے آتا تھا، اپنے زانوؤں میں دبا کر اپنا ٹُنجا ہاتھ اُس کے اندر ڈال کر جب گاتا تھا، تو ایک سماں بندھ جاتا تھا۔ بچّے کھیل چھوڑ کر دکان کے تختے کے پاس آ کھڑے ہوتے تھے۔ گزرنے والے لوگ چلتے چلتے رُک جاتے تھے۔ صدر دین اور شیرے کے ہاتھ تیزی سے حرکت کرنے لگتے تھے۔ گاتے ہوئے وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتا تھا۔ اُن لمحوں میں مجھے یُوں محسوس ہوتا تھا کہ ایک پرندہ چیختا ہُوا کسی اَن دیکھے اُفق سے آیا ہے اور دُور بلندیوں میں پرواز کر رہا ہے۔

صدر دین کا کنبہ بہت مختصر تھا۔ ایک تو اُس کی بیوی تھی جو اپنے دُبلے پتلے شوہر کے مقابلے میں خاصی موٹی تھی۔ صدر دین اُسے ہمیشہ "ہدایتے دی ماں" کہہ کر پکارتا تھا۔ اور ایک ان کا بیٹا تھا۔ ہدایت اللہ۔ باپ کی طرح لمبا۔ سانولا رنگ۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

پیشانی کشادہ۔ دوڑنے میں وہ اپنے سارے ہمجولیوں سے آگے نکل جاتا تھا۔

ہدایت اللہ کو دکان پر کام کرنے سے نفرت تھی۔ وہ دکان میں شاذ و نادر ہی آتا تھا۔ صدر دین خود نہیں چاہتا تھا کہ وہ بھی موچی ہی بنے۔ اس لیے اس نے اپنے بیٹے کو پرائمری سکول میں داخل کرادیا تھا اور وہ میرا سکول فیلو تھا۔ اس سے پیشتر کہ میں ہدایت اللہ کے بارے میں مزید کچھ کہوں شیرے کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ شیرا صدر دین کا سگا بھائی تھا۔ دونوں بھائیوں کو ایک دوسرے سے بڑا پیار تھا۔ مگر شیرا رہتا تھا اپنے تائے کے گھر میں جو چونے منڈی میں واقع تھا۔ تائے کی غالباً اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس لیے اس نے شیرے کو اپنے ہاں رہنے پر مجبور کر لیا تھا۔ شیرا روزانہ صبح سویرے دکان پر آ جاتا تھا اور اس وقت اپنے گھر کو روانہ ہوتا تھا جب دکان بند ہونے لگتی تھی اور دکان عام طور پر دینو کے جانے پر ہی بند ہوتی تھی۔

صدر دین جس مکان میں رہتا تھا، وہ اس نے ایک ایک پیسہ جوڑ کر خریدا تھا۔ لاہور میں پیدا نہیں ہوا تھا کسی گاؤں میں رہتا تھا۔ پہلی بار لاہور میں آیا تو لاہور نے اس کا دامن اس طرح کھینچا کہ جب دوبارہ یہاں آیا تو اپنے تائے ہی کے پاس رہنے لگا۔ یہاں تک کہ الگ اپنا مکان خرید لیا جس میں اب وہ اور اس کا کنبہ رہتا تھا۔

صبح سویرے جب آسمان کے مشرقی گوشے میں شفق کی سرخی پھیل جاتی اور علیارام کے کابکوں میں سے کبوتر نکل کر کچھ تو چھتری پر بیٹھ جاتے اور کچھ پرواز کر کے بلندیوں پر چلے جاتے۔ صدر دین دکان کا دروازہ کھولتا۔ جھاڑن سے گرد دیواریں اور دکان کی چیزیں صاف کرتا۔ کرتے کے دامن سے عینک کے شیشوں کی گرد دور کرتا، ادھر ادھر بکھرے ہوئے چمڑے کے بیکار ٹکڑوں کو اکٹھا کر کے انہیں دروازے کے پاس رکھے ہوئے کنستر میں ڈال دیتا۔ اندر پرانی ـــــ مٹی کے پاس حقہ تازہ کرتا، چلم بھرتا اور اسے حقے پر رکھ کر دکان میں لے آتا۔ اتنے میں کوئی نہ کوئی شخص ادھر آ جاتا، وہ لکڑی کے تختے کو اٹھا کر دکان کی سطح سے ہموار کر دیتا۔ صدر دین نے خود کبھی تختہ نہیں اٹھایا تھا۔ یہ کام دوسروں کے ذمے تھا اور وہی یہ کام کرتے تھے۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

اب صدر دین اپنی پرانی اور پھٹی ہوئی گدی پر بیٹھ جاتا۔ ناشتہ ملنے میں
ذرا دیر ہو جاتی تو وہ غصے سے کہتا: "میں مر گیا ہدایتے دی ماں۔"
"نہ مر۔ مریں تیرے دشمن" اور ہدایتے دی ماں گرمیوں میں لسی سے بھرا ہوا پیالہ اور
سردیوں میں چائے کا پیالہ لے کر آ جاتی۔ ایک ڈیڑھ کلیجے کے بڑے بڑے ٹکڑے ان میں
ملجھو بھگوتے جاتے۔ صدر دین ان ٹکڑوں کو جلدی جلدی اپنے حلق سے نیچے اتارنے
میں مصروف ہو جاتا۔ بچی کھچی لسی یا چائے جو کلیجے کے ننھے ننھے ٹکڑوں سے بھاری ہوتی،
ایک ہی بار اپنے منہ میں انڈیل ڈالتا۔ بڑا سا ڈکار لے کر اوپر کرتے کے اندر دونوں
ہاتھ پیٹ پر پھیرتے ہوئے الحمدللہ کہتا اور حقے کی نے ہونٹوں سے لگا لیتا۔ یہ اس کے
روزمرہ کے کام تھے۔ اور ان میں شاذ و نادر ہی فرق پڑتا تھا۔ البتہ کبھی ہدایتے دی ماں
ناشتہ اس کے پکارنے سے پہلے ہی لے آتی تو وہ دہلیز پر رک کر کہتی،
"وے ہدایتے دے ابا۔ مر تو نہیں گئے؟"
"مریں میرے دشمن یا تیرے۔"
ہدایتے دی ماں اسے ایک لفظ بھی نہ نکالنے دیتی۔ پیالہ اس کی طرف بڑھا کر کہتی:
"لے وے اپنا چارا۔"
صدر دین کو چارے کے لفظ سے بڑی چڑ تھی۔ خفا ہو کر منہ پھیر لیتا۔
"میں کوئی گائے بھینس ہوں کہ چارا کھاؤں۔ دے اپنے باپ کو۔"
"ہائے وے ربا۔ ہدایتے دے ابا ناراض کیوں ہو گیا ہے تو۔"
"تو خود ہتھنی ہے۔"
ہدایتے دی ماں ہنس پڑتی۔ صدر دین جب کبھی اسے ہتھنی کہتا تھا تو وہ برا نہیں
مناتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ ہتھنی تو لاکھوں کی ہوتی ہے اور راجوں مہاراجوں کے محلوں کے
دروازوں پر جھوما کرتی ہے۔
اس نوک جھونک کے بعد ہدایتے دی ماں اوپر چلی جاتی اور ہانڈی روٹی کے بندوبست
میں لگ جاتی۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

صدر دین اور شیرا دن میں کئی گھنٹے کام کرنے کے بعد دس پندرہ روز میں جوتوں کے کئی جوڑے تیار کر لیتے۔ یہ جوڑے وہ دکان میں نہیں رکھتے تھے بلکہ انہیں اوپر لے جاتے تھے۔ مہینے میں ایک دو بار ایک شخص آتا جس کے کندھے پر موٹے کپڑے کا ایک تھیلا پڑا ہوتا۔ وہ ان جوڑوں کا بڑا سختی سے جائزہ لیتا۔ جس جوتے میں ذرا سا بھی نقص ہوتا اُسے دکان ہی میں چھوڑ کر باقی جوڑے تھیلے میں ڈال کر لے جاتا۔ اُس شخص کے جانے پر صدر دین کا موڈ خراب ہو جاتا۔ کیونکہ ایسا کبھی ہوتا ہی نہیں تھا کہ وہ دو تین جوڑوں میں نقص نکال کر انہیں صدر دین کے حوالے نہ کر دے۔ صدر دین بہتیرا احتجاج کرتا مگر وہ اُس کی ایک نہ سُنتا۔ تھیلہ اُٹھا کر یہ جا وہ جا۔

صدر دین کو اپنے بیٹے پر فخر تھا اور فخر اس بنا پر تھا کہ وہ موچی نہیں بابو تھا جب وہ بستہ اُٹھائے سکول کی طرف جاتا تھا یا سکول سے واپس آتا تھا تو صدر دین اُسے دیکھتے ہی مُسکرا اُٹھتا تھا۔ اس وقت وہ اپنے دل میں کہتا ہوگا: "میرا باؤ بیٹا پڑھ رہا ہے۔ بڑا ہوگا آپ کھائے گا۔ ہمیں کھلائے گا۔ بیاہ ہوگا۔ دُلہن آئے گی۔" اگر ان لمحوں میں کوئی شخص اُسے خود بخود مُسکراتے ہوئے پاتا تو ضرور سوچتا۔ یہ صدر دین کو کیا ہو گیا ہے۔ مجھے بھی حیرت ہوتی تھی۔ مگر اب مَیں اس کی کیفیت کو بخوبی سمجھتا ہوں۔ وہ ہدایت اللہ کو ہمیشہ باؤ ہدایت اللہ کہتا تھا۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ اُس کی ماں کو ہدایتے دہی ماں ہی کہہ کر پکارتا تھا۔

ہدایت اللہ کو پڑھنے کا کافی شوق تھا۔ سکول سے واپس گھر آتا تھا تو بستہ کھول کر بیٹھ جاتا تھا۔ صدر دین نیچے سے آواز دیتا۔

"باؤ ہدایت اللہ!"

"جی ابا!" اُوپر سے اُس کی آواز آتی۔

"روٹی کھائی؟"

ہدایت اللہ جلدی جواب نہ دیتا یا جواب دینے کی ضرورت ہی محسوس نہ کرتا تو صدر دین اپنا کام چھوڑ کر ننگے پاؤں اُوپر چلا جاتا۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"ہدایتے دی ماں۔ بچہ پڑھ کر آیا ہے۔ روٹی دے۔"

"دیتی ہوں۔ تُو اپنا کام کر دکان میں جاکر۔" ہدایتے دی ماں کو شوہر کا آنا ناگوار گزرتا۔ وہ سوچتی میں ماں ہوں۔ کیا میں نہیں جانتی کہ اسے بھوک لگی ہے؟

پانچویں جماعت تک ہدایت اللہ باقاعدگی کے ساتھ سکول جاتا رہا اور بڑے شوق سے پڑھائی کرتا رہا۔ اس کی املا بڑی خوبصورت تھی۔ خوش خطی سے اسے کافی دلچسپی تھی اور اس سلسلے میں ایک خوش نویس سے اصلاح بھی لیا کرتا تھا۔ محلے کا کوئی شخص ہدایت اللہ کی لکھائی کی تعریف کرتا تو صدر دین کی گردن فخر کے ایک گہرے احساس سے اکڑ جاتی اور ایک روز جب ہدایت اللہ کی تعریف ہو رہی تھی تو صدر دین نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔ "دیکھنا! میرا ہدایت اللہ دفتر میں افسر بنے گا۔ ہم لوگ گمٹی میں بیٹھا کریں گے۔"

چھٹی جماعت کے انچارج صوفی عظیم اللہ تھے جو ماسٹر کم اور صوفی زیادہ تھے۔ بلکہ صوفی ہی صوفی تھے۔ ان کا مکان بارود خانہ کے قریب واقع تھا جو ان کے رسالے "انوار الصوفیہ" کا دفتر بھی تھا۔ جب صوفی صاحب نے دیکھا کہ ہدایت اللہ صاف ستھرے حروف لکھ سکتا ہے تو انہوں نے اُسے اپنے گھر پر بلایا اور رسالے کے خریداروں کے پتے لکھنے کا حکم دے دیا۔ اس نے پتے لکھ دیئے تو صوفی صاحب نے فرمایا:

"برخوردار! تم پتے لکھ دیا کرو اللہ راضی ہوگا۔ ہم بھی راضی ہوں گے۔" اور دونوں کے دونوں راضی ہو گئے۔ باقی رہ گئی ہدایت اللہ کے راضی ہونے کی بات تو صوفی صاحب نے مہینہ گزرنے کے بعد اس کی ہتھیلی پر روپے روپے کے دو نوٹ رکھ دیئے۔ ہدایت اللہ انکار کرتا رہا مگر صوفی صاحب نے جب فرمایا:

"ہدایت اللہ بزرگوں کا کہا مان جاتے ہیں ورنہ اللہ میاں ناراض ہو جاتے ہیں۔"

ہدایت اللہ نہ تو بزرگوں کو ناراض کرنا چاہتا تھا اور نہ اللہ میاں کو اس لیے اس نے روپے لے لیے اور خوش خوش گھر آکر ماں کے حوالے کر دیئے۔ باپ نے یہ خوش خبری سنی تو اس نے ان روپوں میں تین روپے اپنی جیب سے ڈال کر لڈو منگوائے اور سارے

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

محلّے میں یہ خبر پھیل گئی کہ ہدایت اللہ کو پہلی تنخواہ ملی ہے۔

ہدایت اللہ اب زیادہ وقت رسالے کے کاموں میں صرف کرنے لگا۔ صوفی صاحب نے اس کی تنخواہ میں آٹھ روپے کا اضافہ کر دیا۔ صدر دین اور ہدایتے دی ماں کو بڑی خوشی ہوئی کہ بیٹا ترقی کر رہا ہے۔ لیکن اب ہدایت اللہ کو پڑھائی سے دلچسپی برائے نام رہ گئی تھی۔

اور سالانہ امتحان کے آتے آتے یہ دلچسپی بھی ختم ہو گئی اور وہ صوفی صاحب کے رسالے کا منیجر بن کے رہ گیا۔

صدر دین بیٹے کی تعریف سنتا تھا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ چھا جاتی تھی۔ محلے والے اکثر اُسے بتاتے تھے کہ تم بڑے خوش نصیب ہو کہ اتنی سی عمر میں لڑکا کمانے لگا ہے اور صدر دین بڑی بے تابی سے اس دن کا انتظار کر رہا تھا جب اُس کا بیٹا آ کر کہے گا:

"ابا! بگھی بازار میں کھڑی ہے۔ سیر کرنے چلو ناں!"

میرے لڑکپن کے زمانے میں بھاٹی دروازے کے اندر ایک بگھی گزرا کرتی تھی جس میں چار گھوڑے جُتے ہوتے تھے۔ یہ بگھی غالباً میلا رام کی تھی جو بھاٹی دروازے کے باہر کربلا گامے شاہ کے متصل ایک بہت بڑے کارخانے کا مالک تھا۔ صدر دین نے اسی بگھی کو دیکھ کر اپنے ذہن میں بھی اس کا تصور قائم کر لیا تھا۔

وہ صبح ویسی ہی تھی جیسی عام صبحیں ہوتی ہیں۔ آسمان کے مشرقی گوشے میں سُرخی پھیل گئی تھی۔ اور مایا رام کے کبوتر چھتری پر بیٹھنا شروع ہو گئے تھے۔ کچھ اُڑ کر فضا میں گم ہو رہے تھے۔ صدر دین نے معمول کے مطابق چمڑے کے بے کار ٹکڑے کنستر میں ڈالے۔ مٹی کی مٹی کے پاس حقہ تازہ کرنے ہی والا تھا کہ ہدایتے دی ماں نے پکارا:

"ہدایتے دے ابا!"

آواز میں گھبراہٹ تھی۔ ہدایتے دی ماں نے اُسے کبھی اس انداز میں نہیں بلایا تھا۔ صدر دین نے پانی سے بھرے ہوئے لوٹے کو ایک طرف رکھ دیا اور حقہ وہیں چھوڑ کر جانے لگا۔ ہدایت دی ماں ہدایت اللہ کے ماتھے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"کیا ہے ہدایتے دی ماں"؟

"توے کی طرح گرم ہے۔"

صدردین نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ ہدایت اللہ کی پیشانی کو چھوا۔ ماتھا بہت گرم تھا۔

"قے کی ہے۔ سب کچھ نکل گیا ہے۔"

"نمک چٹایا؟" صدردین نے پوچھا۔

"ہاں۔ حکیم کو لے آؤ۔"

"حکیم تو ابھی نیچے نہیں آیا۔" صدردین نے یہ فقرہ کہنے کو تو کہہ دیا۔ مگر وہ خود سوچ رہا تھا کہ اسی گھڑی حکیم کے ہاں چلا جائے اور منت سماجت کر کے انہیں لے آئے۔

اُس دور میں حکیم اکبر حسین کی بڑی شہرت تھی۔ تجربہ کار ہونے کے علاوہ بڑے خلیق انسان بھی تھے۔ اپنے ہر مریض کے ساتھ بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے۔ صدردین نے جب انہیں اپنے بیٹے کی کیفیت بتائی تو وہ جس حالت میں نیچے آئے تھے، اسی میں صدردین کے یہاں جانے پر آمادہ ہو گئے۔ انہوں نے سٹیتھوسکوپ لگا کر ہدایت اللہ کی پیٹھ ٹھونکی بجائی اور یہ کہہ کر سیڑھیوں کی طرف جانے لگے:

"ذرا ٹھہر کر دوا لے جانا۔"

صدردین اُن سے پوچھنا چاہتا تھا کہ میرا ہدایت اللہ جلد ہی ٹھیک ہو جائے گا نا۔ مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا اور حکیم صاحب چلے گئے۔

ڈیڑھ ماہ تک ہدایت اللہ کی چارپائی کوٹھے سے نچلی منزل اور نچلی منزل سے گھر کے دروازے کے باہر گردش کرتی رہی۔ وہ سُوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ صدردین نے جو کچھ جمع کیا تھا، دواؤں پر خرچ کر دیا۔ مگر ہدایت اللہ کی چارپائی اس مرحلے پر پہنچ گئی جب چار آدمی اُسے اپنے کندھوں پر اٹھا کر "وادیِ خاموشاں" کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔

بیٹے کے چلے جانے کے بعد صدردین کے سارے خواب مایوسیوں کے دھوئیں میں تحلیل ہو گئے۔ اُس کے چہرے کی لکیریں بڑی گہری ہو گئیں۔ بہت کم بولتا تھا۔ سر نیہوڑائے [illegible] پر بکھرے ہوئے چمڑے کے ٹکڑوں کو تکتا رہتا تھا۔ اس [illegible]

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

باقی نہیں رہا تھا۔ اب وہ اپنے پہلے معمول کے مطابق صبح سویرے اُٹھ کر حقہ تازہ نہیں کرتا تھا۔ بیوی خود ناشتہ لے آتی تو کچھ نہ کچھ پیٹ میں ڈال لیتا ورنہ بیٹھا رہتا۔

اُس دن دینو دوپہر ہی کو دکان پر آ گیا اور بولا:

"صدرے! جو گیا وہ گیا۔ لوٹ کر نہیں آئے گا۔" اور وہ گا کر بولا "اِک دن اساں وی ٹر جانا۔"

اور اُس نے دکان کے اندر بیٹھ کر اپنی گنجی بانہہ گھڑے کے اندر ڈال کر اور دوسرے ہاتھ سے گھڑا بجاتے ہوئے اپنی پُرسوز آواز میں گایا ؂

چنتا فکر اندیشے آون ہتھ بنھ صفاں قطاراں
وس نہیں کجھ چلدا میرا قسمت ہتھ مہاراں

تو صدر دین کے آنسو بہنے لگے اور اُس کا سر جھکتے جھکتے پتھر کی اُس سِل سے جا لگا جس پر وہ اپنے اوزار تیز کیا کرتا تھا۔

وقت کے سمندر میں لہروں کے قطرے بڑی تیزی سے گرتے رہے اور سورج کی گرمی سے بھاپ اُٹھتی رہی۔ بادل بنتے گئے۔ برستے رہے۔ درختوں اور پودوں سے گرد و غبار اُڑ گیا۔ گلیوں اور بازاروں کے چہرے نکھر گئے۔ دھوپ میں مایارام کے کبوتر چھتری سے اُڑ کر دور جانے لگتے تو صدر دین انہیں ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کی کوشش کرتا۔ شاید وہ سوچتا شام کو کبوتر واپس آ جائیں گے مگر ہدایت اللہ.....

اِن لمحوں میں دینو کی آواز اُس کے دل میں اُتر جاتی۔

"صدرے! جو گیا وہ گیا۔ لوٹ کر نہیں آئے گا۔" اور اُس کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے ہونٹوں سے تھم تھم کر آواز نکلتی تھی ؂

وس نہیں کجھ میرا چلدا قسمت ہتھ مہاراں

ہدایتے دی ماں کو دینو کبھی پسند آیا تھا نہ اُس کا گھڑا۔ لیکن اِن دنوں جب وہ گاتا تو وہ دروازے کے پاس آ بیٹھتی اور روتی رہتی۔

کئی مہینوں کے بعد صدر دین نے فضا میں چمکتی ہوئی دھوپ دیکھی۔ اس دھوپ

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ں مایارام کے کبوتروں کے پَر پھڑپھڑاتے ہوئے دیکھے اور اُس نے پھر صبح سویرے اُٹھ کر
قہ تازہ کرنا شروع کر دیا۔

ہدایتے دی ماں پیالہ لے کر آتی تو وہ کہتا :

''ہدایتے دی ماں :''

ہدایتے دی ماں رُک جاتی۔

''کیا ہے ؟''

''کچھ نہیں ہدایتے دی ماں۔ کچھ نہیں'' اور وہ کلیجے کے پھُولے ہوئے ٹکڑے ایک
ب کر کے حلق سے اُتارنے لگتا۔

صدر دین آہستہ آہستہ سنبھل گیا۔ مگر پھر اُس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔ اُس کا بھائی شیرا
ئی روز سے دکان میں نہیں آرہا تھا۔

ایک شام مَیں نے اُس سے پوچھا :

''چاچا! شیرا کیوں نہیں آتا ؟''

اُس نے میری طرف دیکھا اور بولا :

''پُتر! اب شیرا دکان میں نہیں آئے گا۔ ہائے اوئے اللہ۔ میرا باجو ٹوٹ گیا''۔
اُس وقت مجھے پتہ چلا کہ صدر دین کا بازو ابھی ٹوٹا نہیں تھا۔ لیکن ٹوٹنے ہی والا تھا۔
ر وہ ٹوٹ گیا۔ شیرا مر گیا۔

انہی دنوں صدر دین کے مکان کو آگ لگ گئی۔ اور کافی سامان جل کر راکھ ہو گیا۔
کوئی اس سے از راہِ ہمدردی کہتا :

''صدر دین بڑا نقصان ہوا ہے''

وہ آہ بھر کر کہتا ''قسمت ہتھ مہاراں''

جب وہ مایارام کے اُڑتے ہوئے کبوتروں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا تو مجھے محسوس ہوتا،
ہے وہ خود بھی ایک کبوتر ہے، جس کے پَر زخمی ہو چکے ہیں مگر وہ برابر پرواز کر رہا ہے۔
اور ایک دن ہدایتے دی ماں نے مجھے بلایا۔ مَیں اُس کے یہاں گیا تو بولی :

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"وسے دلا دوا۔"

"جی چاچی۔"

"میں نے رات سپنے میں ہدایت اللہ کو دیکھا ہے۔ کہتا ہے۔" بے بے!

"اچھا چاچی۔"

"اس نے میرا دوپٹہ پکڑ لیا ہے۔ جیسے جب بچہ تھا تو کسی شے کے لیے ضد کرتے ہوئے میرا دوپٹہ گھسیٹنے لگتا تھا۔ میں جان گئی ہوں وہ مجھے بلا رہا ہے۔ میرے بابجوں اُداس ہو گیا ہے۔"

میں پنجاب پبلک لائبریری سے لائی ہوئی کتابیں صندوق کے اوپر رکھنے ہی والا تھا کہ پرلے کمرے سے ہنسی کی دبی دبی آواز سنائی دی۔ کتابیں رکھ کر اُدھر جھانکا تو دیکھا کہ محلے کی کئی عورتیں امی کے ارد گرد بیٹھی کسی بڑے دلچسپ موضوع پر گفتگو کر رہی ہیں۔ میں اندر چلا گیا۔ ماسی حساں کہہ رہی تھی:

"توبہ میری کہنے لگی۔ بہن دوسرے تیسرے دن پھیرا رکھنا۔ میں نے کہا۔ ہدایتے دی ماں! کوئی فکر نہ کر۔ تیرا صدرا کوئی بچہ نہیں ہے۔ اس پر بولی۔ نہ بہن یہ نہ کہو۔ بچوں سے بتر ہے۔ وہ اسے بڑا خراب کرتا ہے۔ میں نے کہا کون ہے وہ ہدایتے دی ماں۔ کہنے لگی "وہ جس کی ایک بانہہ لنگڑی ہے۔"

اِس فقرے پر جو ہنسی چھوٹی تو ختم ہوتے ہی میں نہیں آتی تھی۔

"کہنے لگی۔ جس کی ایک بانہہ لنگڑی ہے۔" عنایت قلعی گر کی بیوی خورشیداں بولی۔ "اور کیا مجھے بڑی ہنسی آئی پر میں نے ضبط کر لیا۔"

ماسی حساں نے بات ختم کی تو عزیز بڑھئی کی بیوہ بہن بولی:

"صبح ہی صبح میرے گھر آ گئی۔ میں نے کہا۔ ہدایتے دی ماں چائے لاؤں۔ کہنے لگی۔ چائے پھر لانا۔ پہلے سُن لو۔ میں جا رہی ہوں۔ اپنے چاچے صدرے کا خیال رکھنا۔ میں نے کہا۔ خیر مانگو چاچی۔ کیوں بُرے لفظ منہ سے نکالتی ہو۔ اور وہ یہ کہہ کر چلی گئی۔

بڑا دلچسپ موضوع تھا۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

"میرا خیال ہے ولادر کی ماں! وہ اِدھر بھی آئے گی" علی وثیقہ نویس کی بیوی بولی۔
عجیب بات تھی۔ مجھے بھی یقین ہو گیا کہ ہدایتے دی ماں اِدھر ضرور آئے گی اور وہ تھوڑی دیر بعد پہنچ ہی گئی۔
اُس کی عادت تھی کہ جب آدھی سیڑھیاں طے کر لیتی تھی تو آواز دیتی تھی۔
"نی وزیراں! گھر پر ہو"۔
والدہ اُسے اُوپر بلا لیتی۔ اس دن بھی یہی ہوا۔ والدہ نے آواز سُن کر اُسے اُوپر بلا لیا۔ ہدایتے دی ماں آگئی۔ سانس پھُولی ہوئی اور ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکتے ہوئے:
"نی وزیراں"
"جی ماسی"
"میں جا رہی ہوں"۔ وہ چوکی پر بیٹھ کر بولی۔
خورشیداں کا چہرہ شرارت سے دمک اٹھا "کہاں جاؤ گی جاچی، راولپنڈی یا ملتان میں"؟
"دفع ہو۔ پنڈی ملتان کیوں جاؤں گی" ہدایتے دی ماں نے ناگواری سے کہا۔
"تو کہاں جانے کا ارادہ ہے" ماسی جناں نے پُوچھا۔
"وہاں جاؤں گی جہاں میرا باؤ ہدایت اللہ ہے۔ اُس نے مجھے بُلایا ہے ناں۔ ماں یا بھول اُداس جو ہو گیا ہے"۔
سب کے چہروں پر شرارت کی سُرخی پھیلی ہوئی تھی مگر ہدایتے دی ماں بڑی سنجیدہ تھی۔ اُس کے چہرے پر مکمل سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔
"نہ جا جاچی! ہمیں چھوڑ کر نہ جا" خورشیداں نے اپنی طرف سے منت سماجت کی۔
"نی خورشیداں! کیا کہہ رہی ہے تو۔ پتّر بُلائے اور ماں نہ جائے۔ میں تو جاؤں گی" ہدایتے دی ماں نے غصّے سے کہا۔
"کب جائے گی" خورشیداں نے پُوچھا۔
"اللہ جانے کب جاؤں گی۔ چلی ہی جاؤں گی" اور یہ الفاظ کہتے ہوئے وہ اُٹھ بیٹھی۔

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"اپنے صدرے کا خیال رکھنا۔" اور وہ کچھ اور کہے بغیر تیزی سے نیچے اتر گئی۔

کئی روز یہ حالت رہی کہ جب بھی کہیں دو عورتیں ملتی تھیں، تو ایک ضرور کہتی تھی:

"اپنے صدرے کا خیال رکھنا۔"

اور دوسری جواب دیتی:

"تم بھی خیال رکھنا۔ مدایتے دی ماں نے کہا ہے۔"

اس کے ایک ہفتہ یا دس روز بعد مدایتے دی ماں کہیں بھی دکھائی نہ دی اور ایک دوپہر فضا میں ایک ایسی خبر پھیل گئی کہ ہر عورت دوسری سے کہہ رہی تھی: "تُو نے سنا ہے؟"

"مَیں نے بھی سُنا ہے۔ پر یہ سچ ہے؟"

کسی کو بھی اِس خبر کی صداقت پر یقین نہیں آتا تھا۔

صدر دین نے بیوی کی موت کے بعد مکان کا اُوپر کا حصّہ کرائے پر اٹھا دیا۔ اُسے شب بسری کے لیے تھوڑی سی جگہ درکار تھی۔ اور مکان کا نچلا حصّہ اُس کی یہ ضرورت بآسانی پُوری کر سکتا تھا۔ وہ دن بھر دکان پر رہتا تھا۔ مگر اب اُس میں کام کرنے کا وہ پہلا سا ولولہ، پہلا سا انشاط کار باقی نہیں رہا تھا۔ تھوڑا سا کام کرتا اور پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتا۔ اس وقت اُس کی افسردگی دیکھ کر بیّں کانپ اُٹھتا تھا۔ کوئی شخص دکان کے قریب سے گزرتا اور اُسے اِس حالت میں دیکھتا تو اُسے زور سے آواز دیتا "صدرُ سے!"

یہ آواز سُن کر صدر دین چونک پڑتا اور اِدھر اُدھر یا تھمادنے لگتا جیسے کام کر رہا ہو۔

وہ اُکھڑی اُکھڑی باتیں کرتا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ جادۂ حیات پر چلتے چلتے اُس کے پاؤں ڈگمگانے لگے ہیں۔ اس میں آگے بڑھنے کی توانائی ختم ہو چکی ہے یا بہت جلد ختم ہونے والی ہے۔ لیکن جیسے ہی آسمان کے مغربی اُفق پر یک بیک کئی چراغ جھلملا اُٹھتے اور مایارام کے کبوتر واپس گھر کی طرف آنے لگتے۔ صدر دین کے اندر زندگی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی۔ جس طرح ایک بجھے ہوئے دیے میں تیل ڈالنے سے اُس کی لو تیز ہو جاتی ہے۔ یہی وہ وقت ہوتا تھا، جب ذرا دُور سے دینو کی آواز آتی تھی:

"صدرے سے!"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

صدر دین دکان بند کر دیتا اور اس ملحقہ چار دیواری میں چلا جاتا۔ جہاں ایک طرف اُس
ریائی پڑی ہوتی اور اُس کے نزدیک دروازے کی دوسری جانب چمڑے کے بے کار
ں کا کنستر دکھائی دیتا۔ اب اس کنستر میں کبھی اضافہ نہیں ہوتا تھا۔ مگر بے سو کھ کر سخت
ے تھے۔

اُس وقت اُس چھوٹے سے کمرے میں تین زندگیاں دھڑکنے لگتیں۔ تین آوازیں
جنے لگتیں۔

دو آوازیں تو انسانوں کی ہوتیں اور تیسری آواز ایک بے جان شے کی ہوتی۔ لیکن
بے جان شے کی آواز دو انسانوں کی توانائی کا سرچشمہ بن جاتی۔

صدر دین کی دنیا میں گہرے اندھیرے اُمنڈ آتے تھے مگر ابھی ان اندھیروں کے
پر ایک روشن کرن جگمگا رہی تھی اور اُس کے دل میں آشا کی جوت جگا رہی تھی۔ ابھی
زندگی سے پیار تھا۔ ابھی وہ تاریک بادلوں کے سامنے اپنے دونوں بازو پھیلائے
ں آگے بڑھنے سے روک رہا تھا۔

دینو پہلے کچھ باتیں کرتا۔ دن بھر کے واقعات سناتا، اپنے دوست سے اُس کی
سنتا اور پھر اُس کی ننھی بانہہ گھڑے کے اندر چلی جاتی اور اُس کی آواز صدر دین کے
ں گہرائیوں میں اُترنے لگتی۔

اُس کے سینے میں کوئی شے چبھتی تو سر اُٹھا کر کہتا:

"یا نبے با ذہدایت اللہ"

دل میں پھانس سی ہوتی تو پکارتا:

"نی ہدایتے دی ماں"

اور دینو کہتا ہے

جیناں نگر اندیشے آون بنھ بنھ صفاں قطاراں

وس نہیں کجھ چلدا میرا قسمت ہتھ مہاراں

دینو تھک کر گھڑا الگ رکھ دیتا۔ پھر دونوں خاموش ہو جاتے اور یہ خاموشی

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

دیر تک قائم رہتی۔

صدرالدین ہر جمعرات کو شام کے وقت ایک تھیلے میں میٹھے چنے، ریوڑیاں اور کچھ لڈو ڈال کر دکان کے سامنے جا بیٹھتا۔ بچے شور مچاتے ہوئے، بھاگتے ہوئے اُس کی طرف آجاتے۔ بچوں کے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں وہ کچھ چنے، کچھ ریوڑیاں اور لڈو کا ایک آدھ ٹکڑا رکھ دیتا۔ جو بچہ اپنا حصّہ وصول کر لیتا وہ بھاگ جاتا۔ صدرالدین غور سے اُسے دیکھتا۔ شاید اِس موقعے پر اُسے یاد آ جاتا کہ "بادِ ہدایت اللہ" بھی جب کہیں سے یہ آواز سُنتا تھا: "بالو کڑیو ونڈی دے پیسے لے جاوو"۔ تو روٹی چھوڑ کر بھاگ اُٹھتا تھا۔

اُس کے ہاتھ حرکت کرنا چھوڑ دیتے اور اِس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ بچے اس کے ہاتھ سے تھیلا لے کر کہیں سے کہیں پہنچ جاتے۔ تھوڑی دیر بعد اُسے پھٹا ہوا خالی تھیلا ہی ملتا۔ ہر جمعرات کی صبح کو وہ معراج الدین درزی سے نیا تھیلا سِلوا لیتا۔ معراج الدین کہتا:

"چاچا! تُو بہت تنگ کرتا ہے"۔

صدرالدین جواب دیتا "یار! ان کمبختوں نے بڑا ستایا ہے۔ میں ان کی ہڈیاں توڑ دوں گا"۔ مگر ہر بار بچے چھینا جھپٹی میں تھیلا پھاڑ دیتے۔ اور صدرالدین خجل سا رہ جاتا۔

اُن دنوں بھی صبح و شام آسمان کے مشرقی اور مغربی اُفق شفق سے جھلملاتے رہتے تھے مگر اُن کی سُرخی ماند پڑ چکی تھی۔ کیونکہ فضا میں جہاں تہاں جلے ہوئے مکانوں کے در و دیوار سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے اور ان سے چراغاں کا سماں بندھ گیا تھا۔

آگ اور دھواں ـــ اِن کے سوا اُوپر کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ مایا رام کے کبوتر بے آسرا اور بے سہارا رہ گئے تھے۔ کیونکہ مایا رام انہیں چھوڑ کر لاہور کی حدود سے دُور جا چُکا تھا۔

یہ کبوتر اب اُڑتے نہیں تھے۔ چھتری اور منڈیروں پر بیٹھے سہمی ہوئی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے رہتے تھے۔

یہ فسادات کا دَور تھا۔ یہ اگست ۱۹۴۷ء کے ابتدائی دن تھے۔ یہ برِصغیر کی تقسیم کا زمانہ تھا۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ہر روز کرفیو لگتا تھا۔ پھر بھی دینو دوسرے تیسرے دن صدر دین کے پاس آجاتا
- اپنے بھائی اور بھابی کے روکنے کے باوجود۔ اور جب آجاتا تھا تو ساری رات،
ردین کے ہاں ہی گزار دیتا تھا۔

صدر دین لگاتار صدموں سے نڈھال ہو گیا تھا۔ آخری صدمہ اسے اپنی ماں کی
کے خط سے پہنچا تھا۔ اُس کی بوڑھی ماں لاہور سے ساٹھ ستر میل دور ایک گاؤں
ہتی تھی۔ اور صدر دین کو معلوم تھا کہ وہ صبح سویرے اُٹھتے ہی جھولی پھیلا کر اُس
لیے دُعائے خیر مانگا کرتی تھی۔ اب یہ دُعائے خیر مانگنے والی دنیا سے چلی گئی تھی
دردین اُس کا آخری دیدار بھی نہیں کر سکا تھا۔

اُس کے چاروں طرف اندھیرے پھیل چکے تھے۔ اِن اندھیروں میں صرف ایک
چمک رہا تھا اور یہ جگنو تھا "دینو" جس کے لیے وہ ہر روز سراپا انتظار رہتا تھا اور
ی آہٹ اور آواز پر اُس کے کان لگے رہتے تھے۔

اُس روز میں صبح کے وقت دودھ لینے کے لیے ڈول ہاتھ میں لے کر موسے گجر
ف جا رہا تھا کہ چوک میں کئی آدمیوں کو ایک طرف جاتے ہوئے پایا۔ میں نے
رخ اُس جانب پھیر لیا۔ چند قدم چلنے کے بعد میں نے دیکھا کہ صدر دین کی دکان
چھ فاصلے پر، دائی مرادو کی بیری کی سمت، معراج الدین درزی کی دیوار تلے کوئی
ی زمین پر پڑا ہے۔ پاس گیا تو دیکھا کہ — یہ دینو ہے۔ خون میں لت پت۔ اُس
ڑے کے ٹکڑے اُس کے قریب بکھرے پڑے تھے۔

موت کا تصور اُس زمانے میں اپنی اہمیت کھو چکا تھا۔

لوگ کسی نعش کو دیکھتے تھے اور چند لمحے اُسے دیکھنے کے بعد آگے نکل جاتے
جیسے یہ کوئی عام حادثہ ہے اور ہوتا ہی رہتا ہے۔

کسی نے بھی صدر دین کو اُس کے عزیز ترین دوست کی موت کی خبر نہ سُنائی۔ شاید
نے اپنے دل میں سوچا ہوگا: "میں یہ کیا خبر سناؤں کوئی دوسرا سُنا دے گا۔" اور
ین جو کئی دن سے سخت بیمار تھا دینو کا انتظار کرتا رہا۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

اُس دن میں نے سوچا صدر دین کے پاس جا کر معلوم کروں کہ اُس کے دل پر کیا بیتی ہے کہ میری آہٹ سُن کر بولا، "کون ہے"؟

میں نے کہا، "دلاور"

"یار! دینو نہیں آیا ہے۔ کیا ہُوا اُسے"؟

پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا کہ میں خاموش رہا۔ اُسے دینو کی موت کی خبر نہ سُنا سکا۔ ممکن ہے۔ اُس وقت میں نے یہ سوچا ہو کہ صدر دین کی زندگی کا آخری وقت آ گیا ہے، کیوں اسے دھچکا پہنچاؤں۔

اور میں تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا گیا۔

شام گہری ہو چکی تھی۔ میں کسی کام کے لیے باہر جا رہا تھا۔ دیکھا کہ صدر دین ہاتھ میں لاٹھی لیے اُس کے سہارے چلا جا رہا ہے۔

"کہاں چلے چاچا؟" میں نے پوچھا۔

"دینو نہیں آیا۔"

"چاچا! دینو نہیں آئے گا"، مگر اُس نے میری آواز نہیں سُنی۔ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا رہا۔ اور اُس جگہ پہنچ گیا جہاں چند روز پہلے دینو کی خون آلود نعش پڑی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اُس کے قدم رُک گئے ہیں اور اُس کے ہونٹ لرزنے لگے ہیں۔

پھر وہ وہیں بیٹھ گیا اور نہ جانے کب تک بیٹھا رہا۔ کون اُسے واپس لایا میں نہیں جانتا۔ کیونکہ میں اُسے چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ بہرحال یہ اُس کی آخری رات تھی!

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

میاں دین محمّد

ابھی فضاؤں میں تاریکی اور اُجالا گلے مل کر ایک دوسرے سے رخصت نہیں ہوئے تھے۔ صبح کی اذان میں کچھ دیر باقی تھی۔ لوگ نیم خوابی اور نیم بیداری کی حالت میں بستروں پر کروٹیں لے رہے تھے۔ سو جانا چاہتے تھے مگر گرمی کی وجہ سے نیند آنکھوں میں آتی نہیں تھی اور جاگنے کا ارادہ کرتے تھے لیکن غنودگی نے سُست اور کاہل بنا دیا تھا۔ البتہ چوک ڈپٹی دتّا کی گلی مغلاں میں ایک مکان ایسا بھی تھا جس کا مکین جاگ رہا تھا۔ یہ مکان میاں دین محمدؒ کا تھا۔

میاں صاحب معمول کے مطابق اپنا بستر لپیٹ رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ "یا رب کل عالم و اصلاؒ" کی دُعا بھی ان کی زبان سے جاری تھی۔

میاں دین محمدؒ کو سارے محلے والے چاچا جی یا بابا جی کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ بڑی باقاعدگی سے زندگی گزارنے کے عادی تھے۔ جو فرائض شب و روز کے لیے متعین کر لیے تھے، اُن پر سختی کے ساتھ کاربند تھے۔ بستر لپیٹ کر کوٹھڑی کے آخری گوشے میں بچھے ہوئے پلنگ کی پائنتی پر رکھنا، دُعا کے ذریعے دوسروں کا بھلا چاہنا، تانبے کے گھڑے سے لوٹا بھرنا، گھڑے کے قریب پیڑھی بچھا کر اس پر بیٹھنا اور وضو کرنا ان کا صبح سویرے کا معمول تھا۔ ان کاموں کی انجام دہی میں وہ اپنی بیماری کا بھی خیال نہیں کرتے تھے۔ وضو کرنے کے بعد دالان میں کھڑے ہو کر اوپر دیکھتے تھے۔ فضا کی کیفیت سے فوراً اندازہ لگا لیتے تھے کہ مسجد میں جانے کا وقت ہو گیا ہے یا نہیں۔ اس معاملے میں انہوں نے کبھی اپنی واسکٹ

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

یں رکھی ہوئی گھڑی دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ عام طور پر وہ اسی وقت کمرے کے اندر جاکر دیوار کے ساتھ لگے ہوئے بید کے ڈنڈے کو ہاتھ میں پکڑ لیتے تھے اور بیرونی دروازے کے دونوں پٹ بند کرکے اور ان کے درمیان میں سے دایاں ہاتھ اندر ڈال کر کنڈی لگا دیتے تھے۔ باہر کی کنڈی انہوں نے کبھی نہیں لگائی تھی، حالانکہ سب کو اس بات کا علم تھا کہ میاں صاحب گھر میں نہ ہوں جب بھی دروازہ اندر ہی سے بند ہوتا ہے۔

دروازہ بند کرنے کے بعد وہ گلی میں سے گزرتے ہوئے دائیں بائیں نہیں دیکھتے تھے۔ آنکھیں جھکائے چلتے رہتے تھے اور ان کی آواز فضا میں ذرا ذرا وقفے کے بعد گونجتی رہتی تھی اور وہ کہتے رہتے تھے ؎

دلا غافل نہ ہو یک دم کہ دنیا چھوڑ جانا ہے

یہ اُس نغمہ کا پہلا مصرع تھا جسے اللہ کے ایک نیک بندے نے سینکڑوں کی تعداد میں چھپوا کر طاعون کے دنوں میں محلے کے در و دیوار پر جا بجا چسپاں کرا دیا تھا۔ ان دنوں جب طاعون کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ اس نظم کو پڑھتے تھے اور کانپ کانپ جاتے تھے۔ لیکن کچھ مدت گزرنے پر جب وبا ختم ہو گئی اور لوگ پہلی سی دلچسپی کے ساتھ اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے تو اس نظم کے ورق غائب ہونے لگے یا پھاڑ دیئے گئے۔ کہیں کہیں کچھ شعر نظر آ جاتے تھے تو ان کا کچھ اثر نہیں ہوتا تھا۔ لوگ انہیں پڑھتے تھے اور ایک دو لمحے رُک کر آگے چلے جاتے تھے مگر میاں دین محمد نے اس کے پہلے مصرع کو مسجد کی طرف جاتے ہوئے روزانہ دہرانا اپنا وظیفہ بنا لیا تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ وہ لوگوں کو موت کی یاد دلا کر کوئی نیکی کا کام کر رہے ہیں۔

وہ چھوٹی مسجد میں نماز پڑھتے تھے اور سب سے پہلے اس کے اندر جاتے تھے۔ چاندنی رات ہوتی تو مسجد کا دیا جلانے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ ورنہ مسجد کے اندر جا کر وہ سب سے پہلا کام یہی کرتے تھے کہ مولوی صاحب کے حجرے کی دیوار کے ساتھ ایک چبوترے کے اوپر مٹی کے اس بڑے دیئے کو جلا دیتے تھے جس میں ہر شام محلے کا کوئی نہ کوئی شخص تیل ڈالا دیتا تھا اور اگر [illegible]

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

مٹی کے لوٹے میں ڈال دیا جاتا تھا۔

میاں صاحب دیا جلا کر مولوی صاحب کے دروازے پر دستک دیتے اندر سے "ہُوں" کی آواز آتی تو مصلّے پر بیٹھ جاتے اور نماز پڑھ کر دن چڑھے مسجد سے باہر آتے۔ میاں صاحب کے آباؤ اجداد وادیٔ کشمیر کے ایک گاؤں سے نکل کر لاہور شہر میں آباد ہوئے تھے اور میاں صاحب کو اس مکان میں رہتے ہوئے کم و بیش پچاس برس گزر چکے تھے۔ ان کی عمر ستّر سے کچھ کم تھی مگر صحت بہت اچھی تھی۔ میلوں پیدل چل کر بھی ذرا سی تھکاوٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔ دُبلے پتلے آدمی تھے۔ قد کافی لمبا تھا اور چہرے پر جو چیز سب سے نمایاں تھی وہ ان کی لمبی ناک تھی۔ گال بالوں سے محروم تھے۔ ہاں ٹھوڑی پر انگلی بھر ڈاڑھی نے ان کے لمبوترے چہرے کو اور لمبوترا کر دیا تھا۔ ان کا کنبہ مختصر تھا۔ بیوی کو فوت ہوئے کئی برس بیت گئے تھے۔ دو لڑکے تھے جو ان کے پاس نہیں رہتے تھے۔ ان کے علاوہ ایک بیوہ بہن بھی تھی۔ ہر روز صبح و شام چائے اور کھانا بڑے لڑکے کے گھر سے آجاتا تھا اور وہ اپنی تنخواہ کا ایک معقول حصہ اپنی بڑی بہو کو دے دیتے تھے۔ خود ایک چھاپہ خانے میں ملازم تھے۔ اپنی ملازمت کا آغاز انہوں نے اسی چھاپہ خانہ میں کیا تھا اور ترقی کرتے کرتے چھوٹے مینیجر بن گئے تھے۔ چھاپہ خانے کے مالک کو اُن کی ذات پر بڑا اعتماد تھا۔ اور عام خیال یہی تھا کہ جب بڑا مینیجر رخصت ہوگا تو اس کے فرائض میاں صاحب ہی کے سپرد کئے جائیں گے۔

اگرچہ میاں صاحب کو تنہائی پریشان نہیں کرتی تھی، تاہم کبھی کبھی زندگی کی یکسانیت سے قدرے گھبرا جاتے تھے اور ان لمحوں میں بالعموم اپنے پرانے دوست حسین بخش کے یہاں چلے جاتے تھے اور کچھ وقت گزار کر واپس آجاتے تھے۔ حسین بخش کی صدر دین مرچی کے مکان کے قریب ہی کریانے کی دکان تھی جس میں وہ دن کا بیشتر حصہ گزارتا تھا۔

میاں صاحب گلی میں سے چلے جا رہے تھے۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ کسی گھر سے بھی روشنی نہیں نکل رہی تھی۔ ان کے بید کی ٹھک ٹھک ہو رہی تھی اور ساتھ ہی ان کے ہونٹوں سے وہی مصرع نکل رہا تھا۔ اُس صبح شاید وہ جذبہ جو آج کے دل کو [illegible] اور ہونٹوں

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

کو جنبش دیتا تھا۔ پہلے کی بہ نسبت شدید ہو گیا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ ان کی آواز ہر گھر میں گونج اُٹھے اور ہر شخص اس مصرع کو سُن کر عبرت حاصل کرے۔

کچھ دنوں سے انہیں اپنی تنہائی کا احساس ستانے لگا تھا اور انہوں نے غیر شعوری طور پر اس احساس کو عبرت آموزی کے جذبے میں منتقل کر دیا تھا۔ مسجد میں جاکر انہوں نے چراغ روشن کیا، مولوی صاحب کو جگایا۔ نمازیوں کے آجانے پر خضوع و خشوع سے نماز پڑھی اور فارغ ہونے کے بعد اس وقت تک قرآن مجید کی تلاوت کرتے رہے۔ جب تک سورج نے طلوع ہو کر ہر جگہ اپنی کرنیں نہ پہنچا دیں۔

جس وقت وہ باہر نکلے چمکتی ہوئی دھوپ جہاں تہاں پھیل چکی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہے تھے، لیکن جب جانے کے ٹھنڈے ہونے کا خیال آیا تو وہ تیزی سے گھر کو جانے لگے۔ چوک میں سے گزر رہے تھے کہ دائیں جانب سے افضل اور اس کی نو بیاہتا بیوی کو آتے ہوئے دیکھا۔ افضل کی شادی سات آٹھ ماہ پیشتر ہوئی تھی۔ دُلہن جس انداز سے شرما کر چادر کو اپنے پیٹ پر پھیلانے کی کوشش کر رہی تھی اس سے معلوم ہوتا تھا کہ میاں بیوی دائی مرادو کے گھر سے واپس آ رہے ہیں۔ میاں دین محمد کو افضل دیکھ کر ٹھہر گیا۔

افضل نے زور سے سلام علیکم کہا اور اس کی دُلہن کے صرف ہونٹ ہل کر رہ گئے۔

جیتے رہو، سیر کر کے آ رہے ہو؟

"جی نہیں، ذرا ادھر گئے تھے۔" افضل نے دائی مرادو کی بیری طرف جانے والے راستے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا، اچھا، اللہ فضل کرے گا۔" میاں صاحب نے مُسکرا کر کہا اور جانے لگے۔

"چاچا جی"، افضل ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔

"کیوں برخوردار؟" میاں صاحب نے استفسار کیا۔

"چاچا جی، آپ صبح ہی صبح ایسا واہیات شعر کیوں سُناتے ہیں لوگوں کو؟" میاں صاحب کو توقع نہیں تھی کہ کبھی اس اس قسم کا سوال بھی اُن سے کیا جائے گا، وہ تو اپنی طرف سے بھلی منہ کا بھلا کر رہے تھے۔ انہوں نے افضل کو حیرت سے دیکھا اور خاموش رہے۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"مرنا برحق، پر آپ یہ منحوس، شعر کیوں سُناتے ہیں؟"

میاں صاحب نے غصہ ضبط کیا اور بظاہر خوش دلی سے کہا: "بیٹا افضل! لوگوں کو اپنی موت یاد رہنی چاہیے تاکہ جلدی جلدی نیکی کر لیں۔"

"جلدی جلدی کیوں نیکی کر لیں؟"

"میرا مطلب ہے بیٹا، جو کام نہیں کر سکے وہ کر لیں ابھی مہلت ہے۔" میاں صاحب نے مکمل اور مدلل جواب دیا تھا، مگر افضل مطمئن نظر نہیں آتا تھا۔

"چاچا جی، ابھی تو ہماری زندگی پڑی ہے۔ اپنے ادھورے کام وہ مکمل کریں جو گور کنارے پہنچ گئے ہیں۔"

میاں صاحب نے ان الفاظ کی تلخی محسوس کی اور یہ تلخی اس لمحے بڑھ گئی جب انہوں نے دیکھا کہ افضل کی بیوی بھی مُسکرانے لگی ہے۔

"ٹھیک ہے بیٹا، ٹھیک ہے۔" میاں صاحب گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

رات کے سات بجے تک سارا وقت عام مصروفیتوں میں گزر گیا۔ وہ بھول گئے کہ صبح کے وقت کیا واقعہ ہوا تھا مگر جب چائے کی پیالی ہاتھوں میں لے کر اپنی چارپائی کے اوپر بیٹھے تو سامنے لیٹین درزی کے کوٹھے پر ایک نوجوان لڑکی کو گوٹے کناری والے کپڑوں میں ملبوس دیکھ کر انہیں افضل کی بنی ٹھنی دُلہن کا خیال آگیا اور اس کے ساتھ ہی افضل کے الفاظ اُن کے کانوں میں گونجنے لگے۔

"اپنے ادھورے کام وہ مکمل کریں جو گور کنارے پہنچ گئے ہیں۔" اس لڑکے نے میرا مذاق اڑایا ہے۔ ہم جب نوجوان تھے تو اپنے بزرگوں کا کتنا ادب اور احترام کرتے تھے اور یہ ہیں آج کل کے چھوکرے۔ میاں صاحب کے منہ میں چائے کا گھونٹ کڑوا ہو گیا اور انہوں نے اسے جلدی سے نیچے اُتار لیا۔

افضل کو وہ بچپن سے جانتے تھے۔ اس کے والدین بڑے غریب تھے۔ باپ قصاب تھا اور لوہاری منڈی میں اس کی ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ گھر کے اخراجات مشکل سے پورے ہوتے تھے۔ ہاں بڑی عید کے موقع پر کچھ خوشحالی اپنی جھلک دکھا دیتی

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

تھی۔ افضل صرف تیسری جماعت تک پڑھ سکا۔ اس کے بعد باپ نے سکول سے اٹھا کر دکان پر بٹھا دیا۔ اتفاق سے اس کا چچا کافی دولت مند آدمی تھا۔ شال دوشالے بیچنے کا کاروبار کرتا تھا۔ لاولد تھا اس لیے اس نے افضل کو بیٹا بنا لیا تھا۔ افضل کی خوش قسمتی کہ یہ چچا ایک حادثے میں مر گیا اور اس کی نصف سے زائد جائداد اس کے قبضے میں آگئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی حالت بدل گئی۔ اب وہ رئیسانہ انداز سے رہتا تھا۔ دکان پر بیٹھنا اپنی توہین سمجھتا تھا۔ اس کی بجائے گاؤں سے جانور لا کر بھاٹی دروازے کے باہر بکرا منڈی میں اچھے داموں فروخت کر دیتا تھا۔ میاں صاحب کو اس کی زندگی کا یہ نشیب و فراز خوب اچھی طرح معلوم تھا۔ مگر اس کے ساتھ وہ اس کے کردار کے ایک خاص پہلو سے بھی واقف تھے۔ افضل کی منگنی غربت کے زمانے میں اپنے رشتے کے ہمساموں کی لڑکی سے ہو چکی تھی۔ اور جب اس کے پاس اچھی خاصی دولت آگئی اور اس کا اپنا کاروبار بھی چل نکلا تو باپ نے یہ منگنی توڑ دینی چاہی مگر افضل نہ مانا۔ افضل کے باپ نے میاں صاحب سے کہا کہ وہ اسے سمجھائیں، آپ کی بات مان لے گا۔ میاں صاحب نے اسے دنیاداری کی اونچ نیچ سمجھانے کے بعد کہا۔ برخوردار، ایسی جگہ بیاہ کرو جہاں تمہاری عزت ہو اور شان بڑھے۔" یہ الفاظ سن کر افضل نے سینہ پھلا کر کہا تھا۔

"چاچا جی! میں نے آمنہ سے وعدہ کیا تھا کہ اسی سے شادی کروں گا۔ میری شادی ہو گئی تو اسی سے ہو گی ورنہ ساری عمر کنوارا بیٹھا رہوں گا۔"

افضل کی چمکتی ہوئی آنکھیں اور اکڑا ہوا جسم میاں صاحب کو یقین دلا رہا تھا کہ کہنے والے نے جو کچھ کہا ہے پکے ارادے سے کہا ہے اور وہ اپنے ارادے کو ہرگز نہیں بدلے گا۔ اس لیے انہوں نے مزید بحث فضول سمجھی اور افضل کے باپ کو بیٹے کی نیت کا حال بتا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افضل کی شادی وہیں ہوئی جہاں وہ چاہتا تھا۔

میاں صاحب نے بعد میں افضل کی تعریف کی تھی کہ اس نے ایک غریب لڑکی سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا، لیکن صبح جو اس سے گفتگو ہوئی تھی اس سے ان کی طبیعت کافی مکدر ہو گئی تھی اور وہ ان کی نظروں میں ایک گستاخ لڑکا ثابت ہو چکا تھا۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ان کے کانوں میں پھر افضل کے الفاظ در آتے "اپنے ادھورے کام وہ مکمل کریں
گور کنارے پہنچ گئے ہیں"۔ میں گور کنارے پہنچ گیا ہوں اور یہ نوجوان ہے۔ اچھا میرے
ساتھ پیدل چل کر تو دکھاتے۔ میں اب بھی تین چار میل آسانی سے چل سکتا ہوں اور اسے
نے کبھی ایک میل بھی پیدل چلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اس پر بھی میں گور کنارے ہوں
موت اس سے بہت دور ہے۔ قصائی کا بچہ، آخری فقرے پر وہ مسکرا اٹھے۔
کوشش کے باوجود میاں صاحب کی توجہ اس موضوع سے ہٹ نہیں رہی تھی۔
وہی چہرہ، وہی گردن کا اکڑاؤ اور وہی الفاظ، ہونہہ مجھ سے کہتا ہے اپنا ادھورا کام
کرو۔ میں نے کون سا کام ادھورا چھوڑا ہے جسے اب مکمل کرنے کی ضرورت ہے
دونوں بیٹیوں کی شادی کی ہے، دل کھول کر خرچ کیا ہے۔ باقاعدہ زکوٰۃ بھی دیتا ہوں۔
آج تک کسی سے لڑائی نہیں ہوئی۔ محلے میں اور محلے سے باہر سب عزت کرتے ہیں۔
بھی، چاچا جی کہتے ہوئے لوگوں کی زبان سوکھ جاتی ہے اور یہ کہتا ہے کہ ادھورا کام
کرو۔ پر مجھے کیا۔ لعنت بھیجو اس پر، سو جانا چاہیئے، بڑی سویرے جاگنا پڑتا ہے۔ اور
میاں صاحب نے کروٹ بدل کر تکیے کو سر کے نیچے سے اٹھایا اور اسے بازوؤں میں
لپیٹ لیا۔ ان کے خیال میں نیند لانے کا یہ بھی ایک آزمودہ نسخہ تھا اور بے نیند راتوں میں
اسی پر عمل کیا کرتے تھے۔ پر نیند کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ اور وہ بغیر کسی ارادے کے اپنی بیتی
کے بارے میں سوچنے لگے۔ سب کچھ مناسب ہے۔ کہیں بھی کوئی خلا نہیں۔ کسی سے
کوئی ایسا وعدہ نہیں کیا جو کبھی نہ کبھی پورا نہیں کر دیا۔ نکاح کے وقت مولوی صاحب
نے کہا تھا۔ بیوی کے حقوق بجا لانا اور میں نے وعدہ کیا تھا کہ یہ حقوق ضرور پورے
کروں گا۔ اور وہ جنتی روح دنیا میں سدا سکھی رہی اور کیا وعدہ کیا تھا میں نے ؟
اسی لمحے میاں دین محمد کو احساس ہوا کہ دور کہیں کوئی گھنٹی بج رہی ہے ٹن۔۔
۔۔۔ ٹن۔
وہ مضطرب ہو کر پہلو بدلنے لگے۔ گھنٹی کی آواز پھر گونج اٹھی۔ ٹن۔۔۔ ٹن۔۔۔ ٹن
ٹھیکیدار صاحب کی گائے واپس اپنے گھر آ رہی ہے۔ انہوں نے خیال کیا۔ ٹھیکیدار

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

صاحب نے اپنی گائے کے گلے میں گھنٹیاں باندھ رکھی تھیں۔ جب گائے صبح چھوٹے سانڈے میں واقع ان کے کھیت کی طرف جاتی تھی تو ان گھنٹیوں کی آواز کئی منٹ تک آتی رہتی تھی اور یہی عالم شام کے وقت بھی ہوتا تھا۔ جب ٹھیکیدار کا نوکر اسے کھیت سے واپس گھر کی جانب لاتا تھا۔

"پر اب تو نو بج گئے ہوں گے، اس وقت گائے نہیں آتی۔ مغرب کی نماز سے پہلے گھر پہنچ جاتی ہے۔"

انہوں نے یہ بات کہہ کر اپنے دل کو تسلی دی کہ آج ٹھیکیدار صاحب کی گائے دیر سے آئی ہے اور یہ ٹن ٹن کی آواز اسی کی گھنٹیوں سے نکل رہی ہے۔

گھنٹہ پون گھنٹہ بعد وہ سو گئے۔ صبح وہ "دلا غافل نہ ہو یک دم کہ دنیا چھوڑ جانا ہے" دہراتے ہوئے مسجد میں چلے گئے۔ مسجد سے نکلے تو ٹھیکیدار کا نوکر گائے کو لے جا رہا تھا۔

"کل رات کو بڑی دیر سے گائے کو گھر لایا تھا۔ کیا بات تھی؟" انہوں نے نوکر سے سوال کیا۔

نوکر حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگا۔

"میں تو کل جلدی آ گیا تھا۔ پانچ چھ بجے۔" نوکر نے کہا۔

"کسی اور کی گائے ہو گی۔"

"نہیں بابا جی، محلے میں کسی اور کی گائے کی گھنٹیاں نہیں۔"

میاں صاحب نے اپنا دایاں ہاتھ یوں ہلایا جیسے کہہ رہے ہوں اب دفع بھی کر ناں اور نوکر دفع ہو گیا۔

"یونہی میرا اپنا واہمہ ہو گا اور کیا۔۔" اور وہ چند منٹ بعد کا کاجر ٹیمار والی کٹڑی میں جا کر اس سیڑھی پر چڑھ گئے جس کے آخر میں ان کا پرانا دوست حسین بخش رہتا تھا۔ اپنے اس دوست کے ہاں وہ دوسرے تیسرے دن ضرور جاتے تھے اور وہاں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گزار کر نیچے اتر آتے تھے۔ حسین بخش چھوٹے قد کا آدمی تھا۔ میاں صاحب سے اس کی کافی بے تکلفی تھی۔ ویسے تو کم گو تھا مگر میاں صاحب سے باتیں

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

کرتے ہوئے اس کی زبان رُکنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ میاں صاحب وہاں اس وجہ سے بھی جاتے تھے کہ حسین بخش کی بیوی بیگماں کشمیری چائے بڑے سلیقے سے پکاتی تھی۔ میاں صاحب کشمیری چائے کے رسیا تھے۔

سیڑھی طے کرتے ہوئے میاں صاحب، اپنا ڈنڈا دیوار پر آہستہ آہستہ مارتے رہتے تھے جس سے ٹھک ٹھک کی آواز اُوپر پہنچ جاتی تھی اور یہ آواز سُن کر حسین بخش اپنی بیوی سے کہتا تھا:

”لو آ گیا بابا ڈانگ والا۔“

بیگماں نے اپنے شوہر کی کسی بات پر کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا مگر میاں دین محمد کو ”بابا ڈانگ والا“ کہنا اسے بالکل پسند نہیں تھا۔ وہ زبان سے عام طور پر احتجاج نہیں کرتی تھی لیکن اس کی پیشانی شکن آلود ہو جاتی تھی۔ حسین بخش بیوی کو چھیڑنے کے لیے بلند آواز سے یہ لفظ دہراتا تھا تاکہ میاں صاحب بھی سُن لیں اور میاں صاحب سلام کرنے کی بجائے ”آ گیا ہے بابا ڈانگ والا“ کہہ کر ایک طرف پیڑھی پر بیٹھ جاتے تھے۔ اس دن بھی انہوں نے یہی طریق کار اختیار کیا اور بیگماں کی شکن آلود پیشانی کو دیکھ کر مُسکرانے لگے۔ انہوں نے لمبا سانس لیا اور چولہے کو دیکھا جس پر سے بیگماں چائے کی دیگچی اُتار رہی تھی۔ اُس نے کندوری ہاتھ میں لیے بغیر گرم دیگچی کو اُتار لیا تھا اور اب درد سے بے قرار ہو کر دونوں ہاتھ جھٹک رہی تھی۔

”اوّل درجے کی پاگل ہے بیگماں! ایک چھوڑ تین کندوریاں پڑی ہیں۔“ حسین بخش نے میاں صاحب کو مخاطب کر کے کہا۔

”یہ آگ سے نہیں ڈرتی حسین بخشا۔“ میاں صاحب نے کہا۔

”نہیں ڈرتی، اسی لیے بیٹھی رو رہی ہے۔“ حسین بخش نے میاں صاحب کے الفاظ سُن کر کہا۔

اِدھر بیگماں کی آنکھوں میں سچ مچ آنسو آ گئے تھے۔

”مَیں کیوں روؤں گی، روئیں میرے دشمن۔“ بیگماں نے دوپٹے سے چہرہ صاف

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

کرتے ہوئے کہا۔

میاں صاحب نے بیگماں کو دیکھا وہ اسے دیکھتے تھے تو انہیں جھٹ کوئی نہ کوئی لطیفہ یاد آجاتا تھا جس کا تعلق بیگماں سے ہوتا تھا۔ بیگماں کے بارے میں کوئی نہ کوئی لطیفہ چلتا ہی رہتا تھا۔ چند روز پہلے اس کا ایک لطیفہ کافی مشہور ہو گیا تھا۔ ہوا یوں تھا کہ بیگماں نے پچاس پچپن سال کی عمر گزارنے کے باوجود کبھی فلم نہیں دیکھی تھی۔ پچھلی جمعرات کو ٹھیکیدار کی بیوی اسے مجبور کر کے ہیرا منڈی کے سینما سٹی تھیٹر میں لے گئی۔ محلے کی دو اور عورتیں بھی ساتھ چلی گئی تھیں۔

پہلے تو جب ہیرو نے ہیروئن کا بوسہ لیا تو بیگماں نے توبہ توبہ کہتے ہوئے آنکھیں نہ صرف بند کر لیں بلکہ انہیں دوپٹے سے ڈھانپ بھی لیا۔ ٹھیکیدارنی نے بڑی مشکل سے دوپٹہ ہٹا کر اس کی آنکھیں کھلوائیں۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ موسلا دھار بارش کا منظر آ گیا۔ بیگماں بے تحاشا اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"کیا ہوا خالہ؟" ٹھیکیدارنی نے پوچھا۔

"میں کپڑے باہر ڈال آئی ہوں بھیگ جائیں گے۔" بیگماں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ اب ٹھیکیدارنی بار بار کہتی ہے، خالہ یہ فلم والی بارش ہے اصلی بارش نہیں مگر بیگماں کو تو اپنے کپڑوں کی پڑی تھی۔ گرتی پڑتی ہال سے نکل آئی۔ ٹھیکیدارنی کو بھی مجبوراً باہر آنا پڑا۔ تماشائی بیزار ہو کر طرح طرح کے آوازے کسنے لگے۔

باہر آ کر بیگماں نے دیکھا، کوئی بارش نہیں ہو رہی تھی۔ یہ واقعہ ایک ایسا لطیفہ بن گیا کہ جو بھی سنتا تھا بے اختیار ہنس دیتا تھا۔

میاں صاحب کی آنکھوں میں شرارت آمیز مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔

"بیگماں، تمہارے کپڑے سوکھے رہے کہ گیلے ہو گئے؟"

بیگماں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میاں صاحب کے چہرے کو تکتی رہی۔ اس کے برعکس اس کے شوہر نے پچھلے لطیفے بھی سنانے شروع کر دیے۔ بیگماں پر ان لطیفوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ حالانکہ وہ ان باتوں پر سیخ پا ہو جاتی تھی اور ہر شخص بھی لطیفے سنا کر

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

اس کا مذاق اُڑاتا تھا اس کے خوب لتے لیتی تھی۔

میاں صاحب نے اسے دیکھا، اس کی ناک کا کوکا جھلک رہا تھا۔ اس کا چہرہ سفید سی اور سُرخی لیے ہوئے تھا اور اس کے سیاہ بال کانوں کی لوؤں کو چھوتے ہوئے شانوں تک پہنچ گئے تھے، ان میں کڑوے تیل کی چمک دکھائی دے رہی تھی۔

پر یہ کیا، یہ سب کچھ وہ اس سے پیشتر بارہا دیکھ چکے ہیں۔ کبھی ان کی طرف ذراسی دلچسپی سے بھی نہیں دیکھا تھا۔ آخر ان میں خوبی ہی کون سی ہے لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ اُن کا جی چاہتا تھا کہ انہیں ذرا اور دیکھیں۔ ذرا اور دیکھیں۔ وہ مسکرا رہی ہے نہیں! بڑی سنجیدگی کے ساتھ بیٹھی تھی اور اس کے شوہر کی آواز قہقہوں میں لرزتی ہوئی فضا میں تحلیل ہو رہی تھی۔ میاں دین محمد اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک سایہ اس کے چہرے پر آیا۔ ایک لمحے کے بعد غائب ہو گیا۔ پھر آیا۔ اور اسی طرح چلا گیا اور ٹن ٹن ٹن کی آواز آنے لگی۔ وہ اپنے ہونٹوں پر ایک بوجھ سا محسوس کر کے چونک اُٹھے۔ جیین بخش نے حقے کی نَے اُن کے چہرے کی طرف پھیر دی اور وہ حقے کے کش لینے لگے تھے۔ ابھی تک ان کی نظریں بیگماں کے چہرے پر جمی تھیں۔ اب سایہ غائب ہو گیا تھا، ٹن ٹن کی آواز بھی بند ہو گئی تھی۔ بیگماں اُٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ انہیں ایک دھچکا سا لگا۔ اور انہوں نے چند لمحوں کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اچانک ان کی ناک میں ایک گرم خوشبو گُھس گئی۔ آنکھیں کھول کر انہوں نے دیکھا کہ چائے کا پیالہ ان کے سامنے لکڑی کی چوکی پر دھرا ہے اور اس میں سے بھاپ اُٹھ رہی ہے۔ یہ پیالہ بیگماں نے رکھا تھا، مگر کہا کیوں نہیں تھا کہ میاں چائے پی لو۔ وہ انہیں میاں کہہ کر ہی مخاطب کیا کرتی تھی۔ جب بھی اس نے چائے کا پیالہ ان کے سامنے رکھا تھا۔ یہ لفظ ضرور کہے تھے لیکن اس دن اس نے ایک لفظ تک نہیں کہا تھا۔ انہوں نے اپنی عادت کے مطابق گھونٹ گھونٹ چائے پینے کی بجائے ایک دو منٹ میں پیالہ خالی کر کے رکھ دیا۔ خلافِ معمول بیگماں کے ہاتھ پیالے کی طرف نہیں بڑھے۔ اسے چاہیے تھا کہ خالی پیالہ بھر دیتی جیسا کہ اب تک اس کا معمول رہا تھا، لیکن اس نے کوئی توجہ نہ کی۔ میاں دین محمد اُٹھ بیٹھے۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"اتنی جلدی؟" حسین بخش نے پوچھا۔

"ذرا کام ہے آج"۔ اور وہ سیڑھیوں سے نیچے اُترنے لگے۔ ابھی انہوں نے کھڑی کے تھڑے پر قدم ہی رکھا تھا کہ افضل سامنے آگیا۔ انہیں توقع تھی کہ وہ انہیں مخاطب کرکے ضرور کہے گا۔ "چاچا! ایسا بڑا شعر کیوں پڑھتے ہو صبح ہی صبح، ہم تو نوجوان ہیں اور آپ ...." مگر افضل نے ہاتھ اُٹھا کر سلام علیکم چاچا کہا اور آگے بڑھ گیا۔ میاں صاحب کو اس کے رویے پر حیرت ہوئی۔ چُپ چاپ کیوں چلا گیا ہے اور بگیاں کیوں چُپ رہی ہے۔ نہیں کچھ نہیں، سب فضول ہے۔ بگیاں چُپ رہی ہے تو مجھے کیا۔ پاگل عورت، سب اس کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ لوگ سلام کرتے رہے اور وہ مشینی انداز میں جواب دیتے رہے گھر کے دروازے پر پہنچ کر انہوں نے اندر ہاتھ ڈالا اور کنڈی کھول کر صحن میں چلے گئے۔ باورچی خانے کی دیوار کے ساتھ بچھے ہوئے تخت پوش کے اُوپر ناشتے کا سامان پڑا تھا۔ چینی کے پیالے میں رات کی پکی ہوئی دال تھی جسے ان کی بڑی بہو نے گرم کرکے بھیج دیا تھا اور پیالے کے اُوپر رومال میں لپٹے ہوئے دو کلچے تھے۔ میاں صاحب ایک کلچہ کھاتے تھے۔ سالن کی بجائے چائے ہوتی، تو دوسرے کلچے کا کچھ حصّہ بھی چائے میں ڈال دیتے تھے۔ ایک یا آدھ کلچہ بچ جاتا تو وہ اسے واپس نہیں بھیجتے تھے۔ اس کے بُورے کرکے زمین پر پھیلا دیتے تھے۔ کوّے اور چڑیاں ان پر ٹوٹ پڑتی تھیں۔ نیکی کا یہ چھوٹا سا کام انہیں کچھ خوشی بخشتا تھا اور وہ یہ خوشی ہر روز حاصل کرتے تھے۔ اس میں کبھی ناغہ نہیں پڑنے دیتے تھے۔

انہوں نے کلچے کے صرف دو لقمے توڑے اور انہیں دال کے ساتھ حلق سے اُتار لیا۔ ناشتہ کرنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ وہ کلچے کے بُورے کرنے لگے کوّے اور چڑیاں تو انہیں گلی سے گزرتے ہوئے دیکھ کر فوراً باورچی خانے کی چھت پر آ بیٹھی تھیں۔ اس دن بھی وہ اپنے ناشتے کا انتظار کر رہی تھیں۔

زمین پر بُورے گرنے لگے اور میاں صاحب کے چہرے کو ہوا کے جھونکے چھونے لگے۔ ہوا کے ان جھونکوں کو کوّوں اور چڑیوں کے پَر حرکت دیتے تھے۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ان کی انگلیاں مسلسل حرکت کر رہی تھیں اور ان کی نظریں دال والے پیالے پر جمی تھیں۔ دال کے اوپر گھی نے ٹھنڈے ہو کر کہیں کہیں زرد دھبوں کی صورت اختیار کر لی تھی۔ انہیں بیگماں کے رویے کا خیال آ گیا۔ ٹن ٹن ٹن۔ کیا ٹھیکیدار کی گائے اتنی دیر سے کھیت ہو جاتی ہے۔ انہوں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ نہیں، یہ ٹھیکیدار کی گائے نہیں ہے تو پھر یہ ٹن ٹن کیسی؟ کوئی ٹن ٹن ٹن نہیں میرا اپنا واہمہ ہے۔ پر ایسا کیوں ہے اور اُس وقت بھی یہ آواز کیوں آئی تھی۔ جب مَیں نے بیگماں کے چہرے کو دیکھا تھا۔ بیگماں کیا ہے سارے جہاں کی پاگل عورت۔۔۔ پر اس نے آج کچھ کہا کیوں نہیں تھا۔ شروع ہی سے ایسی احمق تھی۔۔۔ اور انہیں بہت پرانا واقعہ یاد آ گیا۔

محلے میں کسی کی شادی ہو رہی تھی۔ اُس زمانے میں جہاں کہیں بھی بیاہ ہوتا تھا جیراں نامی ایک لڑکی کو ضرور بُلایا جاتا ہے۔ جیراں محلے ہی میں رہتی تھی۔ ڈھولک کے ساتھ گانے میں اُس کا جواب نہیں تھا۔ آدھی آدھی رات تک گاتی تھی اور تھکتی نہ تھی۔ اس کے ساتھ روڑا بجانے کے لیے محلے کی چند لڑکیاں مقرر تھیں۔ ان میں بیگماں بھی تھی۔ اُس رات کے دو تین بجے تک جیراں مہک مہک کر گاتی رہی۔ اس کے بعد سب سو گئے۔

صبح نو دس بجے وہ بیاہ والے گھر میں گئے اور وہاں سے اُوپر کوٹھے پر پہنچے۔ اس وقت ان کی عمر بارہ تیرہ برس کی تھی۔ سکول میں پڑھتے تھے۔ اپنے ایک دوست رفیق کے ساتھ سکول جاتے تھے۔ اسی دن وہ اس رفیق کی تلاش میں اُدھر گئے تھے۔ کوٹھے پہ کوئی بھی نہیں تھا۔ البتہ سیڑھیوں کی دیوار کے پیچھے سے ڈھولک کی آواز آ رہی تھی۔ وہاں جانے کی بجائے انہوں نے دیوار سے لگ کر اُدھر دیکھا۔ بیگماں جو نو دس برس کی ہو گی، اکیلی ڈھولک بجا رہی تھی اور گا رہی تھی۔

"کدی آ ماہیا، کدی آ ماہیا، میرے دین ماہیا، میرے دین ماہیا"

دین محمد کے جسم میں سُرسُری ہونے لگی جیسے بے شمار چیونٹیاں اُن کے چہرے، بانہوں اور ٹانگوں پر چڑھ دوڑی ہوں۔ بیگماں اپنی دُھن میں گا رہی تھی۔ اور اس کے ہاتھ ٹھپ ٹھپ ڈھولک کو پیٹ رہے تھے۔ اگر کوئی اور موقعہ ہوتا تو وہ اس سے

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ڈھولک چھین لیتے اور کہتے، جا دُور ہو بے سُری، مگر اُس وقت انہیں ایک مبہم سی لذت کا احساس ہو رہا تھا۔

بگیاں کو وہ مدّت سے جانتے تھے۔ محلّے کے دوسرے بچّوں کے ساتھ وہ بھی اُن سے کھیلتی رہی تھی۔ وہ جب بھی گھر سے نہیں نکلتے تھے تو وہ اُنہیں بلانے کے لیے آ جاتی تھی۔

"دین...ن! وہ سب بُلا رہے ہیں" حالانکہ کوئی بھی انہیں نہیں بُلاتا تھا۔

بگیاں گا رہی تھی اور اس کے جسم میں جو سُر سُر سی ہو رہی تھی، اب ختم ہو گئی تھی۔ ان کا جی چاہا کہ آگے بڑھ کر اس کی ڈھولک چھین لیں اور وہ آگے بڑھ گئے۔ بگیاں نے انہیں آگے دیکھا تو جھٹ ڈھولک کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا، اور سینے کے ساتھ لگا لیا۔ اُسے احساس ہو گیا تھا کہ دین محمّد اس کی ڈھولک چھیننے کی کوشش کرے گا اور وہ ڈھولک دینے کے لیے تیار نہیں تھی۔

"بگیاں کی بچّی۔"

"کیا ہے وے،" بگیاں مُسکرانے لگی تھی۔

"کیا گا رہی تھی؟"

"جو دل چاہے گا گاؤں گی۔ تجھے کیا؟"

"میرا نام کیوں لے رہی تھی، تجھے شرم نہیں آتی۔" دین محمّد نے غصّے سے کہا۔

"جا وے جا، شیشے میں اپنا منہ دیکھ، تو ہی دین رہ گیا ہے دنیا میں،" بگیاں نے کمر کو بَل دیتے ہوئے کہا۔

"میں تیرا سر توڑ دوں گا، مَیں تیرے بال..."

بگیاں زور سے ہنسی، بھاگی اور دَھپ دَھپ سیڑھیوں سے اُتر گئی۔

دین محمد اُسے دیکھتے تھے تو منہ دوسری طرف پھیر لیتے تھے اور بگیاں جلدی سے اُن کے آگے آ کر اپنے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا دکھا دیتی تھی۔ مطلب یہ کہ تیری پروا ہی کون کرتا ہے؟

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

میاں دین محمد نے اپنا سر باورچی خانے کی دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ اور یہ منظر اُن کی آنکھوں کے سامنے پھر رہے تھے۔ پھر یکایک انہیں محسوس ہُوا کہ ایک سایہ ان کی آنکھوں کے آگیا ہے اور اس کے ساتھ ہی ٹن ٹن کی آواز کانوں میں دَر آئی۔

وہ مضطرب ہو گئے اسی لمحے میں انہیں کسی کے اندر آنے کا احساس ہوا۔

"دین محمد!" کسی نے انہیں مخاطب کیا۔ انہوں نے دروازے کی جانب دیکھا۔ حسین بخش اندر آ رہا تھا۔

وہ سنبھل کر بیٹھ گئے "آ حسین بخشا" اور حسین بخش ان کے قریب تخت پوش پر بیٹھ گیا۔

"یار دین محمد! وہ روٹھی بیٹھی ہے"۔

"کون؟"

"کون.... یار وہی تمہاری بھابی"۔

"تُو نے جو لطیفے سنا کر اس کا مذاق اُڑایا تھا"۔

حسین بخش ہنس پڑا "یار یہ بات نہیں، وہ لطیفوں سے نہیں چڑتی، تُو نے آج ... ایک پیالہ پیا، کہتی ہے میاں اب میرے ہاتھوں کی پکی ہوئی چائے پسند نہیں کرتا، ... منا لینا جا کر"۔

"بڑی آئی رانی چنداں" میاں دین محمد نے کہنے کو تو یہ فقرہ کہہ دیا پر دل میں افسوس ... کہ انہوں نے غیر مناسب بات کہہ دی ہے۔ حسین بخش کے ماتھے پر تیوریاں پڑ گئیں ... اس نے اپنی دلی کیفیت چھپانے کی خاطر افضل کا ذکر چھیڑ دیا۔ بڑی شکایت کرتا ہے، ... بھلے کی بات کرتے ہو۔ سب کو دُنیا چھوڑ جانا ہے۔ کچھ نہیں ساتھ جائے گا۔ اپنے ... ساتھ جائیں گے، افضل کہتا گیا ہے"۔

حسین بخش ہنسنے لگا اور بولا:

"کہتا ہے وہ لوگ اپنے ادھورے کام پورے کریں جو مرنے والے ہیں۔ ٹھیک کہتا ہے۔ سارے کام ادھورے رہ گئے دین محمد یار"۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

میاں دین محمدؒ زیادہ تر خاموش رہے اور جب حسین بخش دروازے میں سے نکل گیا تو اس کے جانے کے بعد انہیں یوں لگا جیسے بخار ہو گیا ہے۔ اپنا دل بہلانے کے لیے وہ چولہے میں آگ جلانے لگے تاکہ چائے اور حقے کا اہتمام کیا جائے، اس دوران میں حسین بخش کے الفاظ "سارے کام ادھورے رہ گئے ہیں دین محمدؒ" ان کے ذہن کو چبھتے رہے۔

پیالہ نکالنے کے لیے انہوں نے لکڑی کے اس تختے پر ہاتھ رکھا جو باورچی خانے کی دیوار کے ساتھ لوہے کی سلاخوں کے اوپر پڑا تھا اور جس پر چینی کے پیالے اور دوسرے برتن رکھے جاتے تھے۔ انہوں نے پیالے کو اٹھایا تو وہ چینی کی ایک طشت سے ٹکرایا۔ ٹن کی آواز آئی اور ان کا ہاتھ وہیں رک گیا۔ دو چار لمحوں کے بعد وہ خود ہی یہ سوچ کر مسکرانے لگے کہ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ میرا ہاتھ رک گیا ہے۔ ہوا کیا ہے ٹن.... صرف ٹن اور کیا، ٹن، ٹن، ٹن اور وہ سایہ، مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پہ پھیکی پڑ گئی۔ ان کا ہاتھ پیالے کے کناروں کو چھو رہا تھا اور ان کی نظریں چولہے کے اندر آگ کے اس شعلے کو دیکھ رہی تھیں جو چائے کی دیگچی کے پیندے تک پہنچ نہیں پایا تھا، اور مضطرب دکھائی دیتا تھا۔

"السلام علیکم۔"

انہوں نے باورچی خانے کے باہر دیکھا، افضل کھڑا تھا۔

"چاچا! ناراض ہو، منانے کے لیے آیا ہوں۔" وہ میاں دین محمدؒ سے ان کے باورچی خانے سے باہر نکلتے ہی لپٹ گیا۔

"آپ کا بچہ ہوں چاچا۔"

میاں صاحب نے اس کے بازو پرے ہٹائے۔ "تم سے کس نے کہا ہے کہ میں ناراض ہوں؟"

"کسی نے نہیں کہا، غصہ تھوک دو ناں کہ بکرے کی طرح میری کھال اتارو گے۔"

افضل کے بے تحاشا ہنسنے پر میاں صاحب بھی مسکرانے لگے۔

"مجھے اور کسی کی پروا نہیں چاچا، بڑا آسمنے نے کہا ہے، چاچا سے معافی مانگو جا کر۔"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"تم سے تمہاری بیوی اچھی ہے۔"

افضل کو یہ لفظ بُرے سے لگے، بولا: "تو چاچا! مَیں کیا کروں، وہ اچھی ہے مَیں بُرا ہوں۔"

میاں صاحب نے دیکھا کہ افضل کے نتھنے پھڑک رہے ہیں۔

"نہیں، تم بھی اچھے ہو۔"

"اچھا چاچا!" افضل خوش ہو گیا۔

"چائے پیو گے، بن گئی ہے، دو پیالوں میں لے آؤ۔"

افضل اسی وقت باورچی خانے کے اندر چلا گیا۔

اب دھوپ ہر طرف پھیل چکی تھی۔ افضل کا سایہ میاں صاحب کے سامنے دیوار پر نظر آ رہا تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اب یہ سایہ جُھکا ہے۔ اب اس کا بازو اُوپر اُٹھا ہے اور اب وہ بیٹھ گیا ہے۔

تھوڑی دیر بعد ہاتھوں میں پیالہ لے کر وہ باہر آ گیا اور میاں صاحب کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

دونوں خاموش تھے اور آہستہ آہستہ چائے کے گھونٹ حلق سے نیچے اُتار رہے تھے۔

"تو چاچا! تُو نے معاف کر دیا۔"

میاں صاحب نے اس کا جواب نہ دیا۔ افضل ان کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔

"افضل!" وہ اس کی طرف مخاطب ہوئے۔

"ہاں چاچا!"

"تمہیں اپنی بیوی سے بڑا پیار ہے۔"

افضل نے پیالہ ہونٹوں سے ہٹا کر اپنا سینہ پُھلایا اور زور زور سے اثبات میں سر ہلا کر ہنسنے لگا۔

"اللہ جوڑی سلامت رکھے۔"

افضل کی چھاتی پھول گئی۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"موتیوں والیو، اُس سے پیار نہ ہوتا تو اس سے بیاہ کیوں کرتا۔ مَیں نے اس سے کہا تھا تیرے ساتھ ہی بیاہ کروں گا۔ کیا ماں، سچا مُردوں کی زبان ہوتی ہے۔ ہوتی ہے ناں۔"

میاں صاحب مُسکراتے رہے۔

افضل نے خالی پیالہ ایک طرف رکھ دیا اور اُٹھ بیٹھا "بیاہ نہ کرتا تو یہ کام ادھورا رہ جاتا۔"

اُس نے خلوص کے ساتھ یہ بات کہی تھی مگر میاں صاحب کو اس میں طنز کا رنگ نظر آیا۔ گویا کہہ رہا ہے۔ ادھورے کام وہ کریں جو گور کنارے بیٹھے ہیں۔ اُن کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ افضل نے اُن کی طرف دیکھے بغیر دروازے کا پٹ کھولا اور سیٹی بجاتا ہوا چلا گیا۔

افضل کے جھوٹے پیالے پر بسیلوں کی تعداد میں مکھیاں اُڑ رہی تھیں، کچھ مکھیاں ان کے کانوں پر اور سر کے اُوپر بھنبھنا رہی تھیں۔ انہوں نے اپنا پیالہ بھی خالی کر دیا اور دونوں پیالے اُٹھا کر کھڑے میں رکھ دیے۔ عام طور پر وہ جھوٹے برتنوں کو فوراً صاف کر دیا کرتے تھے، لیکن اس روز اُن کا جی یہ کام کرنے کو چاہتا ہی نہیں تھا۔ وہ کمرے کے اندر چلے گئے اور جس پلنگ پر تہ کیا ہوا بستر رکھا جاتا تھا اس پر لیٹ گئے۔ کمرے میں اندھیرا تھا اور اُن کی ناک میں ایک ہلکی سی خوشبو سرایت کر گئی تھی۔ رات جب اس کا ایک پوتا کھانا لے کر آیا تھا تو اس نے چنبیلی کے پھولوں کا ایک ہار بھی پکڑا ہوا تھا جسے اُس نے اپنے دادا کے تکیے کے اُوپر رکھ دیا تھا۔ یہ ہار رات بھر وہیں پڑا رہا تھا اور صبح جب انہوں نے بستر تہہ کیا تو باسی ہار کو وہاں سے ہٹایا نہیں تھا۔ انہیں یاد آ گیا کہ ایک بار بیگماں نے بھی انہیں اسی قسم کا ایک ہار دیا تھا۔

"دین ..... ن، یہ ہار تیرے لیے لائی ہوں۔"

"دو پیسے کا ہار۔"

"میں سونے کا ہار کہاں سے لاؤں۔ تم چاندی کا ہار ہی لا دو۔ ہیں دین ..... ن۔"

"ہار دفعہ ہو یار مانگتی ہے۔"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

وہ اس وقت رُوٹھ کر چلی گئی تھی۔ وہ اس منظر کو دوبارہ اپنی آنکھوں کے سامنے لانا چاہتے تھے مگر اچانک مضطرب ہو گئے۔ اس لمحے ارد گرد اندھیرا زیادہ گہرا ہو گیا۔ خوشبو آنی بند ہو گئی۔

"یہ مجھے کیا ہو جاتا ہے؟" انہوں نے خود سے سوال کیا اور کروٹ پہ کروٹ لینے لگے۔ اُن کی خواہش تھی کہ کوئی بات سوچیں اور وہ سوچنے لگے۔ "افضل کہتا ہے میں گور کنارے پہنچ گیا ہوں، ادھورا کام ...؟"

وہ اُٹھ کر بیٹھ گئے اور دیوار کے ساتھ پشت لگا دی۔

"یہ قصائی کا بچہ پاگل ہو گیا ہے۔" انہوں نے یہ الفاظ اس انداز سے کہے، جیسے خود کو سمجھانا چاہتے ہیں کہ میاں کیا بیہودہ سوچ رہے ہو، وہ قصائی کا لونڈا کس حیثیت کا مالک ہے جو تم اس کی بات کا بُرا مانتے ہو۔

انہوں نے اس سوچ کو گویا جھٹک دیا اور کوئی اور موضوع ڈھونڈنے لگے۔

بیگماں ناراض ہو گئی ہے، جو نہ ناراض ہو گئی ہے، پہلے بھی ناراض ہوتی رہی ہے، روٹھ جاتی رہی ہے۔ ٹھک ٹھک ٹھک، ڈھولک کے سینے پر زوردار مارتے ہوئے اس کی ناک کا سنہری کوکا لشکارے مارتا تھا۔ کدی آ ماہیا، کدی آ ماہیا میرے دین ماہیا... میرے... توبہ میری... پاگل تھا میں، وہ چونک اُٹھا۔ پاگل تھا میں نہیں۔ پاگل تھی وہ۔ میں... میں کبھی پاگل نہیں ہوا۔ مجھے کہنا چاہیے... پاگل تھی وہ اور وہ... وہ...؟

اچانک انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی گرم گرم لہر اُن کے سارے جسم میں چلی گئی ہے۔ ٹن ٹن ٹن۔ کوئی خیال جیسے دلدل میں سے باہر نکل آیا تھا۔

وہ وہاں کھڑی تھی... بیگماں... اُس جگہ جہاں ایک چھوٹا سا مندر تھا۔ اس مقام پر جو بازار حکیماں کو جانے والے اور تحصیل بازار کی جانب گھومنے والے راستوں کا سنگم تھا۔ زمین سے ایک ڈیڑھ گز اوپر ایک چبوترا تھا جس کے اوپر عام دروازوں سے چھوٹا ایک دروازہ تھا جو ہمیشہ بند رہتا تھا اس کے پیچھے ہنومان کا بُت تھا اور دروازے کے اوپر چھوٹی سی چھت سے ایک گھنٹہ لٹکا رہتا تھا جو بھی لڑکا قریب سے گزرتا تھا بچوں کے

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

بل کھڑے ہو کر اس گھنٹے کو ہلا دیا تھا اور ٹن ٹن کی آواز آنے لگی تھی۔

یہ سارا نقشہ دین محمد کی آنکھوں تلے پھرنے لگا تھا۔

مندر کے دروازے کے ساتھ بگیاں کھڑی تھی اور وہ اس کے سامنے کھڑے تھے۔ درمیان میں گھنٹہ تھا جو بل رہا تھا اور ٹن ٹن کی آواز آ رہی تھی۔ رات کا ابتدائی حصہ تھا، چاندنی چٹکی ہوئی تھی، وہ دیکھ رہے تھے بگیاں کو، حرکت کرتے ہوئے گھنٹے کا سایہ بار بار اُن کے چہرے پر آ کر ہٹ جاتا تھا۔

چند لمحے پہلے بگیاں نے کہا تھا۔

"دین... ن، تو میرا ماہیا ہے۔"

اس کے جواب میں انہوں نے کہا تھا۔

"پھر میں کیا کروں؟"

"ہاں۔ نہ کر دے، ہاں کر دے یا... ہاں کہہ دے۔"

یہ کہہ کر بگیاں نے آنکھیں جھکا لی تھیں اور وہ اُسے دیکھنے لگے تھے۔

وہ اُسے دیکھتے رہے... سایہ بگیاں کے چہرے پر آتا رہا، جاتا رہا۔ ٹن ٹن ہوتی رہی۔ بگیاں کی چھٹی حس نے اسے احساس دلایا کہ کوئی انہیں دیکھ رہا ہے، وہ گھبرا گئی۔

"دین... ن۔"

"کل بتاؤں گا... یہاں... شام کو۔"

"یاد رکھنا۔" بگیاں نے جلدی سے کہا۔

اور وہ الگ الگ راستوں پر چلنے لگے۔

مگر وہ شام کبھی نہ آئی۔ انہیں فوراً پتہ چل گیا کہ ان کا باپ کہیں اور معاملہ طے کر چکا ہے اور انہوں نے باپ کی کارروائی پر بظاہر کوئی احتجاج نہ کیا۔ اگرچہ ان کا دل سینے کے اندر تڑپتا رہا اور اس کی شادی اپنے خاندان کی ایک لڑکی سے ہو گئی۔ ایک ڈیڑھ ماہ بعد بگیاں کا بیاہ بھی حسین بخش کے ساتھ ہو گیا۔

اس منظر کو اپنی یادداشت میں پا کر میاں دین محمد کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ ایک

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ں سے باہر نکل آتے ہیں اور اب ایک ہموار راستے پر چلے جا رہے ہیں۔ انہوں
پنے دل میں ایک عہد کیا اور پلنگ سے اٹھ کر باہر آگئے۔ ان کا بڑا پوتا کھانا لے کر
تھا۔

دوسرے دن انہوں نے چوک میں سے گزرتے ہوئے سب سے پہلے اس دکان
رف دیکھا جس میں حسین بخش روزمرہ استعمال کی عام چیزیں بیچا کرتا تھا۔ دکان کھل چکی
اور وہ اندر بیٹھا ایک گاہک کے لیے پڑیا باندھ رہا تھا۔

میاں صاحب دکان کے سامنے سے جلدی سے گزر گئے۔ کشٹری کے تھڑے پر گئے
ڈیوڑھی میں سے ہوتے ہوئے سیڑھیاں طے کرکے حسین بخش کے گھر جانے لگے۔
ت کے مطابق انہوں نے دیوار پر دو تین بار ڈنڈا مارا، یعنی اپنی آمد کا سگنل دے دیا اور
چلے گئے۔

بگیماں تھالی کے اوپر کلچہ اور کلچے کے اوپر دہی رکھے کھا رہی تھی۔

"تو ناراض کیوں ہے بگیماں؟"

بگیماں اپنے شغل میں مصروف رہی۔

"وہ کلچے پڑے ہیں، دہی یا چائے۔" بگیماں نے انہیں دیکھے بغیر کہا۔

"بگیماں:"

بگیماں کو میاں صاحب کا لہجہ بدلا ہوا لگا۔ کلچے کا لقمہ توڑ کر وہ اس سے دہی لگا رہی
۔ اسی لمحے اس کا ہاتھ رک گیا۔

"میں ایک خاص بات کرنے آیا ہوں۔ تمہیں یاد ہے وہ مندر والی ملاقات یاد
ناں؟"

وہ انہیں گھور گھور کر دیکھنے لگی۔

"یاد ہے ناں؟" میاں صاحب نے دوبارہ پوچھا۔

بگیماں نے کچھ بھی نہ کہا، بس انہیں دیکھتی رہی۔

"تم نے ایک سوال کیا تھا اور میں نے کہا تھا دوسری شام کو اس کا جواب دوں گا۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

میں وہاں نہ جا سکا..... تو گئی تھی؟ ضرور گئی تھی۔ جواب دے۔ بیگماں جواب دے بول بیگماں۔
"مجھے سردی سے بخار ہو گیا تھا، مرتے مرتے بچی تھی" بیگماں نے گھٹے گھٹے لہجے میں کہا۔
"میرا فرض تھا کہ تمہیں اطلاع دیتا۔ ابا کو ہماری ملاقات کا علم ہو گیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا، خبردار گھر سے باہر نہ جانا"
"ڈر گئے تھے، دین..... ن"
"یہ کام ادھورا رہا، تو مجھے معاف کر دے"۔
بیگماں خاموشی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اور میاں صاحب اُسے دیکھ رہے تھے۔ وہ اس کے چہرے پر ایک سائے کو آتے جاتے دیکھ رہے تھے اور ٹن ٹن کی آواز آ رہی تھی۔ کئی لمحے اسی عالم میں گزر گئے۔
"کر دیا معاف" میاں صاحب نے پوچھا۔
"تو جواب دے گا" بیگماں نے پوچھا۔
"کس بات کا"
"سچ سچ بتاؤ گے"
"تم اس شام آتے تو ہاں کہتے یا کیا کہتے"
"ہاں کہتا"
بیگماں کی ناک کا کوکا چمک رہا تھا۔ میاں دین محمد کو یوں لگا جیسے بیگماں کے سارے چہرے پر سینکڑوں کوکے ایک دم چمک اٹھے ہیں۔ ان کی روشنی بڑھتی جا رہی ہے، پھیلتی جا رہی ہے
"معاف کر دیا" میاں صاحب نے تیسری بار پوچھا۔
"دو تین روز بعد بتا دوں گی"
اور دو تین دن ہی گزرے تھے کہ شام کو میاں دین محمد گھر میں تخت پوش پر بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ بیگماں آ گئی

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"چھوٹی مسیت کے مولوی کو بلاؤ گے یا بڑی مسیت کے مولوی کو؟" اُس نے آتے سوال کیا۔

وہ اس کا سوال ہی نہ سمجھ سکے اور استفہام انگیز نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔

"سمجھے نہیں دین ۔۔۔ ن! نکاح کون پڑھائے گا؟"

"نکاح؟"

"ہمارا نکاح"

"ہمارا۔۔۔؟"

"میں نے اس سے چھٹی لے لی ہے۔ یہ رہا کاغذ"

اور بگیاں اپنے دوپٹے کے پلو کو کھولنے لگی۔

اور جب وہ رات بیتی اور صبح ہوئی تو سب سے پہلے جس شخص نے ان کے دروازے پر دستک دی، وہ افضل تھا۔

"مبارک ہو چاچا!"

اور میاں صاحب نے اسے گلے لگا لیا۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ماسی

ماسی سب کے لیے ماسی تھی۔ ویسے تو محلے میں بڑی بوڑھیاں بھی تھیں اور ماسی کی ہم عمر عورتوں کی بھی کوئی خاص کمی نہیں تھی مگر ماسی — ماسی ہی تھی۔ بڑوں کے لیے بھی اور چھوٹوں کے لیے بھی۔

ماسی کی عمر پینتالیس پچاس سے زیادہ نہیں تھی۔ قد لمبا، چہرہ لمبوترا، دائیں گال پر کسی پرانی چوٹ کا نشان، ناک خاصی لمبی۔ بدن چھریرا، لباس گرمیوں اور سردیوں میں کیساں۔ ماسی سخت سے سخت سردی میں بھی چادر اوڑھ کر گھر سے نہیں نکلی تھی۔ معلوم نہیں اس پر سردی کا اثر کیوں نہیں ہوتا تھا۔ بلا کی توانائی تھی اس کے پتلے دُبلے جسم کے اندر۔ کام کرتی رہتی تھی اور تھکنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ گویا اسے کام سے محبت تھی اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ محبت بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں رہتی تھی۔ اس دیوار کے پیچھے جس پر چوک دیوی دتا کا بورڈ آویزاں تھا۔ یہ کوٹھڑی چراغ دین درزی کے مکان کا نچلا حصہ تھا اور یہ مکان تین منزلہ تھا۔ اوپر کی منزلوں میں چراغ دین درزی اپنے کنبے کے ساتھ رہتا تھا۔

ماسی کی کوٹھڑی میں جو چیز بھی جہاں رکھی گئی تھی، وہیں کی وہیں پڑی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی نگاہیں سب سے پہلے اس چارپائی پر پڑتی تھیں جو دیوار کے ساتھ بچھی تھی۔ اس چارپائی کے ہر پائے کے نیچے تین تین ڈبل اینٹیں رکھی گئی تھیں۔ اس سے

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

چارپائی کا تنداتنا اونچا ہو گیا تھا کہ اس کے نیچے ایک کھٹولی بھی رکھ دی گئی تھی۔ اس کھٹولی کا مصرف صرف یہ تھا کہ ماسی اس پر اپنے کپڑے اور کاتا ہوا سوت رکھ دیتی تھی یا جب سونے کی ضرورت محسوس کرتی تو اسے ذرا کھسکا کر اور اس کے اُوپر پاؤں رکھ کر چارپائی پر پہنچ جاتی تھی۔ کھٹولی اور کسی کام کے لیے استعمال نہیں ہوتی تھی۔

ماسی دن بھر کام کرنے کے بعد رات کے وقت اپنی کوٹھڑی میں آتی تھی۔ اس وقت اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہوتی تھیں۔ وہ فوراً چارپائی پر چڑھ جاتی اور خود کو نیند کے حوالے کر دیتی۔

کھانے پینے کی اُسے کوئی فکر نہیں تھی۔ جس گھر میں بھی ہوتی وہیں پیٹ بھر لیتی۔ پہننے کے لیے کم از کم دو فالتو جوڑے ہر وقت کھٹولی پر پڑے رہتے تھے۔ جب تینوں میلے ہو جاتے تو وہ پھر چراغ درزی کے نلکے کے نیچے بیٹھ کر انہیں دھو لیتی تھی۔ صابن خود بازار سے خرید کر لاتی تھی اگرچہ چراغ دین درزی کی بیوی سرفراز اس بات کو پسند نہیں کرتی تھی۔ مگر ماسی کہتی تھی کہ اپنے صابن سے کپڑے زیادہ صاف ہوتے ہیں اور سرفراز یہ بات سُن کر ہنس پڑتی تھی۔

گھر کے اندر ماسی کو کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ رات اپنے ساتھ جو روٹی سالن لاتی تھی وہی کھا لیتی تھی۔ یہ روٹی سالن جو وہ اپنے چولہے پر گرم کرتی تھی۔ اس کے لیے ناشتہ بھی تھا اور دوپہر کی روٹی بھی۔ البتہ دوپہر کو دارو غہ جی کے گھر جا کر وہ گلاس لسی ضرور پیتی تھی۔

ماسی اپنی کوٹھڑی میں دن کا کوئی پروگرام طے نہیں کرتی تھی۔ اوّل تو جب وہ چولہا جلا رہی ہوتی کوئی نہ کوئی اس کے ہاں آ جاتا تھا اور اپنے گھر آنے کے لیے کہہ جاتا تھا۔ ماسی ہر قسم کا کام کر لیتی تھی۔ بیمار کی خدمت گزاری، بازار سے سودا سلف لانا، کسی کا کوئی پیغام دور یا نزدیک کسی گھر میں پہنچانا اور اس قبیل کے بیسیوں کام کرتے وقت اُسے کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی مگر اس کا اصل جوہر اس وقت کھلتا تھا جب وہ کسی کے ہاں دایہ گری کرتی تھی، وہ عام طور پر کسی مستند دائی کی مدد کرتی تھی خود دائی نہیں بن

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

جاتی تھی۔ ہوتا یہ تھا کہ مستند دائی تو اپنا انعام لے کر رخصت ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد
سی ہی ہر ہر مرحلے پر زچہ و بچہ کی دیکھ بھال کا فرض ادا کرتی تھی۔

ماسی کی کوٹھڑی کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس کا دروازہ کبھی مقفل نہیں ہوا تھا۔
سی کو صبح باہر جانا ہوتا تھا تو دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دیتی تھی اور رات کو خود ہی آ کے یہ
نڈی کھولتی تھی۔

ماسی کو پورے مہینے میں ایک آدھ دن ہی ایسا میسر ہوتا تھا جب وہ پوری آزادی
کے ساتھ اپنا سارا وقت کوٹھڑی کے اندر گزارتی تھی۔ اس دن وہ بڑے چاؤ سے گڑ کا
رہ بناتی۔ جی چاہتا تو ساتھ روٹی بھی پکا لیتی۔ ورنہ بازار سے ایک نان خرید لاتی۔ یہ روٹی یا
ن حلوے کے ساتھ کھاتی۔ فارغ ہو کر برتن مانجھتی، پانی والی بالٹی خالی ہو جاتی تو اوپر سے
بارہ بھر کر لے آتی۔ چراغ دین درزی کی بیوی بلاتی تو ہنس کر کہتی: "بہن! آج چھٹی کا کا دن
۔" اور بالٹی سیڑھیوں سے اُتار کر اسے اس کی جگہ پر رکھ دیتی۔ ماسی کی کوٹھڑی میں ایک
ا اور بالٹی ہر وقت پانی سے بھرا رہتا تھا حالانکہ اسے پانی کی شاذ و نادر ہی ضرورت
تی تھی۔ بالٹی رکھ کر وہ چند لمحے سانس درست کرتی اور پھر یوں ہوتا کہ اس کے چہرے
یک واضح قسم کی نرمی اور ملائمت آ جاتی۔ نرمی اور ملائمت تو پہلے بھی ہوتی تھی مگر اب
یہ کیفیت کچھ زیادہ گہری، کچھ زیادہ نمایاں ہوتی تھی۔ وہ کھٹولی کے نیچے سے چرخی
لتی۔ اُسے آلے کے کنستر کے پاس رکھ دیتی۔ پھر اسی کنستر کے پیچھے جو پرانا چرخا پڑا رہتا
اُسے اس طرح اٹھاتی جیسے پہلوٹی کے بچے کو سینے سے لگا رہی ہے۔ چرخے کو چوکی
اُوپر رکھ دیتی۔ چارپائی کی پائنتی کے پاس جاتی، لکڑی کے ایک صندوق میں سے روئی
تی۔ اس کی دو تین پونیاں بناتی۔ باقی وہیں صندوق میں ڈال دیتی۔ پونی تکلے پر لپیٹتی اور دائیں
سے چرخی گھمانا شروع کر دیتی۔ اسی لمحے اس کے سارے جسم میں ایک لرزش سی دوڑ
ں۔ اس کے ہونٹ کانپتے اور پھر چرخے کی گھوں گھوں کے ساتھ اس کی باریک آواز
بھنے لگتی ہے

ہن میتھوں کتیا نہ جاوے

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ہتھی ڈھلک گئی میرے چرخے دی ہُن مینوں کتیا نہ جاوے
ہُن دِن چڑھیا کدہووے مینوں پیارا منہ دکھلاوے
نکلے نوں دل پے پے جاندے کون لوہار لیاوے
ہتھی ڈھلک گئی میرے چرخے دی ہُن مینوں کتیا نہ جاوے
ماہی چھڈ گیا نال نہیں لے ہُن کتن کس نوں بھاوے
ہتھی ڈھلک گئی میرے چرخے دی ہُن مینوں کتیا نہ جاوے
ہُن مینوں کتیا نہ جاوے

اس کے ہونٹ حرکت کرتے رہتے۔ اس کا ہاتھ حرکت کرتا رہتا اور جب کچھ وقت گزر جاتا تو اس کی آنکھیں بند ہو جاتیں۔ وہ پونی سے بے نیاز ہو جاتی۔ لیکن اس کا ہاتھ ہتھی کو برابر گھماتا رہتا۔ اتنے میں کوئی آجاتا تو وہ جلدی سے اپنا ہاتھ ہتھی سے ہٹا کر دونوں گالوں کی نمی خشک کر دیتی اور منہ پر بالٹی کے پانی سے ایک دو چھینٹے مار کر گھڑے کے پانی سے گلاس بھرتی اور سارے کا سارا پانی پی جاتی۔ اس دوران میں آنے والے سے کوئی لفظ کہتی۔ وہ جان لیتی تھی کہ آنے والا اُسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہے اور وہ چند منٹ کے اندر اندر باہر جانے کے لیے تیار ہو جاتی۔ اس روز وہ بہت کم بولتی تھی۔ کوشش کرتی تھی کہ جلدی ہی کام ختم کر کے گھر لوٹ جائے۔ کوٹھڑی میں پہنچ کر وہ چرخے کو اس کی جگہ پر لگا دیتی۔ چوکی کھٹولی کے نیچے رکھ دیتی اور پانی کا ایک آدھ گلاس پی کر چارپائی پر لیٹ جاتی پھر صبح سویرے بیدار ہوتی اور اس وقت اسے دیکھ کر کوئی بھی یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا کہ ایک رات پیشتر وہ کھوئی کھوئی رہی ہے اور اس عالم میں کسی سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔

اس دوپہر کو ساری رات جاگنے کے کارن اس کی طبیعت کافی افسردہ تھی۔ کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ صبح کے وقت داروغہ جی کے گھر سے وہ ساگ ملے چاول لائی تھی۔ ابھی تک آٹے کے کنستر کے اوپر تھالی میں پڑے تھے۔ اس نے تھالی اُٹھائی اور دروازے کے باہر انہیں ڈھیر کر دیا۔ ایک کتا جو چراغ دین درزی کی منڈیر پر ایک اینٹ

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

کے اُوپر اس وجہ سے چونچیں مار رہا تھا کہ اس پر تھوڑا سا آٹا جما ہُوا تھا۔ فی الفور کائیں کائیں کرنے لگا اور اس کے ساتھ ہی کوٹھڑی کے آگے فرش پر بے شمار چھوٹے چھوٹے سائے پڑنے لگے۔ کوؤں کی کائیں کائیں سے سارے چوک میں ایک بیزار کُن شور برپا ہوگیا۔ ماسی کوؤں کی کائیں کائیں سے جلد بیزار ہوگئی۔ مگر ان سے نجات کی کوئی صورت ممکن نہیں تھی۔ اس نے خود ہی تو انھیں دعوت دی تھی۔ اور اب وہ دعوت قبول کر کے جوق در جوق آ گئے تھے۔

ماسی نے دروازہ بند کر دیا۔ شور ایک حد تک کم ہوگیا۔ وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اب کیا کرے۔ حکیم کے پاس جائے یا چارپائی پر لیٹ کر آرام کرے کہ باہر سے آواز آئی۔

"ماسی"

"کون ہے؟" ماسی نے پوچھا۔

"ماسی میں ہوں۔ سرِوری"۔

سرِوری۔ اللہ رکھی گُجری کی بیٹی۔ گھر میں اور کوئی نہیں ہے جو مجھے بلانے آتا۔ یہ سوچ کر ماسی نے آواز دی۔ "آجا بِنی دھیئے"۔

سرِوری اندر آگئی۔ وہ ماسی کے گھر میں پہلی بار آئی تھی اور دہلیز پر کھڑی ماسی کی چیزوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ یکایک وہ ہنس پڑی۔ "ماسی۔ نی۔ ماسی"

"دیکھ تیری ماں سے جا کہوں گی۔ اب اس کی شادی کر دے"۔

سرِوری نے جلدی سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ "توبہ ماسی۔ تیرے گھر کوئی کیوں آئے گا۔ بے عزّت کر دیتی ہے تُو۔

ماسی نے محسوس کر دیا کہ سرِوری ناراض ہوگئی ہے۔ ملائمت سے بولی۔ "اچھا اب باتیں نہ بنا۔ تیری ماں نے مجھے بُلایا ہے۔ کہہ دے جا کے آج کسی کے گھر میں نہیں جاؤں گی۔ آج مجھے چھٹی ہے"۔

سرِوری نے منہ پھیر لیا۔ "ماں نے نہیں بُلایا تجھے"۔

"اچھا۔ پھر بیٹھ جا"۔ ماسی نے کھٹولی کھسکا کر اپنی چوکی کے قریب کر دی۔ "بیٹھ جا

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

اس پر:

سروری بیٹھ گئی۔

"ہنسی کیوں تھی؟"

"وہ — ماسی —" سروری دوبارہ ہنس پڑی۔

"دُر لعنت۔ پھٹے مُنہ تیرا!" ماسی کو غصّہ آگیا۔

"ماسی بات یہ تھی — یہ تیری کھٹولی چارپائی کے نیچے پڑی تھی۔"

"پھر کیا ہے؟"

"ماسی لگتا تھا تیری چارپائی نے بچہ دیا ہے۔" سروری زور زور سے ہنس پڑی۔ ماسی نے مارنے کے لیے ہاتھ اُوپر اٹھایا تو سروری جلدی سے پرے ہٹ گئی۔ ماسی نے سروری کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کا رنگ جو دودھ کی طرح سفید تھا، اب قدرے سُرخ ہو گیا تھا اور وہ اپنے دائیں ہاتھ کو کُرتی کے نیچے لے جا کر پیٹ کھُجا رہی تھی۔

"نی گھبرائی کیوں ہے۔ ایک دن تیری گود"

"چُپ ماسی! بے شرمی کی بات کرتی ہے۔"

"من میں تو لڈو پھُوٹ رہے ہیں نا!" ماسی مسکرانے لگی۔

سروری سوچنے لگی کہ کس طرح گفتگو کا موضوع بدل دے۔ کہنے لگی: "ماسی وہ جو ٹوٹے مینگ والی کھاٹ ہے نا ہماری۔ وہی نا ماسی! جو تایا پچھلی بیساکھی کو شیخوپورے سے ساتھ اُوپر سو کر لایا تھا۔ اس نے بچہ دیا ہے۔ بورتی لاؤں تیرے لیے؟"

"نہ نہ۔ مجھ سے چولہا جلانے کی مصیبت نہیں ہوتی۔" یہ لفظ کہتے ہوئے ماسی چوکی سے اُٹھ کر کھٹولی پر بیٹھ گئی۔ دونوں ایک دوسری کے اس قدر قریب بیٹھی ہوئی تھیں کہ ایک کا سانس دوسری کے چہرے کو چھُو رہا تھا۔

دو تین لمحے خاموشی رہی۔

"ماسی! ایک بات پوچھوں۔ تیرا نام کیا ہے؟" سروری نے پوچھا۔

"ماسی۔"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"ماسی تیرا نام تھوڑی ہے۔ جیسے میرا نام ہے سروری۔ ماں کا نام ہے اللہ رکھی
تیرا نام کیا ہے؟"

"تجھے میرے نام سے کیا ہے؟"

"ماسی! بتا دے ناں۔ مَیں نے شرط باندھ رکھی ہے۔"

"کس سے؟"

"اُس سے ـــ ماسی وہ ہے نا ـــ داروغہ جی کا بڑا لڑکا۔ کیا نام ہے اُس
کا.... ہائے اللہ بھول گئی ہوں ـــ غفور ـــ ہاں غفور۔ تُو نے دیکھا ہے ماسی! میں
دودھ لے جاتی ہوں ناں داروغہ جی کے گھر ـــ آج کہنے لگا بُلبُل!"

"بُلبُل کیا؟"

سروری نے جلدی سے سر کو جھٹکا دیا۔ اس کے بالوں کی ایک لٹ پیشانی سے
آگے بڑھ کر ناک کے دائیں نتھنے تک پہنچ گئی۔ اپنے ہاتھ سے اس نے یہ لٹ پرے
ہٹا دی۔ اس کا چہرہ پھر سُرخ ہو گیا تھا اور ماسی غور سے اس کے متغیر چہرے کو دیکھ
رہی تھی۔

"غفور بُلبُل کہاں سے لے آیا؟" ماسی نے گھور کر سروری کو دیکھا۔

"ماسی! وہ کہتی ہے؟"

"بُلبُل ـ کہتی؟ سروری تو کیا کہہ رہی ہے؟"

"ماسی! اُگانے نے رات کہتی دی ہے!"

"دی ہوگی۔ پر یہ بُلبُل کی بات کیا ہے؟" ماسی نے اندازہ لگا لیا کہ سروری موضوع
بدلنا چاہتی ہے مگر وہ اسے آسانی سے بات بدلنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔

"اچھا ـــ مَیں سمجھی۔ غفور نے گھر میں بُلبُل پال رکھی ہے؟"

"نہیں ماسی ـــ نہیں ـــ نہیں" ۔ سروری نے زور زور سے سر ہلایا۔ "وہ تو مجھے
کہتا ہے۔"

ماسی بے جہ سے رسخہ گ ہوگئی۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"میں نے سو بار کہا ہے۔ مجھے بُلبُل مت کہا کر پر مانتا ہی نہیں۔ کل بولا۔ بُلبُل ابتا تو ماسی کا اصلی نام کیا ہے۔ بتا دو گی تو بجو حلوائی کی دکان سے سیر بھر گرم گرم جلیبیاں لا دوں گا۔ مجھے تیرا نام معلوم ہی نہیں۔ بتا دے ناں ماسی!"

"تو خوش ہے ناں؟"

"جلیبیاں لے کر۔ ہاں ماسی؛"

"جلیبیاں لے کر نہیں۔ جب وہ تجھے کہتا ہے بُبل تو تُو خوش۔"

سروری نے بے اختیار اپنا ہاتھ اس کی پیٹھ پر دے مارا۔

"ہائے تیرا بیڑا غرق۔ میری پیٹھ توڑ دی ہے۔ گھر کا دودھ پی پی کر سانڈ ہو گئی ہے۔" سروری ہنسنے لگی۔

"ماسی! میں شرط جیت لوں گی۔"

"نہیں تُو ہار جائے گی"۔ ماسی نے فوراً جواب دیا۔

سروری کے ہونٹوں سے نکلا "ہائے اللہ"۔ ماسی اس کے لفظ یا تو سُن ہی نہ سکی اس نے یہ لفظ سُنے تو ان کا مفہوم نہ سمجھ سکی۔ وہ نہ جانے کیوں ٹکٹکی باندھ کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ سروری اُٹھ بیٹھی۔

"چلی جاؤں ماسی؟" ماسی نے کوئی جواب نہ دیا اور سروری دروازے کی طرف جانے اور باہر چلی گئی۔

شام گہری ہو چکی تھی۔ صبح سے دوپہر تک بوندا باندی ہوتی رہی تھی۔ اس لیے ہوا میں خنکی تھی اور ایسے میں ماسی دوپٹے کی بُکل مارے اپنے گھر کی طرف آ رہی تھی۔ اُس نے دیکھا معراج دین چوک کی لالٹین جلا کر سیڑھی پر سے نیچے اُتر رہا تھا۔ معراج دین پیشے کے لحاظ سے تو درزی تھا مگر اس نے کارپوریشن میں سابھی نوکری کر لی تھی۔ اُس کا کام تھا کارپوریشن کی لالٹینیں جلانا اور یہ کام وہ کئی سال سے انجام دے رہا تھا۔ ہر شام ایک سیڑھی بغل میں داب کر اور ایک میلا کچیلا کپڑا کندھے پر رکھ کر گھر سے نکل آتا تھا اور محلہ ستھاں کی سبھی لالٹینیں جلا دیتا تھا۔ کہنے والے کہتے تھے کہ اُسے تنخواہ تو بس واجبی ہی ملتی ہے

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

اس کی اصل آمدنی اس تیل سے ہوتی ہے جو وہ شیشوں میں ڈالنے کے لیے کارپوریشن سے لیتا ہے اور یہ تیل آدھے سے زیادہ لوگوں کے گھروں میں جلا جاتا ہے اور اس تیل سے اسے اچھے خاصے پیسے مل جاتے ہیں

ماسی نے چوک کی لالٹین پر نظر ڈالی۔ شیشوں کی چار دیواری میں سُرخ بتی ہلکی سی روشنی بکھیر رہی تھی۔ ماسی نے سمجھ لیا کہ لالٹین میں تیل نہیں ہے اور اگر ہے تو بہت کم ہے۔

"ماسی۔ معراج دین نے سی کو خاصا لمبا کر کے کہا۔

صغریٰ ابھی سسرال میں ہے؟" ماسی نے پوچھا۔

"نہیں ماسی۔ یہاں ہے۔ کل پرسوں چلی جائے گی۔"

"اب اصغری کے بیاہ کی فکر کر۔ جوان ہوگئی ہے۔" ماسی نے کہا۔

"ماسی۔ اس کا بیاہ تو ہو جائے گا مگر اس سے پہلے اس کی شادی ہوگی۔"

"کس کی؟"

"ماسی! بھولی بنتی ہے۔ سب کچھ جانتی ہے۔ وہ آج کل تیرے گھر میں آتی جاتی بنتی ہے۔"

"سروری کی بات کرتا ہے؟"

"اور کس کی کروں گا — ابھی ابھی گئی ہے — تیرے گھر میں۔"

معراج دین نے سیڑھی کو بغل میں دابا اور چلنے لگا۔

سروری میری کوٹھڑی میں بھلا کیا کرنے آئی ہے۔ ماسی نے سوچا اور جب وہ اپنے دروازے پر پہنچی تو اُس نے دیکھا کہ اُس کا ایک پٹ کھُلا ہے۔ وہ اندر گئی۔

سروری نے دیا روشن کر رکھا تھا اور کھٹولی کے اُوپر بیٹھی تھی۔

"نی ماسی! تو بڑا تنگ کرتی ہے۔ کہاں جا رہی تھی؟"

یہ نوجوانی کا لہو تھا جو چھلک رہا تھا۔

"نی سروری!"

نی ماسی!" سروری نے ماسی کو اُسی لہجے میں پکارا جس لہجے میں اُس نے مخاطب

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

کیا تھا۔

چوری کرنے آئی ہے میرے گھر میں؟"

سروری نے تنک کر کہا۔ "ماسی تیرے گھر میں ہے کیا جو میں چرا کر لے جاؤں گی۔"

چڑ خ اماں خو بلا۔ ہائے میرا تو جی چاہتا ہے اسے اُٹھا کر سامنے کنویں میں پھینک دوں۔"

ماسی کے ملتے پر بل پڑ گئے۔

نی ـــ یہ تو میرا دیر ہے۔"

"ویر ہندو دیر کالی بیر" سروری ماسی کو تنگ کرنے پر تل چکی تھی۔

ماسی اُس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

"نی ـــ میں نے سُنا ہے تو دارو غہ جی کی بہو بننے والی ہے" ماسی نے کہا۔

"ماسی! اللہ نے بڑی مہربانی کی ہے اگر میرا دہاں رشتہ نہ ہوتا تو مر جاتی زہر کھا کر۔ سچ کہتی ہوں ماسی!"

ماسی نے ایک آہ بھری۔

"کیوں ماسی۔ ٹھنڈی آہ کیوں بھری ہے؟"

ماسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ آنکھیں ملنے لگی۔

"اتنی جلدی سو جائے گی ماسی! میں تو تجھ سے باتیں کرنے آئی ہوں ـــ تو تو ـــ

ں ـــ وہ ہے۔ سچ بتاؤں کیلا ہے۔ ماں ـــ ـــ"

"ماں تو تیری اللہ رکھی ہے۔"

"اُس نے مجھے جنا ہے پر پیار تو دیتی ہے، ماسی! مجھے بڑا دُکھ ہوتا ہے اس بے چاری بیوہ اتنا کام کرتی ہے۔ تھک جاتی ہے۔ اچھا تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ مجھے کوئی کام نہیں کرنے دوں گی۔ تجھے اپنے گھر لے جاؤں گی۔"

"نی میں کوئی لگا سے ہوں۔"

سروری زور سے ہنس پڑی۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"ماسی بیاہ کے بعد لڑکیوں کا گھر ماں باپ کا گھر نہیں ہوتا۔ جہاں جاتی ہیں وہ اُن کا گھر ہوتا ہے۔ اتنی سی بات بھی نہیں جانتی۔" سروری ذرا خاموش رہی پھر بولی۔

"ماسی! ایک بات بتائے گی؟"

"پوچھ ــــ بتانے والی ہوگی تو بتا دوں گی ــــ"

"ماسی ــــ تو بھی کبھی میری عمر کی تھی ــــ تیرا بھی کبھی کوئی ــــ ضرور ہوگا ہے ناں ماسی؟"

ماسی خاموش تھی۔

"بتا بھی ناں ماسی! میں تیری دھی نہیں۔"

ماسی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"پھر بتا دے ناں۔"

"بزرگوں سے ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔"

"اچھا تو بزرگ ہمیشہ ہی بزرگ رہتے ہیں ــــ جوان کبھی نہیں ہوتے تھے۔ ماسی لگتا ہے تو مجھ سے چھپا رہی ہے۔ میں نے سُنا ہے ــــ بتا دوں کیا سُنا ہے۔ سُنا ہے تیرا بھی کوئی رانجھا ــــ تھا ــــ اور تو اُس کی ہیر تھی۔"

سروری کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔

"ماسی! بول۔ نہیں بولے گی تو میں چلی جاؤں گی۔"

"تھا۔" ماسی کے ہونٹوں سے نکلا۔ "پر بیاہ ــــ" اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"بیاہ کیوں نہیں ہوا تھا؟ اُس کا باپ نہیں مانا تھا ــــ ماسی! میں وہاں ہوتی تو اپنا سر اُس کے باپ کے قدموں میں رکھ دیتی ــــ"

سروری ایک دم سنجیدہ ہوگئی تھی اور اُس کے دائیں ہاتھ کی انگلی اُس کے گال کے اُس داغ کو چھو رہی تھی جو کسی پُرانی چوٹ کا نشان معلوم ہو رہا تھا۔

"اب تو جا گھر، تیری ماں ڈھونڈنے کو آجائے گی۔"

"اچھا ماسی۔"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

سرودی نے کوئی اصرار نہ کیا۔ فوراً چلی گئی اور ماسی دیر تک وہیں بیٹھی رہی۔ دیئے کا تیل ختم ہو گیا۔ اور بتی بھی سُلگ سُلگ کر بجھ گئی۔ ماسی ابھی تک وہیں بیٹھی تھی۔

○

یہ خبر چوک دیوی دتا سے لے کر لوہاری منڈی تک پھیل گئی تھی کہ اللہ رکھی گجری کی بیٹی کا بیاہ داروغہ جی کے بیٹے سے ہو رہا ہے۔ اس خبر میں صداقت صرف اتنی تھی کہ اللہ رکھی کے اصرار سے پریشان ہو کر داروغہ جی کی بیوی فاطمہ نے مشروط رضامندی کا اظہار کر دیا تھا یعنی اگر داروغہ جی مان گئے تو اُسے سرودی کو اپنی بہو بنانے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ داروغہ جی اُن دنوں گھر میں تھے نہیں۔ میونسپل کارپوریشن کے کسی افسر کو اپنی زمینوں پر لے گئے تھے اور اُس کی خاطر مدارت میں مصروف تھے وہ جب لوٹ کر آئے اور انھیں اس بات کی خبر ملی تو انہوں نے یہ لفظ کہہ کر معاملہ ختم کر دیا کہ "بھاموا اس سے تو بہتر تھا کہ کسی کاتے سے اپنے بیٹے کا نکاح پڑھوا دیتی"۔ یہ دو ٹوک فیصلہ ایک سنسنی خیز خبر بن کر دیکھتے ہی دیکھتے کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ اللہ رکھی نے داروغہ جی کو بڑی خوفناک قسم کی بددعائیں دیں اور ان کی بیٹی کا یہ عالم ہو گیا گویا کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ وہ جہاں بیٹھی تھی وہیں بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ رات آگئی اور وہ زمین کے اُوپر ہی لیٹ گئی۔

اُس رات کا پچھلا پہر گزر رہا تھا۔ معراج دین گھر کی دہلیز پر کھڑا سوچ رہا تھا صبح تو ہونے ہی والی ہے اب لالٹینیں بجھا دوں اور وہ اپنا سامان لے کر باہر نکل آیا۔ چوک دیوی دتا کی لالٹین کا دروازہ کھولتے ہوئے اُس نے محسوس کیا کہ ایک سایہ اُس کے قریب سے گزر کر اندھیرے میں غائب ہو گیا ہے۔ اُس نے گزرنے والے سائے کو پہچاننے کے لیے لالٹین کی بتی اور اُوپر کر دی تاکہ روشنی کچھ بڑھ جائے لیکن جانے والا جا چکا تھا۔

ماسی کا دروازہ کھلا تھا اور اندر اندھیرا تھا اُس نے دیا نہیں جلایا تھا۔ دروازے کے پاس کھڑی تھی۔

"عنایت بی بی!" ہلکی سی آواز گونجی۔

"آگئے اکرام بابو"۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"ہاں تُو نے اسی وقت بُلایا تھا۔ پر گھر میں روشنی کیوں نہیں ہے؟"

"تاکہ تجھے کوئی دیکھ نہ سکے۔ بڑی عزتوں والا ہے نا، تو داروغہ جی کہلاتا ہے کوئی تجھے دیکھ لے تو؟"

"اکرام بابو!"

"ہاں عنایت بی بی!"

"ذرا اپنا ہاتھ اِدھر لا۔"

داروغہ جی نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔ جو ماسی کے ہاتھ کی انگشتِ شہادت سے چھونے لگا۔ ماسی نے یہ ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اسے اُوپر اُٹھایا۔ اور اُس کی انگلی کو اپنے گال کے داغ پر رکھ دیا۔

"اکرام!"

"تو کیا کہہ رہی ہے عنایت بی بی۔"

"جانتا ہے یہ کیا ہے۔ تُو نے مجھے دھکا دیا تھا اور یہ چوٹ لگی تھی اور جب اس سے لہو بہنے لگا تھا تو تُو رو پڑا تھا۔ تو نے کہا تھا عنایت بی بی! مجھے کالا ناگ ڈس جائے جو میں تجھ سے بے وفائی کروں۔ یاد ہے؟"

"بات کیا ہے؟"

"تُو نے بے وفائی کی ——— اپنا قول و قرار بھول گیا ———"

اُس نے داروغہ جی کی انگلی کو اپنے داغ پر ٹکا رکھا تھا اور وہ کہے جا رہی تھی "خیر مجھے تجھ سے کوئی شکایت نہیں۔ اللہ نے تجھ پر بڑا فضل کیا۔ میں خوش میرا خدا خوش پر دیکھ اکرام! مجھ پر ظلم کیا ہے۔ میری بچی پر نہ کر، وہ تیرے پتر سے سچا پیار کرتی ہے۔"

"سرور تیری بیٹی ہے؟" داروغہ جی نے طنزاً پوچھا۔

"میری دھی ہے ——— میری اپنی دھی ہے ——— اُس نے کہا تھا تو میری ماں ہے اچھا وعدہ کر۔"

"کس بات کا وعدہ۔"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"تو میری دھی کی خوشی نہیں چھینے گا!"

وہ خاموش تھا۔

"کیا سوچ رہا ہے۔ وعدہ کر۔ اگر وعدہ نہیں کرے گا تو مَیں مر جاؤں گی۔"

"تو کیوں مرے گی عنایت بی بی!"

"مَیں مر جاؤں گی۔"

داروغہ جی کی اُنگلی نیچے آنے لگی۔ یہاں تک کہ ماسی کے اُوپر کے ہونٹ تک پہنچ گئی۔ ے محسوس ہوا کہ یہ ہونٹ گیلا ہے۔

"عنایت بی بی! تُو رو رہی ہے۔"

"نہیں۔" ماسی نے سختی کے ساتھ دونوں آنکھیں بند کر لیں اور آنسوؤں کا رُکا ہوا ں گالوں پر بہنے لگا۔

چند لمحے دونوں خاموش رہے۔ پھر ماسی کے سارے شریر میں ایک لہر سی دوڑ ی۔ وہ تڑپ کر بولی:

"اکرام بابو! تُو نے وعدہ کر لیا ہے نا؟"

"اچھا۔" داروغہ جی نے کہا۔

"اللہ تیرا بھلا کرے، سدا سکھی رہے۔ پروردگار، تیری آل اولاد میں برکت دے۔"

داروغہ جی چلے گئے۔ اُسی وقت مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی اور ماسی نے ے کی طرف منہ کر کے اپنی جھولی پھیلا دی۔

لاہور پر بارش کا پہلا چھینٹا کیا پڑا ہوک دیوی رتا کے ایک گھر میں بجلی اور بادل ۔ ں کی کیفیتیں پیدا ہو گئیں۔ یہ گھر اللہ رکھی گجری کا تھا جس کے آنگن میں سر دری مار کھا کر ں کی طرح تڑپ رہی تھی اور اُس کا تایا ہاتھ میں موٹا ڈنڈا لیے بادل کی طرح گرج رہا تھا۔ سر دری تایا اپنی تنگ مزاجی اور غصیلے پن کی وجہ سے سارے کُنبے میں مشہور تھا۔ اُس کے غصّے کا بہت جلد ہی چڑھ جاتا تھا اور اس حالت میں وہ دیوانوں کی سی حرکتیں کرنے لگتا تھا۔ پھر جب اُس نے سُنا کہ اس کے چھوٹے بھائی کی بیٹی بیچ بازار کہتی پھر رہی ہے کہ اُس

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

کا بیاہ داروغہ جی کے بیٹے سے ہوگا تو اُسے یوں محسوس ہوا جیسے خاندان کی اس لڑکی نے دودھ سے بھری ہوئی بالٹی میں مُٹھی بھر کر چولہے کی راکھ ڈال دی ہے۔ اگر معاملہ ٹھیک ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ محلے کے لوگ اُسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیتے کہ لڑکی آخر جھوٹ کیا کہہ رہی ہے۔ اس کا بیاہ غفورے ہی سے تو ہو رہا ہے لیکن ہوا یہ تھا کہ داروغہ جی نے اس وجہ سے سروری کو اپنے ہاں لانے سے انکار کر دیا تھا کہ وہ ذات برادری سے باہر تھی اور اُس کی ذات برادری نے اُس کا حقہ پانی بند کرنے کی دھمکی دے دی تھی۔ سُننے والوں نے کہا کہ بے چارا مجبور ہے۔ مگر جاننے والے جانتے تھے کہ جس بڑے افسر پر اُس نے اپنے گاؤں میں درجنوں انڈے اور پندرہ مرغیاں قربان کر دی تھیں اُس نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر داروغہ جی کو کارپوریشن کے باغوں کا سپرنٹنڈنٹ بنوا دیا تھا اور داروغہ جی نے ترقی پا کر افسرِ اعلیٰ سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ اُس کی سینتیس سالہ بیوہ بہن سے اپنے لڑکے کی شادی کر دے گا۔ یہ خبر بہت ہی کم لوگوں کو معلوم تھی اور جن کو معلوم تھی وہ دل میں کہہ دیتے تھے۔ ہمیں کیا۔ دوسروں کے معاملے میں بھلا ہم کیوں دخل دیں۔

سروری تو زخموں سے اَدھ موئی ہو گئی۔ لیکن غفورے نے اپنی بہتری اسی میں سمجھی کہ باپ کے حکم پر چپ چاپ راولپنڈی اپنی پھوپھی کے ہاں چلا جائے اور وہاں جا کر پھوپھی پر زور ڈالے کہ ابا جی کو سمجھائے۔ اُسے امید تھی کہ اس کی پھوپھی اس سے بڑا پیار کرتی ہے وہ اس کی خواہش کا پورا پورا خیال کرے گی اور وہ چُپ چاپ راولپنڈی روانہ ہو گیا۔

اُدھر ماسی اپنی کوٹھڑی میں چراغ دین درزی کے نل کے نیچے ڈھیر سارے گندے برتنوں پر نظریں جمائے سوچ رہی تھی کہ یہ کیا ہو گیا ہے، کیسے ہو گیا ہے اور اب کیا ہوگا۔ وہ ہر وقت کھوئی کھوئی سی رہتی تھی۔ ہر کام یوں کرتی تھی جیسے بہت مصروف ہے اور ابھی اُسے کوئی ضروری کام کرنا ہے۔

دو روز بعد اُس کا بدن گرم رہنے لگا اور کھانسی کے شدید دورے پڑنے لگے۔ وہ سروری کے ہاں جانے کا ارادہ کرتی تھی مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ اس معاملے کو دو سرے روز پر ٹالتی رہی ... [illegible] ... کے پاس بیٹھ گئی۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

سروری کے زخم تیزی سے مندمل ہو رہے تھے لیکن ابھی اُٹھنے بیٹھنے کے قابل ہوئی تھی۔ اُس نے ماسی کو دیکھا تو ایک پھیکی سی مسکراہٹ سے اُس کا خیر مقدم کیا بھی اُس کے منہ سے کوئی بات نکلی ہی نہیں تھی کہ ماسی بولی:

"نی دھیے! مَیں تجھ سے بڑی شرمسار ہوں"

سروری اس بات کا مطلب نہ سمجھ سکی اور جب ماسی کچھ دیر بیٹھ کر چلی گئی۔ اُس وقت ماسی کے انہی لفظوں پر غور کر رہی تھی۔

ماسی کی طبیعت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ آس پاس رہنے والوں نے اس سے بتیرا وہ کسی حکیم یا ڈاکٹر کے ہاں چلی جائے مگر وہ راضی نہ ہوئی۔ جمعرات کی شام کو اُس کی بہت خراب ہو گئی۔ ان گھڑیوں میں اُس کے پاس چراغ دین درزی کی بیوی سرفراز تھی۔

ماسی نے اُسے ایسا اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اُس سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ سرفراز نے جھک کر اپنا کان اُس کے ہونٹوں سے لگا لیا۔

ماسی نے آہستہ آہستہ سے کچھ کہا اور پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ یہ آنکھیں ڈیڑھ دو کے بعد ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔

سروری نے ماسی کے انتقال کی خبر سُنی۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ بھاگ کر جائے اور آخری سی کی صورت دیکھ لے مگر جب وہ کھڑی ہوئی تو اُس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ وہ آہ بھر کر ئی پر لیٹ گئی۔

ماسی کی تجہیز و تکفین پر دارو غہ جی نے بہت خرچ کیا۔ انہوں نے اعلان کیا۔ یہ نہ کوئی ے کہ مرنے والی کا کوئی والی وارث نہیں تھا۔ مَیں اُس کا عزیز ہوں۔ اور محلہ داروں نے لی دلی ہمدردی اور غریب پروری کی بڑی تعریف کی۔

ماسی کے انتقال کے تیسرے روز بعد سرفراز ماسی کا پرانا چرخا لے کر سروری کے گھر میں

"ماسی نے وصیت کی تھی کہ یہ چرخا سروری کو دے دیا جائے۔"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

اللہ رکھی قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔

"کیا تحفہ دے گئی ہے ماسی"۔

سروری نے زندگی میں کبھی چرخے کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ لیکن دوسرے دن صبح سویرے چرخے کی ہتھی گھمانے لگی اور اس کے ہونٹوں پر وہی الفاظ جاری ہو گئے جو ماسی گایا کرتی تھی اور جنھیں وہ کئی بار چھپ کر سن چکی تھی۔

ہُن میتھوں کتیا نہ جاوے۔

ہُن میتھوں کتیا نہ جاوے۔

نکلے تُوں ول پے پے جاندے کون لوہار لیاوے۔

ہُن میتھوں کتیا نہ جاوے۔

نی میرئیے مائے ہُن میتھوں کتیا نہ جاوے۔

ہُن میتھوں کتیا نہ جاوے۔

اور دوپہر کے وقت معراج دین لوگوں کو قسمیں کھا کھا کر بتا رہا تھا کہ اس نے اللہ رکھی کے گھر سے دو آوازیں سنی تھیں ــــ ایک آواز سروری کی تھی اور دوسری ــــ"

"اور دوسری آواز کس کی تھی؟

پوچھنے والے بے تابی سے پوچھتے اور معراج دین اپنی اہمیت جتانے کے لیے مسکرانے لگتا۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

پیچ و خم

سارا دن اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہر کی گلیوں اور محلوں میں آوارہ گردی کے بعد جب
ج ٹو بے اُس نے ڈرتے ڈرتے، کانپتے کانپتے گھر کے دروازے پر اپنا پہلا قدم رکھا
جھانک کر دالان میں دیکھا تو اسے سب سے پہلے اپنی ماں نظر آئی جو روز کی طرح پانی کے
کے نیچے گندے کپڑوں کا ڈھیر لگائے بیٹھی تھی۔ ڈنڈا اس کے ایک ہاتھ میں تھا اور
رے ہاتھ سے وہ آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو پونچھتی جا رہی تھی یہ منظر کوئی نیا نہیں تھا۔
بیشں ماں کو روزمرہ اسی حالت میں دیکھتا تھا۔ کام کرتے کرتے اس کے ہاتھ یک لخت
جاتے تھے اور پھر یا تو وہ چُپ چاپ سر پر ہاتھ رکھے کافی دیر تک اسی حالت میں
رہتی تھی خاموشی کے ساتھ رونے لگتی تھی۔ وہ سوچتا تھا، سوچتا اور سوچ سوچ کر
اں کی عادت بن گئی ہے، مگر کبھی یہ سوال ضرور ایک کانٹے کی طرح اس کے ذہن میں
نے لگتا تھا کہ آخر میری ماں کو ہو کیا گیا ہے۔ اس کی یہ حالت کیوں ہے؟ محلے میں اور
مائیں ہیں۔ سب خوش خوش دکھائی دیتی ہیں۔ اپنے بچوں سے بڑا پیار کرتی ہیں، مگر یہ
ں ماں ہے کہ اسے رونے دھونے، بد دُعائیں دینے اور چُپ چاپ گھنٹوں بیٹھے رہنے
وا اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔ کوئی دن بھی ایسا نہیں گزرا جب میری ماں نے کوئی نہ کوئی
ستے ہوئے آنسو نہیں بہائے اور کسی نہ کسی بہانے مجھے بد دُعائیں نہیں دیں۔ وہ اپنی
ں اس عادت سے اس قدر بیزار ہو چکا تھا کہ اس کا جی بے اختیار چاہتا تھا کہ سب کچھ

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

چھوڑ چھاڑ کر کہیں دُور چلا جاتے اور پھر کبھی واپس نہ آتے۔ اس گھر میں اسے ملتا ہی کیا ہے! گالیوں اور بددُعاؤں کی بوچھاڑ اور طرح طرح کے طعنے۔ ہر روز گالیاں اور بددُعائیں سُن سُن کر اُس کے کان پک چکے تھے اور آج بھی اُسے یقین تھا کہ جیسے ہی ماں کی نظر اس پر پڑے گی، گالیوں کی بوچھاڑ شروع ہو جائے گی جو اُس وقت تک جاری رہے گی جب تک وہ اس کی نظروں سے دُور نہیں ہو جائے گا۔

ماں سوچ میں گم بیٹھی تھی۔ یہ موقع غنیمت تھا۔ اس نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا اور آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا کوٹھڑی کے اندر چلا گیا۔ بھوک سے بے تاب ہو رہا تھا۔ چولہے کے ارد گرد ورتیوں کی چنگیر ڈھونڈنے لگا۔ آٹے کے کنستر کے اُوپر چنگیر پڑی تھی اور پاس سالن کی ہانڈی بھی دکھائی دے رہی تھی۔

اس نے چنگیر میں سے روٹی لی، ڈوئی کے ساتھ ہانڈی میں سے چنے کی دال نکالی اور یہ دال، روٹی کے اُوپر ڈال دی۔ سالن برتن میں ڈالنا اس کے نزدیک محض ایک تکلف تھا۔ ویسے بھی اسے یہ فکر ستا رہی تھی کہ کہیں اس کی ماں اندر آ کر اُس کا سارا منصوبہ خاک میں نہ ملا دے۔

وہ جلدی جلدی لقمے نگلنے لگا۔ اس کے ہاتھ تیزی سے حرکت کر رہے تھے کہ اس کے کان میں ڈنڈے کی آواز آئی۔ اسے اطمینان ہو گیا کہ اب ماں سارے کپڑے دھو کر اور الگنی پر سُوکھنے کے لیے پھیلا کر ہی آئے گی۔ یہ سوچ کر اس کے ہاتھوں کی تیزی کافی حد تک کم ہو گئی۔

پوری روٹی پیٹ میں اُتارنے کے بعد اس کی بھوک ختم ہو گئی۔ چولہے کے پیچھے تانبے کا گلاس پڑا تھا اور پانی کا گھڑا باہر تھا۔ اس نے گلاس اُٹھایا اور جس انداز سے کوٹھڑی کے اندر آیا تھا، اسی انداز سے باہر گیا۔ گھڑے میں سے گلاس بھرا اور دوبارہ کوٹھڑی میں آ گیا۔

اس کا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ اب وہ بے فکر ہو گیا تھا۔ ماں باہر تھی، روٹی پیٹ میں تھی اور فی الحال کسی قسم کی اُلجھن اسے پریشان نہیں کر رہی تھی۔ وہ ایک فلمی گیت گنگنانے لگا۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

رات دن بیلی پڑی رہتی ہے یوں
اپنے پہلو میں چھپائے دردِ دل

یکایک اس نے آواز روک لی ـــــ آنکھیں بند کر لیں، ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے۔ اس کی چھٹی حس نے اسے بتا دیا تھا کہ ماں کوٹھڑی کے اندر آرہی ہے اور ماں سچ مچ اندر آگئی۔ اندر آتے ہی وہ اس کی چارپائی کی طرف قدم اٹھانے لگی۔

اس نے اپنی طرف سے اتنی احتیاط برتی تھی کہ سانس تک روک لی تھی، مگر جیسے ہی ایک گرم گرم شے اس کی پیشانی پر آگری، تو وہ بے چین ہو گیا۔ اس نے اندازہ لگا لیا کہ اس کی ماں رو رہی ہے ـــــ وہ اٹھ بیٹھا۔

"اماں!" اس نے غنودگی کے عالم میں ماں کو مخاطب کیا۔

اسے توقع تھی کہ گالیوں اور طعنوں کا طوفان آجائے گا، لیکن ایسا نہ ہوا۔ ماں نے اسے آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا اور بڑے پیار سے بولی:

"برکت! روٹی نہیں کھائی؟"

"کھائی ہے اماں!"

اماں اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ برکت نے محسوس کیا کہ ماں کے منہ سے جو سانس نکلا ہے وہ گرم ہے۔ ماں اپنے مخصوص انداز میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

"وے برکتا!" پیار کے لمحوں میں وہ اسے اسی طرح مخاطب کیا کرتی تھی۔

"جی اماں!"

"اللہ جانے سارا دن کہاں رہتے ہو۔ پاؤں کے چھالے کا کیا حال ہے؟"

برکت نے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا۔ ماں کی آنکھیں آنسوؤں سے نم آلود تھیں اور گالوں پر جا بجا دھبے سے نظر آرہے تھے۔

"پاؤں دکھاؤ۔"

"ٹھیک ہوں اماں!"

"کرماں مارے دکھا تو!"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

ماں کے اصرار پر اس نے اپنا دایاں پاؤں آگے بڑھا دیا۔ ماں نے نیچے زمین پر بیٹھ کر اس کا پاؤں دونوں ہاتھوں سے اُوپر اٹھایا اور اس کے چہرے پر غم و اندوہ کے سائے گہرے ہو گئے۔

"ہاں میں مر جاواں"۔

اماں اب تو ٹھیک ہو گیا ہے"۔

ماں نے پھر رونا شروع کر دیا۔ برکت نے پاؤں زمین پر رکھ دیا۔

" تم سب لوگ ہاتھ دھو کر میری جان کے پیچھے پڑے ہو"۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

" اماں! یہ چھوٹا سا تو۔"

" نامراد! چھوٹا چھالا ہی بڑا ہو جاتا ہے۔ پھر ڈاکٹر اپریشن کرتا ہے"۔

ماں کے ہاتھ اس کے دوپٹے سے لگا، تو دوپٹے پر سُرخ دھبہ پڑ گیا۔ اب برکت کو معلوم ہوا کہ ماں کے ہاتھ سے لہو نکل رہا ہے۔

" اماں! تیرا ہاتھ ـــــ" وہ سراپا استفہامیہ نشان بن گیا تھا۔

" کپڑے دھو دھو کر ہاتھوں کا یہ حال ہو جاتا ہے۔ پر اس سے کیا ہوتا ہے۔ معمولی بات ہے"۔

" اماں! تُو اتنے سارے کپڑے کیوں دھوتی ہے"؟

ماں نے تیز تیز نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ بیری سے ٹوٹی ہوئی ٹہنی کی طرح سیاہ پڑ گیا۔ وہ کئی لمحے چُپ چاپ اسے دیکھتی رہی اور پھر اس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ آگئی جیسے اندھیرے میں کوئی مدھم دِیا اپنے سینے سے بصد مشکل روشنی نکال رہا ہو۔

" کیوں دھوتی ہے اتنے سارے کپڑے"؟ برکت نے اپنا سوال دُہرایا۔

" کیوں دھوتی ہوں ۔ تُو نہیں جانتا"؟

" نہ دھویا کرو"۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ہوا چلنے سے جیسے موم بتی کی لَو تھرتھرا اُٹھے، ماں کے ہونٹ حرکت کرنے لگے، مگر وہ الفاظ اس قدر دھیمے لہجے میں کہہ رہی تھی کہ وہ کچھ بھی نہ سُن سکا۔

اس نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا اور ماں کا ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس کی ہتھیلی سُوجی ہوئی تھی اور بڑی انگلی جس جگہ سے شروع ہوتی تھی وہاں سے ابھی تک خون رِس رہا تھا۔

اس کے اندر خون کھولنے لگا۔

"اماں! تُو کپڑے نہیں دھوئے گی — تُو ان کی نوکر نہیں ہے — تُو —"

ماں نے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑا لیا۔

"پر تجھے کیا؟" وہ اس کا فقرہ کاٹ کر بولی۔ "ماں مرتی ہے، تو مر جائے تیری بَلا سے! ساری دنیا کے دُکھ میرے لیے ہیں۔ اللہ جانے کیا گناہ کر بیٹھی ہوں کہ نصیبوں جلی کو موت بھی نہیں آتی۔ آ جائے تو جان عذاب سے چھوٹ جائے۔"

یہ فقرہ سُن کر اس کے دل پر ایک گھونسہ سا لگا اور وہ گھبرا کر چارپائی سے اُٹھ بیٹھا۔ ماں کے جذبات کا دھارا نہ جانے اب تک کہاں رُکا رہا تھا اور اب بہہ نکلا تھا۔ وہ دل میں خوف زدہ تھا کہ اگر کچھ کہا، تو قیامت برپا ہو جائے گی۔ وہ چُپ چاپ کھڑا رہا اور اِدھر ماں کے آنسو تھے کہ رُکنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ اس کے آنسوؤں کے ساتھ اس کے ہونٹ بھی مسلسل حرکت کر رہے تھے۔

"فجر کی نماز کی بانگ ہوتی ہے، تو کام کرنے لگتی ہوں۔ کونسا کام ہے جو میں نہیں کرتی۔ اس پر بھی ان لوگوں کو شرم نہیں آتی۔ ذرا ذرا سی بات پر طعنے دے دے کر زندگی حرام کر دیتے ہیں اور وہ تمہاری چاچی:"

برکت کا جی چاہا کہ فوراً ماں کے منہ پر ہاتھ رکھ دے۔ وہ ڈرتا تھا کہ اگر اس کی چچی نے ایک لفظ بھی سُن لیا، تو وہ کنبے کے زندہ یا مُردہ کسی کو بھی معاف نہیں کرے گی۔ مگر وہ ماں کے غصّے سے بھی ڈرتا تھا۔ اور تو کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آئی، فوراً کہنے لگا:

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"اماں! ہاتھوں پر گھی لگا لے، آرام آجائے گا۔"

مگر ماں کب رُکنے والی تھی۔ جھولی پھیلا کر اور اُوپر دیکھتے ہوئے بولی:

"اللہ کرے مہتاب بی بی، تیرا بیڑا غرق ہو جائے۔ کیڑے پڑ جائیں تیرے بدن میں۔"

مہتاب بی بی، برکت کی چچی کا نام تھا۔

اس کا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ کئی بار اس نے اپنی ماں اور اپنی چچی کے درمیان لڑائی کا معرکہ دیکھا تھا اور ایسے موقع پر وہ سخت پریشان ہو جاتا تھا اور ان لمحوں میں بھی ہونے والی لڑائی کا نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھر رہا تھا۔

ماں بولتے بولتے تھک گئی تھی، کیونکہ وہ خلافِ توقع خاموش ہو گئی تھی۔

برکت بڑی بے چینی سے اُس طوفان کا انتظار کر رہا تھا جو ابھی سمندر کی تاریک گہرائیوں میں شاید اپنی طاقت مجتمع کر رہا تھا۔ طاقت مجتمع کرنے کے بعد وہ سر اُٹھائے گا اور ایک ایسا ہنگامہ برپا ہو جائے گا کہ اس کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے اور پھر وہ ساری رات سو نہیں سکے گا۔

ماں اور بیٹا دونوں ایک دوسرے کے سامنے ایک ڈیڑھ فٹ کی مسافت پر کھڑے تھے۔ ماں اُسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی اور بیٹا بغیر ارادے کے اپنا دایاں ہاتھ سر کے بالوں میں پھیر رہا تھا۔

ماں نے جُھرجُھری سی لی۔ دوپٹے کے پلّو سے آنسو اور ناک خشک کی اور اپنا دایاں ہاتھ برکت کے سر پر رکھ دیا۔ برکت اس غیر متوقع کارروائی پر حیران رہ گیا۔

"برکت!"

برکت نے اثبات میں سر ہلانے کی کوشش کی۔

"وے برکتا!"

ماں کا دل پیار سے بے تاب ہو گیا تھا۔

"جی اماں!"

"برکتا! وے برکتا! تیری غیرت کدھر گئی ہے؟ تجھے اپنی ماں کی عزّت کا خیال نہیں

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

ہے؟ بول ناں۔ دے برکتا! بول ناں"۔

ماں نے اس کے سَر سے ہاتھ الگ کر لیا۔

"تیرے باپ کو مَرے تین سال اور سات مہینے ہو گئے ہیں۔ ہائے وہ کیا منحوس دن تھا جب وہ ہمیں تیری چاچی اور چاچے کے حوالے کر کے آپ قبر میں جا سویا تھا۔ وہ دن اور آج کا دن مصیبت ختم ہی نہیں ہوتی۔ کبھی سارا شہر ہماری عزت کرتا تھا، پر آج ہم گلیوں کے تنکے ہیں۔ نہیں، تنکے ہم سے سو درجہ اچھے ہیں"۔

ماں نے انگلیوں سے آنسو پونچھے جو پھر آنکھوں سے نکل کر گالوں پر آ گئے تھے۔

"اماں! چاچی بڑی بُری عورت ہے"۔ اس نے ہمّت کر کے کہہ ہی دیا۔

"پر ہم اس کے گھر میں بیٹھے ہیں"۔

کیا بیٹے کو یہ بات معلوم نہیں تھی جو وہ اسے بتا رہی تھی۔ اس کے جواب میں وہ کیا کہہ سکتا تھا؟ ماں کہنے لگی:

"برکتا! اب تُو کوئی بچّہ نہیں ہے۔ اللہ رکھے تیرہ چودہ برس کا ہو گیا ہے۔ اگر تُو کہیں نوکر ہو جائے اور ہمیں روٹی کپڑے کی فکر نہ رہے، تو اللہ جانتا ہے میں اس گھر میں ایک دن بھی نہ رہوں۔ یہ سب کچھ تیری وجہ سے ہو رہا ہے۔ یہ ساری مصیبت تیری وجہ سے ہے۔ میں کیا کہہ رہی ہوں برکتا؟"

"تُو ٹھیک کہہ رہی ہے اماں!"

"ہائے اللہ! وہ دن کتنا اچھا ہوگا، جب تُو مجھ سے آکر کہے گا اماں میں نوکر ہو گیا ہوں۔ مکان کرائے پر لے لیا ہے، چل میرے ساتھ، نکل اس گھر سے۔ ہائے، تیرے منہ سے یہ بات کب سُنوں گی؟"

اب ماں کا حلق سُوکھ گیا تھا۔ وہ چارپائی پہ گر پڑی۔ اس کا مُرجھایا ہوا چہرہ زرد پڑ چکا تھا۔

آدھی رات ہو گی جب اس کی آنکھ کُھل گئی۔ ماں اس کی چارپائی سے ذرا دُور لیٹی ہوئی تھی۔ فضا میں بارھویں یا تیرھویں کا چاند چمک رہا تھا اور اس کی روشنی، روشندان میں

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

سے گزر کر کمرے کے اندر آ رہی تھی۔ اس روشنی میں اس نے ماں کی طرف دیکھا اور سہم سا گیا۔ اسے ماں کا چہرہ بہت زیادہ زرد دکھائی دے رہا تھا۔

فرطِ جذبات سے اس کے دماغ کی رگیں تن گئیں۔ گلا خشک ہو گیا۔ سر میں کانٹے سے چبھنے لگے۔ اس سے پہلے کبھی اس کی ایسی حالت نہیں ہوئی تھی۔

وہ دل میں اپنے آپ پر لعنت بھیجنے لگا۔ ماں نے بالکل سچ کہا ہے۔ وہ میری وجہ سے دُکھی ہے۔ مَیں بچّہ نہیں۔ تیرہ چودہ برس کا ہو گیا ہوں۔ مَیں کیا کر رہا ہوں۔ آوارہ گردی۔ مَیں نے ماں کو بڑا دُکھ پہنچایا ہے۔

ماں نے کروٹ بدل کر چہرہ دوسری طرف کر لیا اور وہ اُٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"ہائے!"

کیا یہ اس کی ماں کی آواز تھی۔ اسی نے 'ہائے' کہا ہے۔ بے چاری سوتے میں بھی ہائے ہائے کر رہی ہے۔

نہ جانے وہ کس وقت تھک کر لیٹ گیا اور کس وقت نیند اس کی آنکھوں میں آ گئی۔ صبح جب سُورج کی کرنیں روشندان کے راستے سے اندر آ رہی تھیں اور اس کے چہرے کو چُھو رہی تھیں، تو وہ جاگ اُٹھا۔ ماں اپنی چارپائی پر نہیں تھی۔ باہر کام کر رہی تھی۔ ماں سے کچھ کہے بغیر وہ گھر سے باہر نکل گیا اور اپنے دوست منیر کے گھر جا پہنچا۔ منیر کا ابّا کرسی پر بیٹھا حقّہ پی رہا تھا۔

"چاچا جان، سلاماں لیکم۔"

"وعلیکم السلام۔ آؤ برکت! آنکھیں سُرخ ہو رہی ہیں۔ رات سوئے نہیں تھے؟"

برکت نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔

"چاچا!"

"کہو! کیا بات ہے؟ ماں اور پھوپھی میں لڑائی ہوئی ہے؟ مگر پُتّر! یہ تو ہوتی ہی رہتی ہے۔"

"چاچا! مَیں آپ کے پاس آیا ہوں۔"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"میں دیکھ رہا ہوں تم آئے ہو۔ صاف صاف کہو، کہنا کیا چاہتے ہو"؟ منیر کے ابا نے اسے گھور کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں نوکری کرنا چاہتا ہوں"۔

"تم — نوکری —" منیر کا ابا ہنسنا چاہتا تھا، مگر وہ سوال اس کے حلق میں پھنس گیا اور وہ بے تحاشا کھانسنے لگا۔

"ہاں چاچا! میں نوکری کروں گا۔ چاچا کے گھر میں ہم گلیوں کے تنکے بن گئے ہیں۔ تنکے بھی ہم سے سو درجہ اچھے ہیں"۔ برکت نے ماں کے الفاظ دہرا دیے۔

منیر کا ابا اسے بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

کئی لمحے خاموشی طاری رہی۔

"کیسی نوکری کرو گے"؟ منیر کے ابا نے اس پر شکوک انگیز نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔

"جیسی بھی مل جائے"۔

"میرے پریس میں ایک آدمی کی ضرورت ہے جو بازار سے ضرورت کی چیزیں خرید لایا کرے"۔

"اچھا"۔

"آدمی بڑا ایمان دار چاہیے۔ روپے پیسے کا معاملہ ہے"۔ منیر نے اسے اپنی طرف سے آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ "کر لو گے"؟

"اچھا جی"۔

منیر کا ابا اسے دیکھتا رہا اور برکت کے چہرے پر عزم و ارادہ کی پختگی لمحہ بہ لمحہ نمایاں ہوتی گئی۔

"اچھا۔ کل صبح منیر کو ساتھ لے کر پریس آ جانا۔ پتہ ہے نا پریس کہاں ہے"؟

برکت نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

بات ختم ہو گئی۔ برکت نے طے کر لیا کہ جب تک مکان کی چابی اس کے ہاتھ میں نہیں آ جاتی، وہ اپنی ملازمت کے بارے میں ماں سے ایک لفظ تک نہیں کہے گا

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

اور جب کرائے پر کوئی مکان مل جائے گا۔ تو وہ چابی اس کے قدموں میں پھینک کر کہے گا۔
"اٹھو اماں! اب ہمارا یہاں کوئی کام نہیں"
برکت صبح سویرے نکل کر پریس میں چلا جاتا اور شام تک کام کرتا رہتا۔ منیر کا ابا حیران تھا کہ اس میں ایسی تبدیلی کیونکر آگئی ہے اور دوسری طرف اس کی ماں سمجھ رہی تھی کہ اس کا بیٹا حسبِ معمول آوارہ گردی کرتا رہتا ہے اور اس کی مصیبت کا اس پر ذرہ برابر بھی اثر نہیں ہوا۔
روزانہ بارہ سے ایک بجے تک پریس کے کارکنوں کو روٹی کھانے کے لیے چھٹی مل جاتی تھی۔ اس وقت برکت گھر کی تلاش میں مصروف ہو جاتا تھا۔ پندرہ بیس دن کی جدّ و جہد کے بعد اسے ایک گلی میں ایک چھوٹا سا مکان مل گیا۔ اسی وقت وہ بھاگا بھاگا پریس پہنچا اور تنخواہ میں سے ایڈوانس رقم لے کر مالکِ مکان کو کرایہ ادا کر دیا۔ ہاتھ میں چابی لیے جب وہ گھر کی طرف چلا، تو اس کا جی چاہتا تھا کہ اسے پر لگ جائیں اور وہ اسی لمحے ماں کے پاس پہنچ جائے۔ آج ماں کس قدر خوش ہو گی۔ اس خیال نے اس کی ٹانگوں میں بجلی سی بھر دی تھی۔
جب وہ گھر کے اندر پہنچا، تو اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ماں کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔
"کوٹھڑی میں ہو گی۔ اس نے سوچا اور واقعی ماں کوٹھڑی میں کھڑی تھی اور اپنا دوپٹہ کس کر سر کے ارد گرد لپیٹ رہی تھی۔ چچی سے لڑائی کے بعد اس کے سر میں شدید درد ہونے لگتا تھا اور اس حالت میں وہ اپنا دوپٹہ سر پر باندھ کر چارپائی پر لیٹ جاتی تھی۔
"اب تو فکر کی کوئی بات ہی نہیں" اس نے دل میں کہا اور ماں کے سامنے چلا گیا۔
"اماں!" فرطِ مسرت سے اس کی آواز لرز رہی تھی۔
ماں نے اسے دیکھا اور انگلیوں سے آنسو صاف کرنے لگی۔
"اماں! تیری میری مصیبت ختم ہو گئی ہے۔ مکان لے لیا ہے۔ یہ ہے چابی"
اس نے چابی ماں کی طرف پھینک دی۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"اور میں نوکر ہو گیا ہوں اماں ۔ اماں میں نوکر بھی ہو گیا ہوں۔" اس نے دوبارہ یہ فقرہ ہا تاکہ ماں کو پوری طرح اپنا مطلب سمجھا سکے۔

ماں دو چار لمحے اسے گھورتی رہی اور اپنے سینے پر دو ہتڑ مار کر چیخ اٹھی:

"ہائے اللہ! ان دشمنوں نے میرے معصوم بچے کو کیا پڑھا دیا ہے۔ اب گھر سے بھی نکال رہے ہیں۔ بے شرم! تو چاچا چا چاچی کی باتوں میں آ گیا ہے۔ اللہ کرے مارا جنازہ نکل جائے۔ ہمیں کسی کی آئی آ جائے۔ ہمیں گھر سے دھکے دے رہے ہیں۔"

اور وہ زور زور سے سینے پر دو ہتڑ مارنے لگی اور برکت اسے یوں دیکھ رہا ھا جیسے کوئی بھیانک سپنا دیکھ رہا ہو۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

دُشمنی

یہ اس زمانے کی بات ہے جب پنجاب کے بہت سے علاقے سیلاب کی زد میں آ چکے تھے۔ بارش تھی کہ تھمنے کا نام ہی نہ لیتی تھی اور ندی نالے تھے کہ بڑی بیدردی کے ساتھ ادھر اُدھر پھیل کر شہریوں اور دیہاتیوں کو شدید نقصان پہنچا رہے تھے۔ ہر روز یہ دہشت ناک خبر ملتی تھی کہ کل فلاں گاؤں تباہ ہو گیا ہے اور آج پانی کا رُخ فلاں شہر کی جانب ہے۔

انہی دنوں ضلع شیخوپورہ کے ایک غیر معروف گاؤں سبحان پورہ سے خط کے ذریعے یہ خبر ملی کہ خان محمد کی حالت بہت خراب ہے اور وہ دو ایک روز کا مہمان ہے۔ یہ خط اس کے سب سے چھوٹے بیٹے نے لکھا تھا اور اس کے ساتھ لڑکے نے یہ اطلاع بھی دے دی تھی کہ چاچا مرنے سے پہلے اپنے قریبی دوستوں سے ملنے کے بڑے خواہشمند ہیں۔

خان محمد سے میرے ذاتی تعلقات تو نہیں تھے مگر دو تین بار جب میں اپنے ایک دُور کے رشتہ دار کی اراضی پر گیا اور خان محمد سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے میری بڑی عزّت کی، اصرار کر کے گھر لے گیا، لذیذ کھانوں سے تواضع کی اور چند روز کے قیام کے بعد میں لاہور واپس آ گیا تو اس کی طرف سے کبھی کبھی مکھن، گھی اور میٹھی روٹیوں کے تحفے ملنے لگے۔ اس کے لیے مَیں اس کا ممنونِ احسان تھا اور اسی احسان مندی کا احساس تھا جس نے مجھے فوراً سفر اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

بارش کے دنوں میں سفر، وہ قریب سے قریب علاقے ہی کا کیوں نہ ہو۔ ایک

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

مسئلہ بن جاتا ہے اور مجھے تو ایک دور دراز گاؤں میں پیدل چل کر پہنچنا تھا۔ بارش ہو رہی تھی اور میں کھڑکی سے باہر بار بار بجلی کو چمکتے ہوئے دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ خان محمد کی خواہش پوری کرنی بھی ضروری ہے اور بارش میں باہر نکلنا بھی بڑا مشکل ہے۔

اتفاق یہ ہوا کہ دن کے دوسرے پہر بارش تھم گئی اور ساری رات تھمی رہی۔ صبح مطلع صاف تھا۔ اب گھر میں رُکے رہنے کی کوئی وجہ جواز نہیں تھی۔ چنانچہ میں مختصر سا سامان لے کر سیدھا سٹیشن پہنچا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

گاڑی کو صرف ایک جگہ رکنا پڑا اور وہ بھی آدھ گھنٹے کے لیے۔ اور جس وقت شیخوپورہ کے سٹیشن پر گاڑی رکی تو سوا دس ہو چکے تھے۔

خدشہ تھا کہ پیدل سفر کرنے سے بڑی دشواریاں پیش آئیں گی مگر اس وقت کسی کو میرے آنے کی اطلاع بھی نہیں تھی ورنہ سٹیشن کے باہر کوئی تانگہ یا گھوڑا میرے انتظار میں کھڑا ہوتا۔ چونکہ یہ معاملہ بعید از قیاس تھا میں نے ایک طرف چلنا شروع کر دیا۔

راستے میں دو تین جگہ پانی میں سے گزرنا پڑا۔ پتلون کے پائنچے بھیگ گئے۔ تاہم میں آدھ پونے گھنٹے میں اس لمبی گلی کے اندر داخل ہو گیا جو اس زمانے میں گلی جیٹھاں کہلاتی تھی۔ خان محمد کا مکان اس گلی کے آخر میں تھا اور پیپل کے ایک پرانے درخت کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔

ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ کانوں میں ایک آواز آئی "بابو آ گئے ہو"۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ گلی کے باہر پچاس ساٹھ سالہ پرانی مسجد کے دروازے پر مولوی جی کھڑے تھے اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلا رہے تھے۔

مولوی صاحب کا پیدائشی نام عبدالحکیم تھا لیکن گاؤں کے سب لوگ انہیں مولوی صاحب ہی کہتے تھے۔ میری ان سے پہلی ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب کم و بیش بیس برس پیشتر وہ کوہاٹ سے لاہور آئے تھے اور مولوی فاضل کا امتحان دینا چاہتے تھے۔ یونیورسٹی اورنٹیل کالج کے ہوسٹل کے ایک کمرے میں وہ ٹھہرے اور اس سے ملحقہ کمرے میں میرے ایک دوست علی رضا ہوتے تھے اور میں علی رضا کے ہاں دوسرے

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

تیسرے روز جایا کرتا تھا۔ ایک روز عبدالحکیم سے گفتگو کا موقع ملا تو ہمارے درمیان ایک ایسا تعلق خاطر قائم ہو گیا کہ جب وہ امتحان پاس کر کے شیخوپورہ کے اس گاؤں کی بڑی مسجد میں پیش امام بن گئے تو ان سے خط و کتابت ہونے لگی۔ خط مہینوں کے بعد آتے جاتے تھے۔ تاہم مراسلت جاری رہی۔

مولوی صاحب عمر کے اس حصے میں پہنچ چکے تھے جسے بڑھاپا کہتے ہیں مگر بڑھاپے کے آثار ان میں دکھائی نہیں دیتے تھے۔ صحت تو ان کی کچھ اچھی نہیں تھی مگر ان کے اندر زندگی اور زندگی کی بڑی تاب و توانائی تھی۔ گھریلو جھمیلوں سے بچتے تھے اس لیے جب پہلی بیوی دو سال کے بعد مر گئی تو انہوں نے نکاح ثانی کے ذکر سے کانوں پر ہاتھ رکھنا شروع کر دیا۔ دوبارہ گھر آباد نہ کر سکے، تاہم گاؤں کی مسجد اس طرح آباد کی کہ لوگ دور دور سے وہاں آنے لگے اور یوں مولوی صاحب نے بائیس تیئیس برس کی مدت وہاں گزار دی۔

میں مولوی صاحب کے پاس چلا گیا۔

"میں جانتا تھا تم ضرور آؤ گے۔ خان محمد تمہارا انتظار نہیں کر سکا۔ صبح چار بجے اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ خیر ٹھیک وقت پر تم آ گئے ہو۔ اچھا کیا ہے۔"

"جی آ گیا ہوں۔"

"مگر جنازہ چار پانچ بجے سے پہلے نہیں اُٹھے گا۔ خان محمد کا بڑا لڑکا منٹگمری گیا ہوا ہے۔ اسے تار بھیج دیا ہے چار سے پہلے کہاں پہنچے گا؟"

مولوی صاحب نے دو تین لمحے توقف کرنے کے بعد مجھے اطلاع دی۔

"ظہر کی نماز میں ابھی کافی وقت پڑا ہے۔ آ جاؤ میرے حجرے میں۔"

مولوی صاحب کے حجرے میں مسجد کی بیرونی طرف سے دروازہ کھلتا تھا ہم مسجد سے نکل کر چند قدم چلنے کے بعد ایک بوسیدہ دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔ انہوں نے جیب سے چابی نکالی، حجرے کا دروازہ کھولا اور میں ان کے پیچھے ایک کوٹھڑی میں داخل ہو گیا۔

دیوار کے ساتھ ایک جھلنگا چارپائی بچھی تھی جس کا بستر تہہ کر کے تکیے کے اوپر

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

دیا گیا تھا۔ تکیے کے اُوپر دیوار میں سے نکلی ہوئی ایک بڑی سی کیل کے ساتھ جو لٹین ٹنگی ہوئی تھی۔ اس کا شیشہ دھوئیں سے سیاہ ہو چکا تھا۔ غالباً اس سے بڑی مدہم سی چھوٹتی ہو گی۔ زمین پر ایک پرانا مصلّے بچھا تھا جس کے ایک طرف ایک ڈیسک دکھائی دے رہا تھا۔ اس ڈیسک کے اُوپر چند کتابیں، کچھ کورے کاغذ اور قلم پڑے تھے چارپائی کے نیچے سرہانے کی جانب دو کنستر اور ایک ٹرنک نظر آ رہا تھا۔ یہ تھی کل کائنات مولوی صاحب کے حجرے کی۔

مولوی صاحب نے میری خاطر چارپائی پر بستر بچھانا شروع کر دیا۔

"نہیں مولوی صاحب! اس کی ضرورت نہیں۔ میں یہاں بیٹھوں گا۔"

"بھئی مہمان ہو اور مہمان کی عزت کرنا میزبان کا فرض ہوتا ہے۔"

"میں خود کو مہمان نہیں سمجھتا مولوی صاحب" اور میں مصلے کے اُوپر بیٹھ گیا۔ مولوی صاحب نے چارپائی پر سے تکیہ اُٹھا کر چارپائی کے ایک پائے کے ساتھ لگا دیا کہ میں اس کے ساتھ پشت لگاؤں اور میں نے تکیے کے ساتھ پشت لگا دی۔ مولوی صاحب میرے قریب بیٹھ گئے۔

"یہ بارش نہیں خدا کا قہر ہے۔" مولوی صاحب دروازے کے باہر فضا میں پانی سے بھرے بادلوں کو متوحش نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"بڑی تباہی ہو چکی ہے۔" میں نے ان کی تائید کی "اور اگر بارش پھر شروع ہو گئی تو؟" میں نے فکرمندانہ انداز میں کہا۔

مولوی صاحب نے ایک آہ بھری۔

"مرنے والے کو بارش کی کیا فکر اسے تو بہرحال دفن کرنا ہو گا۔ موسلا دھار بارش ہو سیلاب آ جائے۔" مولوی صاحب نے بالکل درست کہا تھا اور میں نے اثبات میں سر ہلا کر ان کی تائید کی۔

مولوی صاحب ابھی تک باہر دیکھ رہے تھے۔

"زبردست طوفان آنا ہی چاہیے تھا شاید۔"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"وہ کیوں ؟"

"پوچھتے ہو وہ کیوں! خان محمد کو تم جانتے نہیں تھے۔ کتنا زبردست آدمی تھا۔ مگر یہ زبردستی دشمنی میں تھی، دوستی میں نہیں۔"

میں نے اندازہ لگا لیا کہ مولوی صاحب نے یہ لفظ ایسے لہجے میں کہے تھے جس سے ان کا اندرونی کرب جھلک رہا تھا۔

"بابو! میں اس معاملے میں بالکل ناکام رہا ہوں۔"

مولوی صاحب کے اس جملے سے میں نے فی الفور سمجھ لیا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ واقعہ یہ تھا کہ انہوں نے بارہا کوشش کی کہ خان محمد اور رستم علی کے درمیان خونخوار قسم کی دشمنی کا جو زہر پھیل گیا ہے وہ ختم ہو جائے مگر ہر بار یہ زہر بڑھتا چلا گیا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو تباہ و برباد کرنے کی ہر وہ کوشش کی جو ان کے حیطۂ اختیار میں تھی۔ یہاں تک کہ ایک بار خان محمد نے خود اپنے مکان کو جلا کر خاکستر کر دیا اور الزام اپنے دشمن پر لگا دیا کہ اس نے اس کے مکان کو آگ لگا دی ہے۔ رستم علی بھی دشمنی میں اس سے پیچھے نہیں رہا تھا۔ اس نے کئی بار اپنے حریف کی لہلہاتی ہوئی فصلوں کو راتوں رات جلا دیا تھا۔ دونوں نے چھپ چھپ کر ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتارنے کا بھی اقدام کیا تھا لیکن دونوں باری باری شدید زخمی ہو گئے۔ مرے نہیں۔

ان میں دشمنی کی ابتدا اس واقعے سے ہوئی تھی کہ رستم علی کی بہن خان محمد کے خالہ زاد بھائی علاؤالدین عرف للو سے کے ساتھ بیاہی گئی تھی۔ علاؤالدین کوئی اچھے کردار کا آدمی نہیں تھا۔ پہلے بھی دو بیویوں کو طلاق دے چکا تھا مگر تھا صاحبِ ثروت آدمی اس لیے رستم علی بھی اپنی بہن کی شادی اس کے ساتھ کر دینے پر رضامند ہو گیا۔ توقع تھی کہ علاؤالدین رستم علی کے اثر و رسوخ کی وجہ سے ایسی حرکت نہیں کرے گا جو وہ پہلے کر چکا ہے مگر یہ توقع پوری نہ ہو سکی۔ علاؤالدین نے بیوی کو بہت بری طرح مارا اور صغراں روتی چیختی ہوئی اپنے میکے میں آ گئی۔ گاؤں میں علاؤالدین کے اس فعل کو قابلِ نفرت سمجھا گیا لیکن خان محمد نے اپنے خالہ زاد بھائی کا ساتھ دیا اور رستم علی کی بہن پر بدچلنی کا الزام

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mehar M. Mazhar Kathia|03037619693

لگا دیا۔ رستم علی نے خان محمد کے اس رویے کو دشمنی پر محمول کیا اور اسے اپنی خاندانی عزت و آبرو کا قاتل تصور کرنے لگا۔ خان محمد کیونکر پیچھے رہ سکتا تھا۔ اس نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ صغراں کو طلاق ہو گئی اور اس کے ساتھ رستم علی اور خان محمد کے درمیان ایک ایسی دشمنی پرورش پانے لگی جسے دُور دُور کے گاؤں میں بھی بطور مثال کے پیش کیا جاتا تھا۔

دونوں کے درمیان انیس برس سے بھرپور دشمنی چلی آ رہی تھی۔ دونوں اس مدت میں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے رہے اور جن طریقوں سے وہ باہمی عداوت کا ثبوت دے رہے تھے ان سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ انیس برس اور بھی زندہ رہتے تو ان کی دشمنی میں کوئی فرق نہیں آئے گا مگر ہوا یہ کہ رستم علی چھ ماہ پہلے دردِ قولنج کے شدید حملے میں سیڑھیوں سے اترتے وقت گر کر مر گیا اور اس کا حریف میرے گاؤں میں پہنچنے سے چند گھنٹے پیشتر دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔

مولوی صاحب سر جھکائے نہ جانے کیا سوچ رہے تھے کہ میں نے کہا :

"مولوی جی ! دونوں دشمن مر گئے۔"

مولوی صاحب نے یا تو میری بات سنی نہیں یا سنی ان سنی کر دی۔ بدستور اپنی سوچ میں ڈوبے رہے۔

بادل زور سے کڑکا۔ مولوی صاحب نے سر اٹھا کر باہر دیکھا۔

"بارش ہونے لگی ہے۔"

میں نے دیکھا کہ مولوی صاحب کے چہرے پر مایوسی کے سائے اور گہرے ہو گئے ہیں۔

"مولوی صاحب !"

وہ میری طرف دیکھنے لگے۔ "میں نے چاہا تھا کہ زندگی میں نیکی کا یہ کام کر جاؤں جس رات میں نے سوچا تھا کہ ان دونوں کو ہر قیمت پر اور ہر حالت میں ایک دوسرے کے قریب لے آؤں گا۔ اسی رات رستم علی سیڑھیوں سے اس طرح گرا کہ جانبر نہ ہو سکا۔"

"آپ نے تو اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ تقدیر کے سامنے آدمی

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

کی پیش نہیں چل سکتی۔" میں نے اپنی طرف سے ان کا بوجھ ہلکا کرتے ہوئے کہا۔

"تقدیر۔ کیا تقدیر کو انسانوں کی دشمنی پسند ہے؟"

میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا اس لیے میں نے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ مولوی صاحب کئی منٹ خاموش رہے اور پھر آنکھوں پر عینک درست کرتے ہوئے بولے۔

"مجھے اپنے وطن جانا ہے۔"

"آپ کوہاٹ واپس جانا چاہتے ہیں، یہاں کے لوگ آپ کو جانے نہیں دیں گے۔"

"میں جانتا ہوں ان لوگوں کو مجھ سے بڑی محبت ہے مگر میری بھی اپنی مجبوری ہے۔ والد صاحب بہت ضعیف ہو گئے ہیں۔ چلنے پھرنے سے معذور ہیں۔ ان کی آرزو ہے کہ اس حالت میں ان کے پاس رہوں۔ جانے کس وقت اور کس گھڑی اجل کا پیغام آجاتے۔" مولوی صاحب نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"مولوی صاحب! آپ نے گاؤں والوں کی بڑی خدمت کی ہے۔ آپ چاہتے تو شہر کی کسی مسجد میں بھی جا سکتے تھے۔"

"جو کچھ کر سکتا تھا وہ میں نے کیا مگر وہ کام نہ کر سکا جس کے لیے دل سے آرزو مند تھا۔ یہاں سے بس یہی ایک حسرت لے کر جاؤں گا۔"

"مولوی صاحب! اگر وہ دونوں دشمنی سے باز نہیں آئے تھے تو اس میں آپ کا کیا قصور ہے؟"

"قصور ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا۔"

"ہو بھی سکتا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟"

"جب اللہ کسی کو نیکی کرنے کی توفیق دیتا ہے تو اس کے لیے حالات بھی سازگار بنا دیتا ہے۔"

"ہر بار تو ایسا نہیں ہوتا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہر بار حالات سازگار نہیں ہوتے۔ تاہم۔ اب کیا کیا جا سکتا ہے۔"

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

دو اڑھائی گھنٹے گزرے ہوں گے کہ خان محمد کے گھر سے ایک آدمی آیا اور اس نے اطلاع دی کہ جس لڑکے کا انتظار تھا وہ منٹگمری سے آگیا ہے اور جنازہ تیار ہے۔ یہ الفاظ سُن کر مولوی صاحب نے پگڑی سر پر اور پیلے رنگ کا پٹکا اپنے دائیں کندھے پر رکھتے ہوئے کہا: "بابو! کونے میں پانی سے بھرا ہوا لوٹا پڑا ہے۔ وضو کر لو۔"

میں نے وضو کر لیا اور جب ہم حجرے سے باہر نکلے تو تیز اور تند ہوا چل رہی تھی مگر بارش ہلکی تھی۔ لوگ جوق در جوق خان محمد کے گھر کی جانب جا رہے تھے۔ ہمارے وہاں پہنچنے پر جنازہ اٹھا لیا گیا اور ہم قبرستان کی طرف اس خیال سے جلدی جلدی چلنے لگے کہ کہیں بوندا باندی موسلا دھار بارش میں تبدیل نہ ہو جائے۔

آدھ گھنٹے کے بعد جنازہ قبرستان پہنچ گیا اور وہاں جو میں نے کیفیت دیکھی تو خوف و دہشت کی ایک لہر میرے اندر سرایت کر گئی۔ قبرستان گاؤں کے نشیبی حصے میں واقع تھا۔ پانی نے ساری کی ساری قبروں کا ستیا ناس کر دیا تھا۔ کچی قبروں کا تو کوئی نشان ہی دکھائی نہیں دیتا تھا اور جو قبریں پختہ تھیں ان میں بھی چھوٹے بڑے گڑھے پڑ گئے تھے۔ ہر جگہ پانی کہیں ایک ایک اور کہیں دو دو اور تین تین فٹ کھڑا تھا۔ گورکنوں نے جنازہ آنے سے پہلے ہی قبر تیار کر رکھی تھی۔ میت قبر میں اتار دی گئی اور دُعا کر کے سب واپس آ گئے۔

مولوی صاحب نے اصرار کر کے مجھے روک لیا۔

"کہاں جاؤ گے بابو! راستہ اور خراب ہو چکا ہے۔ میرے حجرے کو شرف بخشو۔ تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔" اور واقعی مجھے کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ مولوی صاحب نے میرے متواتر نہ نہ کرنے کے باوجود مجھے چارپائی پر سلایا اور خود نیچے لیٹ گئے۔

صبح سویرے یہ دہشت انگیز خبر فضا میں گشت کر رہی تھی کہ قبرستان میں رستم علی اور خان محمد کے بیٹوں اور رشتہ داروں میں ایک بڑا زبردست جھگڑا پیدا ہو گیا ہے اور عنقریب مار کٹائی کی نوبت آنے والی ہے۔

ہنگامے کی یہ وجہ معلوم ہوئی کہ گورکنوں نے غلطی سے رستم علی کی قبر کے پہلو ہی میں

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

خان محمد کو دفنا دیا تھا اور جب رستم علی کے لواحقین کو اس بات کا علم ہوا تو وہ آپے سے باہر ہو گئے۔ دوسری طرف خان محمد کی اولاد اور عزیزوں کو یہ بات منظور نہیں تھی کہ خان محمد کی قبر رستم علی کی قبر کے ساتھ بنے۔ مگر اب جو کچھ ہو چکا تھا اسے ختم کیونکر کیا جا سکتا تھا۔

کسی نے آکر کہا۔

"مولبی جی! بڑا فساد ہوگا۔ وہ قبرستان میں چھریاں کٹاریاں لے کر آگئے ہیں"۔

"پر میں کیا کر سکتا ہوں۔ اچھا چلو بابو! زندگی میں یہ تماشا بھی دیکھنا تھا"۔

قبرستان میں میلا سا لگا تھا اور مرنے والوں کے حمایتی بڑی طرح گرج رہے تھے۔ رستم علی کے بیٹوں کا دعویٰ تھا چونکہ ان کے باپ کو خریدی ہوئی زمین میں چھ ماہ پہلے دفن کیا گیا ہے اس لیے خان محمد کے لواحقین خان محمد کی نعش کو قبر میں سے نکال کر کہیں اور دفن کر دیں۔ مگر خان محمد کی آل اولاد کی اس میں اپنی ہیٹی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ رستم علی کی اولاد باپ کی نعش کو نکال کر لے جائیں اور رستم علی کے بیٹے اور عزیز اس ساری زمین کو اپنا "احاطہ" گردانتے تھے۔ وہ اپنے احاطے میں اپنے جانی دشمن کو کس طرح دفن ہوتے ہوئے دیکھ سکتے تھے؟

اس شور میں متواتر اضافہ ہو رہا تھا اور قتل و غارت کا آغاز ہونے ہی والا تھا۔

رستم علی کے بڑے بیٹے نے خان محمد کے بیٹوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

"میت نکالتے ہو یا نہیں؟"

دوسری طرف سے "نہیں، بالکل نہیں" کی آوازیں بلند ہو گئیں۔ یک بیک کئی آنکھوں میں خون اتر آیا اور ہاتھوں میں چھریاں، کلہاڑیاں لہرانے والی تھیں کہ مولوی صاحب نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنا پورا زور لگا کر کہا۔

"خدا کے لیے ٹھہر جاؤ"۔

سب کی نظریں مولوی صاحب کی طرف اٹھ گئیں۔

مولوی صاحب اسی لہجے میں کہنے لگے۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

"جو جی میں آئے کرو۔ میں کون ہوں تمہیں روکنے والا۔ مگر پہلے میرے ایک سوال کا جواب دے دو۔ اس گاؤں کا ایک ایک بچہ جانتا ہے کہ رستم علی اور خان محمد ہمیشہ ایک دوسرے کے جانی دشمن رہے ہیں۔ کوئی شخص بھی یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ ان کی قبریں ایک ہی جگہ بن جائیں گی۔ پھر ان کی قبریں ایک ہی جگہ کیوں بن گئیں۔ کس نے چاہا تھا کہ وہ یہاں دفن ہوں!"

شور دھیرے دھیرے ختم گیا۔ مولوی صاحب سب کی نگاہوں کا مرکز بن گئے۔ سب کے سب استفہامیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگے تھے۔ مولوی صاحب کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا اور ہونٹ پھڑ پھڑا رہے تھے۔

"میرے سوال کا جواب دو۔ کون ہے وہ جس نے چاہا تھا کہ مرنے کے بعد یہ دو دشمن ایک دوسرے کے قریب ہو جائیں؟" مولوی صاحب کی آواز اور بلند ہو گئی تھی۔

"تم نہیں بتا سکتے تو میں بتاتا ہوں۔ وہ جس نے یہ چاہا ہے وہ میرا اور تمہارا پروردگار ہے۔ جس نے انسانوں کو اس لیے پیدا کیا تھا کہ وہ آپس میں پیار محبت سے رہیں، ایک دوسرے کا دکھ درد بانٹیں۔ مگر رستم علی اور خان محمد نے ایسا نہیں کیا تھا۔ انہوں نے اپنے پیدا کرنے والے کا حکم نہیں مانا تھا۔ زندگی میں وہ کبھی اکٹھے نہیں ہو سکے تھے۔ لیکن موت کے بعد وہ اکٹھے ہو چکے ہیں۔ ان کی دشمنی ختم ہو گئی ہے۔ آج تم لوگ چھریاں، کلہاڑیاں لے کر دبی مُردہ دشمنی کو زندہ کرنا چاہتے ہو۔ ضرور کرو مگر یہ نہ بھولو تمہیں یہیں دفن ہونا ہے۔ اور شاید اسی طرح دفن ہونا ہے۔"

سب کی نظریں مولوی صاحب پر جمی تھیں۔ سب کی زبانیں خاموش تھیں لیکن شاید ان کے دلوں میں ایک طوفان برپا تھا۔

مولوی صاحب چند منٹ چپ چاپ کھڑے رہے پھر میرا ہاتھ پکڑ کر چلنے لگے۔ میں نے سُنا پیچھے سے آوازیں آ رہی تھیں۔ "مولوی صاحب نے ٹھیک کہا ہے۔ مولوی صاحب سچ کہتے ہیں۔"

میں نہیں جانتا ہمارے جانے کے بعد قبرستان میں کیا ہوا تھا لیکن دو دن

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

اختتامیہ

یہ پہلا موقعہ ہے کہ اُردو ادب میں بیشتر ایسے افسانوں کا مجموعہ چھپ رہا ہے جن کا تعلق ایک خاص محلے، ایک خاص محلے کے ایک خاص عہد اور اس عہد کے چند گنے چنے خاص کرداروں سے ہے۔ یہ وہی محلہ ستھاں ہے جو آج بھی بھاٹی دروازے کے اندر اسی نام کے ساتھ مشہور ہے اور جس کا مرکزی علاقہ چوک دیوی دتا ہے۔ میں اسی چوک میں ایک گلی کے اندر رہتا تھا۔

یہ عہد میرے بچپن اور عُنفوانِ شباب کا عہد ہے اور یہ وہ کردار ہیں جنہیں میں نے قریب سے دیکھا تھا اور بار بار دیکھا تھا۔

یہاں کچھ سوال پیدا ہوتے ہیں۔ خصوصاً یہ دو سوال۔ مجھے ان افسانوں کے لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ غالباً سب سے پہلے مجھ سے یہی سوال پوچھا جا سکتا ہے۔

میں مختصراً عرض کروں گا کہ ان کرداروں نے مجھے خصوصی طور پر متاثر کیا تھا اور میں نے محسوس کیا تھا کہ ان کے اندر وہ مواد موجود ہے جو میرے چند افسانوں کی تعمیر میں کام آ سکتا ہے۔ دوسرا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب دوسرے بے شمار کرداروں کی کہانیاں لکھ چکا ہوں تو ان کی کہانیاں لکھنے میں آخر حرج کیا ہے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا یہ کردار بالکل وہی کردار ہیں جن کا میں نے اُوپر ذکر کیا ہے؟

اس سوال کا جواب قدرے تفصیل چاہتا ہے۔

دُنیا میں کوئی شخص بھی اپنی تمام تر مشاہداتی قوت کے باوصف کسی شخصیت

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

کو اس طرح پیش کرنے پر قادر نہیں ہے جس طرح وہ ہے، جیسی وہ ہے اپنی ظاہری حالت اور اپنے باطنی کوائف کے ساتھ۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی شخصیت کو الفاظ یا رنگ و سنگ کے ذریعے دوسروں کے سامنے لانے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی اپنی شخصیت کا بھی کوئی نہ کوئی جزو نیم شعوری یا غیر شعوری طور پر اس لفظی بیان، تصویر یا مجسمے میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ہم کسی فوٹو گرافر کے بارے میں بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے حقیقی شخصیت کو فلم میں منتقل کر دیا ہے۔ فوٹو گرافر کا اپنا زاویہ نگاہ بھی اس عمل میں اپنا کردار کردا کرتا ہے اور یوں وہ شخصیت نہیں رہتی جس سے ہم واقف ہیں۔

ظاہر ہے ہر فوٹو گرافر کو کسی شخص کے کسی خاص رُخ ہی سے دلچسپی ہوتی ہے اور وہ اُسی رُخ کو فوٹو اتارتے وقت اہمیت دیتا ہے۔

ہم ہر روز اپنے اردگرد کئی چہرے دیکھتے ہیں۔ ان میں لازماً اکثر وہ ہیں جنہیں ہم ایک مدت سے دیکھ رہے ہیں مگر کیا ایسا ممکن ہے کہ جب کچھ لوگ ان میں سے کسی کے مادی نقوش، اس کے رجحانات، امیال و عواطف اور ایسے دوسرے مادی و ذہنی عناصر مجتمع ہیں جن کی ترتیب و تشکیل سے یہ شخص وجود پذیر ہوا ہے تو ان میں سے ہر ایک کا بیان کردہ کردار اپنے تمام صوری و معنوی اجزا کے ساتھ ایک جیسا ہو گا؟ ہمارا تجربہ ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ ہر بیان کرنے والے کی اپنی پسند ناپسند ہے۔ رجحانِ طبع ہے اور جذباتی رویہ ہے اور اس کی وجہ سے نقل بہ مطابق اصل نہیں رہتی۔ رہ ہی نہیں سکتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس سلسلے میں چند ایسی واضح مماثلتیں سامنے آ جائیں جن سے ہم کہہ سکیں کہ یہ فلاں شخص ہے جو ہمارا دیکھا بھالا ہے۔

اب میں اپنے ان کرداروں کے بارے میں عرض کروں گا کہ یہ سب کے سب مدتوں پہلے میرے گرد و پیش زندہ تھے۔ میں ان سے ملتا رہا ہوں۔ ان سے

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693

Mahar Online Comosing Center|Mahar M. Mazhar Kathia|03037619693

باتیں کرتا رہا ہوں۔ پھر یوں ہوا کہ یہ اپنی دنیا سے نکل کر میری اپنی دنیا میں آ گئے۔ میرے دل کی گہرائیوں میں سانس لینے لگے اور سالہا سال تک سانس لیتے رہے۔ یہاں میری اپنی دنیا میں یہ میرے جذبات کی لَو اور بدلتے ہوئے خیالات و رجحانات کی لہروں میں کچھ کھوتے اور کچھ پاتے رہے۔ یہ وہ نہیں رہے جو یہ اُس عہد میں تھے۔ اور میں خود بھی وہ کب ہوں جو اُس دور میں تھا چنانچہ میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ بیشتر وہ کردار ہیں جنہیں مَیں نے محلہ ستھاں کی مختلف گلیوں میں نہیں اپنے دل کی وسعتوں میں پایا ہے اور جس طرح پایا ہے انہیں ان کہانیوں میں لے آیا ہوں۔ البتہ ان کی کچھ مماثلتیں بدستور قائم ہیں جن سے یہ آج بھی پہچانے جاتے ہیں اور پہچانے جا سکتے ہیں۔

ان کرداروں کے سب واقعات حقیقی نہیں ہیں۔ اور ہو سکتے بھی نہیں تھے۔ میں نے رپورٹ لکھنے کی کوشش ہرگز نہیں کی۔ کہانی لکھنے کی کوشش کی ہے اور کہانی کے اپنے کچھ آداب اور فنی تقاضے ہیں جن کا میں نے اپنی طرف سے پورا پورا خیال رکھا ہے۔

ان کرداروں کی دنیا کی مرکزی شخصیت کون ہے؟ اس کا فیصلہ میرے قارئین کریں گے۔ میری کوشش یہ رہی ہے کہ یہ مرکزی شخصیت ہر کردار کی ایک رفیق بن کر ظہور پذیر ہو۔ ایک سائے کی طرح چلے۔ کردار کو اپنی گود میں لے کر نہ چلے۔ کیونکہ اس طرح تو کردار مجروح ہو کر رہ جائے گا بلکہ کردار۔ کردار رہے گا ہی نہیں۔

میں اپنے عزیز اور پیارے دوست مسعود مفتی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس مجموعے کا بہت خوبصورت دیباچہ لکھا۔ سیف اللہ کا بھی دلی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اپنی روایات کے مطابق اس مجموعے کو بڑے خوبصورت انداز میں چھاپا۔

آج یہ سارے کے سارے کردار۔ جن کی میں نے کہانیاں لکھی ہیں۔ اس دنیا میں نہیں ہیں اور میرا دل یہ لفظ لکھتے ہوئے ایک گہرے کرب میں ڈوب گیا ہے۔

Contact for B.S,M.S,M.phil, P.hd Thesis Writing and Composing|03037619693